ادب اور جُرمیات: اُردو ناول میں جُرمیات کے اسباب و محرکات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ برائے پی ایچ ڈی (اُردو)

مقالہ نگار

ندیم اختر

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۴ء

ادب اور جُرمیات: اُردو ناول میں جُرمیات کے اسباب و محرکات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

مقالہ نگار

ندیم اختر

یہ مقالہ

پی ایچ۔ڈی (اردو)

کی ڈگری کی جزوی تکمیل کے لیے پیش کیا گیا

فیکلٹی آف لینگویجز

(اردو زبان و ادب)

فیکلٹی آف لینگویجز

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

جولائی ۲۰۲۴ء

مقالے کا دفاع اور منظوری کا فارم

زیر دستخطی تصدیق کرتے ہیں کہ انھوں نے مذکورہ مقالہ پڑھنے کے بعد مقالے کے دفاع کو جانچا ہے، وہ مجموعی طور پر امتحانی کارکردگی سے مطمئن ہیں اور فیکلٹی آف لینگویجز کو اس مقالے کی منظوری کی سفارش کرتے ہیں۔

مقالے کا عنوان: **ادب اور جُرمیات: اُردو ناول میں جُرمیات کے اسباب و محرکات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ**

پیش کار : ندیم اختر

رجسٹریشن نمبر : NUML-F19-18667

ڈاکٹر آف فلاسفی

شعبہ: (اُردو زبان و ادب)

ڈاکٹر محمود الحسن: ______________________

نگران مقالہ

ڈاکٹر مظہر حسین بھٹہ: ______________________

شریک نگران، چیئرمین شعبہ سوشیالوجی،

پیر مہر علی شاہ ایرڈ ایگری کلچر یونیورسٹی، راولپنڈی۔

پروفیسر ڈاکٹر جمیل اصغر جامی: ______________________

(ڈین فیکلٹی آف لینگویجز)

میجر جنرل شاہد محمود کیانی: ______________________

(ریکٹر) ہلال امتیاز ملٹری (ر)

تاریخ: ______________

اقرارنامہ

میں ، ندیم اختر حلفیہ بیان کرتا ہوں کہ اس مقالے میں پیش کیا گیا کام میرا ذاتی ہے اور نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد کے پی ایچ ڈی سکالر کی حیثیت سے ڈاکٹر محمود الحسن کی نگرانی میں کیا ہے۔ میں نے یہ کام کسی اور یونیورسٹی یا ادارے میں ڈگری کے حصول کے لیے پیش نہیں کیا ہے اور نہ آئندہ کروں گا۔

____

ندیم اختر

مقالہ نگار

نیشنل یونیورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

۲۰۲۴ء

فہرست ابواب

عنوان	صفحہ نمبر
مقالہ کے دفاع اور منظوری کا فارم	i
اقرار نامہ	ii
فہرست ابواب	iii
Abstract	x
اظہار تشکر	xii
باب اوّل: موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث	**۱**
الف۔ تمہید	۱
i۔ موضوع کا تعارف	۱
ii۔ بیان مسئلہ	۲
iii۔ مقاصد تحقیق	۲
iv۔ تحقیقی سوالات	۲
v۔ نظری دائرہ کار	۳
vi۔ تحقیقی طریقہ کار	۴
vii۔ مجوزہ موضوع پر ما قبل تحقیق	۵
Viii۔ تحدید	۶
ix۔ پس منظری مطالعہ	۶
x۔ تحقیق کی اہمیت	۷
ب۔ جرم کی تعریف اور جرمیات کا مفہوم	۸
جرم کی عمرانی تعریف	۸
جرمیات کی اقسام	۸
I۔ کرمنالوجی	۹

Ii۔پنالوجی ۱۰
iii۔جرم کی تاریخ ۱۰
iv۔جُرم کا اسلامی تصور ۱۰
مجرمین ۱۰
اسلامی قانون کے بارے میں مغربی مفکروں کی آراء ۱۱
جرم کے نظریات ۱۲
i۔کلاسیکی نظریہ ۱۲
ii۔ اشتراکی نظریہ ۱۳
iii۔اجسامی نظریہ ۱۳
iv۔تمدنی نظریہ ۱۴
v۔ماحولیاتی نظریہ ۱۴
vi۔حیاتیاتی نظریہ ۱۵
معاشریاتی یا عمرانی نظریہ ۱۵
نفسیاتی نظریہ ۱۶
تحلیل نفسی کا نظریہ ۱۶
کثیر الاسبابی نظریہ ۱۷
بدنامی کا نظریہ ۱۷
تصادمی نظریہ ۱۸
مجرمانہ کردار کا نظریہ ۱۸
بنیادی نظریہ ۱۹
معاشرے میں جنم لینے والے جرائم کے اسباب ۱۹
i۔گھریلو ماحول ۱۹
ii۔غربت ۲۰
Iii۔ناخواندگی ۲۰

iv۔ طبقاتی تقسیم ۲۱
v۔ معاشرتی اقدار و روایات ۲۱
vi۔ جذباتی کش مکش ۲۱
vii۔ غیر اخلاقی فلمیں ۲۱
viii۔ ذرائع آمد و رفت کی ترقی ۲۲
ix۔ صنعت و حرفت میں ترقی ۲۲
x۔ مذہب سے دوری ۲۲
xi۔ نفسیاتی اسباب ۲۲
xii۔ جسمانی نقائص کے اسباب (بد صورتی) ۲۳
xiii۔ انٹرنیٹ یوٹیوب، فیس بک ۲۳
xiv۔ نظام عدل کی کمزوری ۲۳
xv۔ قوانین سے ناآشنائی ۲۳
xvi۔ خطاکار یا حادثاتی مجرم ۲۴
xvii۔ معصوم مجرم ۲۴
xviii۔ عادی مجرم ۲۴
xix۔ پیشہ ور مجرم ۲۴
xx۔ خطرناک مجرم ۲۴
xxi۔ نوجوان مجرم ۲۵
xxii۔ کمسن مجرم ۲۵
xxiii۔ منظم گروہ کے مجرم ۲۵
xxiv۔ سفید پوش مجرم ۲۵
xxv۔ کالرز آف کرائمز ۲۵
i۔ وائٹ کالر کرائم ۲۵
ii۔ بلیو کالر کرائم ۲۶

iii۔ سٹیٹ کالر کرائم ۲۶
iv۔ ریڈ کالر کرائم ۲۶
v۔ بلیک کالر کرائم ۲۶
vi۔ گرین کالر کرائم ۲۷
vii۔ گولڈ کالر کرائم ۲۷
ج۔ معاشرتی اقدار اور جرائم ۲۷
i۔ معاشرہ اور جرائم ۲۷
ii۔ جرمیات اور فوجداری قانون ۲۸
iii۔ اسلام اور فوجداری قانون ۲۸
vi۔ جرم اور معاشرتی اقدار ۲۸
د۔ جرمیات اور دیگر انظباطات ۲۸
i۔ جرمیات اور اخلاقیات ۳۰
ii۔ جرمیات اور نفسیات ۳۰
iii۔ جرمیات اور بشریات ۳۰
iv۔ جرمیات اور حیاتیات ۳۱
v۔ جرمیات اور نسلیات ۳۱
vi۔ جرمیات اور معاشیات ۳۱
vii۔ جرمیات اور سائنس ۳۲
viii۔ ڈی این اے-DNA ۳۲
Ix۔ جیوفقسنگ ۳۳
x۔ فنگر پرنٹس ۳۳
xi۔ ٹاکسی کالوجی ۳۳
xii۔ FTM(Fire Arms of Tool Marks) اسلحے کی جانچ پڑتال ۳۳

ر۔ اردو ناول میں جرمیات کی روایت ۴۴
☆حوالہ جات ۴۵
باب دوم: منتخب اردو ناولوں میں سماجی جرائم کی پیش کش ۴۸
الف۔ سماج ۴۸
ب۔ ناول ''جانگلوس'' میں سماجی جرائم ۴۹
ج۔ چوری اور راہزنی ۵۰
i۔ پولیس تشدد ۵۳
ii۔ صفدر علی اُوورسیئر کی کرپشن ۵۴
iii۔ کمشنر ہمدانی اور اس کے جرائم ۵۵
iv۔ رحیم داد کا حکیم نذر محمد چشتی کو قتل کرنا ۵۷
v۔ ڈھولا امیر خان میں سلدیرے کے جرائم ۵۹
vi۔ مزارع کی بیوی کا اغوا ۶۰
vii۔ بلوچ قبائلی سرداروں کی نجی عدالتیں اور غیر قانونی فیصلے ۶۲
viii۔ چوہدری اللہ وسایا کا قتل ۶۴
ix۔ جمال دین کا اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کرنا: ۶۶
د۔ عبداللہ حسین کا ناول ''قید'' میں سماجی جرائم ۶۸
i۔ پہلے قتل کی کہانی ۶۹
ii۔ دوسرے قتل کی کہانی ۷۲
iii۔ تیسرے قتل کی کہانی ۷۳
ر۔ ناول ''غلام باغ'' میں سماجی جرائم ۷۶
i۔ ارزل اور مانگر جاتی نسلوں کا نسلی امتیاز اور جرائم ۷۷
ii۔ مانگر جاتیوں پر ارزلوں کا تشدد ۷۸

iii۔ عطائی ڈاکٹر یاور اور جرائم پیشہ امبر جان ۷۸
iv۔ کمزور ایمان اور جعلی پیری مریدی جیسے جرائم ۸۱
v۔ سرقہ اور جعل سازی جیسے جرائم ۸۲
vi۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا مدد علی پر تشدد ۸۴
vii۔ ڈاکٹر ناصر کا زہرہ کی عفت پر حملہ ۸۵
viii۔ کبیر مہدی کا قتل اور امبر جان کی خودکشی ۸۷
☆حوالہ جات ۹۱
باب سوم: منتخب اردو ناولوں میں معاشی جرائم کی پیش کش ۹۳
الف۔ معاشی جرائم اور الاالعاصفہ (طوفانی ہوا) حسن منظر ۹۳
i۔ حسن منظر کے ناول "العاصفہ" (طوفانی ہوا) میں معاشی جرائم ۹۴
ii۔ آئل کمپنیوں کے مالی جرائم ۹۷
iii۔ عربی شیخوں کی عیاشیاں اور آئل کمپنیوں کی من مانیاں ۱۰۱
iv۔ آئل کمپنی کے مزدوروں کی حالت زار اور معاشی قتل ۱۰۶
v۔ سعودی عدالتوں کی عجیب سزائیں ۱۰۷
vi۔ العاصفہ ۱۰۸
ب۔ ناول دھنی بخش کے بیٹے میں معاشی جرائم ۱۰۹
i۔ علی بخش کے مالی جرائم ۱۱۲
ج۔ ناول نیلی بار میں معاشی جرائم ۱۱۴
☆حوالہ جات ۱۲۵
باب چہارم: منتخب ناولوں میں اخلاقی جرائم کی پیش کش ۱۲۷
الف۔ جسم فروشی کی مختصر تاریخ ۱۲۸
طوائف کی اقسام (Types of Prostitutes) ۱۲۹
i۔ مغنیہ ۱۲۹

ii۔ رقاصہ ۱۲۹
iii۔ عصمت فروش ۱۲۹
iv۔ کال گرل ۱۲۹
v۔ گلیوں میں پھرنے والیاں ۱۳۰
vi۔ بار گرلز، شراب خانوں اور ہوٹلوں میں کام کرنے والیاں ۱۳۰
vii۔ ٹیکسائیاں، ڈیرہ دار طوائفیں ۱۳۰
viii۔ بوڑھی طوائفیں ۱۳۰
ix۔ سرکٹ ٹریولر ۱۳۰
x۔ ٹھیکیدار دلال(PIMS) ۱۳۰
xi۔ شوقین طوائفیں ۱۳۱
xii۔ گاہک (خریدار) ۱۳۱
xiii۔ برصغیر میں عصمت فروشی کے بازار ۱۳۱
ب۔ ناول "کنجری کا پل" میں اخلاقی جرائم ۱۳۲
ج۔ جام مصدق کے اخلاقی جرائم (زنا، شراب نوشی، اغوا، قتل) ۱۳۷
د۔ کال گرل صبازادی کے اخلاقی جرائم اور خودکشی ۱۳۹
ر۔ حضرت باباعطار کے اخلاقی جرائم اور شیطانیت ۱۴۲
ڑ۔ نسیم انجم کے ناول "نرک" میں اخلاقی جرائم ۱۴۸
ز۔ ببلو کا اغوا ۱۴۹
س۔ ہیروئن فروشی ۱۵۰
ش۔ گلنار کو آختہ کرنے کا اخلاقی جرم ۱۵۱
ص۔ دانش کی گلنار سے شادی والا جرم ۱۵۲
ض۔ پاکستان میں کتنے خواجہ سرا ہیں؟ ۱۵۵

ط۔خواجہ سراؤں کے مسائل کیا ہیں؟ ۱۵۵
ظ۔کیا نظر آنے والے سب خواجہ سرا واقعی حقیقی ہیں؟ ۱۵۶
ع۔خواجہ سراؤں کے ذریعے جرائم ۱۵۷
غ۔حالات میں بہتری کیسے آئے گی؟ ۱۵۷
ق۔محمد الیاس کے ناول ”حبس“ میں اخلاقی جرائم ۱۵۸
ک۔ تھانیدار نواب خان کی گوگی سے جنسی زیادتی ۱۶۰
گ۔ مولوی ثاقب لائبریرین اور فحش لٹریچر (پورنوگرافی) ۱۶۲
ل۔سہودی کا آپریشن کرانے والا جرم ۱۶۵
م۔پراچہ کا بہیمانہ اور غیر اخلاقی قتل ۱۶۶
ن۔حاجی دین محمد آڑھتی کے اخلاقی جرائم ۱۶۸
و۔ ضلع دار کے ہاتھوں دائی کا قتل ۱۷۰
☆حوالہ جات ۱۷۳
باب پنجم: منتخب ناولوں میں سیاسی اور جنگی جرائم کی پیش کش ۱۷۴
الف۔ناول ”قلعہ جنگی“ میں جنگی جرائم ۱۷۶
ب۔افغانستان میں مغربی افواج کے جنگی جرائم ۱۸۲
ج۔سید کاشف رضا کا ناول ”چار درویش اور ایک کچھوا“ میں سیاسی جرائم کی پیش کش ۱۸۷
i۔بینظیر بھٹو کے قافلے کار ساز پر دہشت گردوں کا حملہ ۱۸۷
ii۔پاکستان میں مارشل لاؤں کی تاریخ اور آمروں کے غیر قانونی کام ۱۹۰
iii۔حافظ برکت اللہ شاہین کا اقبال عرف بالے کو دہشت گرد بنانا ۱۹۲
د۔ محمد الیاس کے ناول ”برف“ میں سیاسی جرائم ۱۹۵
i۔ عسکری تنظیموں کے مابین خون ریز تصادم ۱۹۶
ii۔اسمگلنگ ۱۹۸

iii۔ فخر النساء کا زبیر اسمگلر کو قتل کرنا ۲۰۰
iv۔ جعلی ویزوں کا کاروبار اور منی لانڈرنگ ۲۰۲
v۔ دہشت گردی ۲۰۵
vi۔ نائن الیون اور دہشت گردی ۲۰۵
ر۔ اشرف شاد کے ناول جج صاحب میں سیاسی جرائم ۲۰۹
i۔ بیرسٹر کرم دیوان کا فوجی آمر کو قانونی صدر بنوانا ۲۰۹
ii۔ ایڈووکیٹ ظفر اللہ ہاشمی کا طوائفوں کے مقدمے لڑنا ۲۱۰
iii۔ بیرسٹر کرم دیوان کے سیاسی جرائم ۲۱۲
iv۔ دستگیر خان اسمگلر کی رہائی ۲۱۴
v۔ بدعنوان افسروں کے وائٹ کالر کرائم ۲۱۵
vi۔ آئین کی موت ۲۱۷
☆حوالہ جات ۲۲۲
ماحصل ۲۲۴
الف۔ مجموعی جائزہ ۲۲۵
ب۔ تحقیقی نتائج ۲۲۷
ج۔ سفارشات ۲۲۹
☆کتابیات ۲۳۰

ABSTRACT

Title: Literature and Criminology: an investigating critical study of causes and motives of criminology in Urdu novels.

The topic of my Ph.D. thesis is literature and crimes. It is a critical analysis of motivation and causes for crimes in Urdu Novel. Urdu Novels have also depicted crimes being done in the society similar to English Novels. This study investigates urdu crime novel, a genre in which the writers expose the crime of different characters who play a detrimental role in a society. It also studies the relation between novel and crime and how the selected writers define the social, moral, political, economic and war crimes. This research spans over a period of thirty years in the field of urdu crime fiction and investigates novel from 1987 till 2020.

Novels like Janglous-1987, Qaid-1989 and Ghulam Bagh-2006 expose the social crimes that crush our social development. In the Novels Al-Asifa-2006, Dhani Bukhsh Kay Baitay-2008 and Neeli Bar-2017, writers criticise the fudal systems as an economic disease. Novels Kanjri Ka Pull-2006, Nurak-2007, and Habs-2013 show that the moral crimes are dangerous for our society. Novel Killa Jangi-2002 and Char Darwesh Aik Kachwa-2008, Burf-2013 and Judge Sahib-2019 is about the terrorism and war crimes that are against our National development. Using the theoretical lenses about illiteracy and poverty by theorists, Lloyed Ohlin and Richard Cloward, this research investigates the repercussions of criminal behaviour. This study attempts to foreground the importance of bringing awareness about socio-economic and moral crimes through literary writings. Urdu Fiction writers always exposes the original condition of society like crime and blood sheds, street crimes and white Collar crimes.

Among many other findings, this study shows that white collar crimes under political patronage has crippled the economy of Pakistan. My suggestions in short stories of our fiction writers focus the crime in our society. The crimes that our Urdu fiction writers have portrayed can also be the subject of a PhD.

اظہار تشکر

اللہ سبحانہ اللہ تعالیٰ کا شکر ہے جس نے مجھے توفیق دی کہ میں آج اپنا مقالہ "ادب اور جرمیات: اردو ناول میں جرمیات کے اسباب و محرکات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ" (بحوالہ منتخب ناول) پی ایچ ڈی اردو کی ڈگری کے حصول کے لیے پیش کر رہا ہوں۔ ذات باری تعالیٰ ہی انسان کو اپنی خاص رحمت سے نوازتا ہے۔ اسی ذات کا ہر حال میں شکر ادا کرنا چاہیے۔ اسی کی رحمت سے آج میں اس مقام پر پہنچا ہوں۔

میرے مقالے کا موضوع اردو ناول میں پیش کیے جانے والے جرائم ہیں۔ مواد کے حصول اور جن افراد نے میری معاونت کی میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ بچپن میں مجھے میرے والد صاحب کہانیاں سناتے تھے جن میں چور اور حضرت عبد القادر جیلانی، موسیٰ اور فرعون نمرود اور حضرت ابراہیم علیہ السلام، قصہ چہار درویش شامل ہوتے تھے۔ سکول دور سے ہی مجھے ناول پڑھنے کا شوق تھا۔ میں نے جو سب سے پہلے ناول پڑھا وہ بانو قدسیہ کا "راجا گدھ" تھا۔

میں اپنے والدین کا شکریہ ادا کرتا ہوں جو پیرانہ سالی میں بھی میری ہمت بندھاتے رہتے ہیں۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ انہیں صحت دے۔ اپنے بڑے بھائی اور باس انجینئر اسلم حیات کا خاص طور پر شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ تعلیمی معاملات میں میری حوصلہ افزائی کی۔ ڈاکٹر نبیل عارف صاحب (پی ایچ ڈی) سیئول جنوبی کوریا کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے مقالے میں آنے والی مشکلات دور کیں۔

میں نگران مقالہ ڈاکٹر محمود الحسن، شریک نگران ڈاکٹر مظہر حسین بھٹہ صاحب محترم اساتذہ کرام، ڈاکٹر فوزیہ اسلم (صدر شعبہ اردو)، ڈاکٹر نعیم مظہر، ڈاکٹر عابد سیال، پروفیسر ڈاکٹر روبینہ شہناز، ڈاکٹر شفیق انجم، ڈاکٹر عنبرین شاکر جان، ڈاکٹر رخشندہ مراد، ڈاکٹر ظفر احمد اور شعبہ کے دیگر تمام اساتذہ کرام کا شکر گزار ہوں کہ ان کی رہنمائی میں مقالے کا کام مکمل کر کے سند کے لیے پیش کرنے کے قابل ہوا۔ میرے نہایت محترم استاد پروفیسر ڈاکٹر منور ہاشمی صاحب، ڈین نادرن یونیورسٹی، نوشہرہ، انتہائی قابل احترام دوست جناب عامر اقبال بھٹی، ایڈووکیٹ، ڈاکٹر محمد عرفان کیپٹل یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی، اسلام آباد، ڈاکٹر عرفان اللہ، ڈاکٹر نثار ترابی، میجر (ر) قاضی محمد یوسف، ڈاکٹر عامر جلیل (پی ایچ۔ ڈی) مانچسٹر انگلینڈ، ڈاکٹر فیض الحسن پی ایچ۔ڈی

(یوکے)، ڈاکٹر راشد حمید،ڈپٹی ڈائریکٹر جنرل،ادارۂ فروغِ قومی زبان، عارف حسین سینئر پرائیویٹ سیکرٹری، جناب محبوب بگٹی ڈپٹی ڈائریکٹر،جناب انور سرور، لائبریرین، محمد انوار،ادارہ فروغ قومی زبان،اسلام آباداور اپنے تمام کلاس فیلوز کا بھی خصوصی شکریہ، اپنی اہلیہ آسیہ ندیم، بڑی بہن طاہرہ اقبال، بھائی عبدالستار، ڈاکٹر ارشد اقبال نیر، سلیم اختر کا بھی شکریہ جن کی دعاؤں سے میں نے اپنے مقالے کی تکمیل کی۔ اللہ تعالی سب کو صحت تندرستی عطا فرمائے۔

ندیم اختر

اسکالر پی ایچ۔ڈی (اُردو)

بابِ اوّل:

موضوع کا تعارف اور بنیادی مباحث

الف۔ تمہید

i۔ موضوعِ تحقیق کا تعارف:

دنیا میں انسان جرم کا ساتھ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ جُرم عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معانی گناہ، خطا، قصور کے ہیں۔ انگریزی میں اس کے لیے لفظ (Crime) اور اس کے متعلق علم کو (Criminology) کہا جاتا ہے۔ اُردو میں اسے جرمیات کا نام دیا گیا ہے۔ ادب چونکہ زبان کا سرمایہ ہوتا ہے۔ خیالات و تجربات کے اظہار کا ذریعہ بھی ہے۔ خطا یا جرم کا اظہار ہمارے ادب میں موجود ہے۔ بالخصوص اُردو ناول میں قتل، چوری، ڈکیتی، سرقہ، معاشی استحصال، دہشت گردی، قبضہ مافیا اور اغوا کی وارداتیں ہمیں بکثرت ملتی ہیں۔ ان چیزوں نے ہمارے اندر خوف، ڈر، عدم تحفظ پیدا کیا ہے۔ اُردو ناول جس کی عمر آج تقریباً ڈیڑھ سو برس ہو چکی ہے۔ اس نے مغربی ادب کی طرح جرمیات کو بھی جگہ دی ہے اور اس میں کمی لانے کے لیے ٹھوس اقدامات پر زور دیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ ۱۹۸۰ء کے بعد اردو ناول کے موضوعات میں بہت حد تک تبدیلی آئی ہے۔ نیا اُردو ناول نگار جو خاص کر ۲۰۰۰ء کے بعد ناول سامنے آئے اور اس کو مغرب کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان میں مستنصر حسین تارڑ جیسے ناول نگار بھی شامل ہیں مگر ۲۰۰۰ء کے بعد ان کے موضوعات میں تبدیلی آتی گئی۔ ان میں مرزا اطہر بیگ بھی شامل ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہے۔ ساتھ ہی غلام باغ اور دوسرے ناول اس بات کا شدت سے احساس دلاتے ہیں کہ اردو ناول نگار اب پرانے تجربوں سے نکل کر نئی زمین پر آ گیا ہے اور یہ زمین کشادہ بھی ہے اور مضبوط بھی۔ اسی طرح طاہرہ اقبال، سید کاشف رضا، اشرف شاد کے ناولوں کا مطالعہ کریں تو وہ تمام ناول موضوعات کے لحاظ سے ایک دوسرے سے الگ بھی ہیں، اسلوب اور ٹریٹمنٹ کی سطح پر مضبوط بھی ہیں۔ مجرمانہ رویوں کی نشاندہی کرتے ہوئے مجرمانہ کلچر کی عکاسی بڑے عمدہ انداز سے کی گئی ہے۔

ان ناولوں میں شوکت صدیقی کا ناول، "جانگلوس"، مستنصر حسین تارڑ کا "قلعہ جنگی"، عبد اللہ حسین کا "قید"، ڈاکٹر حسن منظر کا "العاصفہ"، دھنی بخش کے بیٹے، محمد الیاس کا "حبس" اور برف، نسیم انجم کا "نرک"، مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ"، اشرف شاد کا "جج صاحب"، طاہرہ اقبال کا "نیلی بار" وغیرہ۔ اس مقالے میں اُردو ناول میں

جرمیات کے اسباب و محرکات کی پیش کش کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ پیش کیا گیا ہے جو کہ اُردو ادب میں اضافے کی ادنیٰ کاوش ہو گی۔

ii۔ بیانِ مسئلہ:

ناول میں جرمیات کی عکاسی مغربی ادب میں اٹھارویں صدی سے چلی آ رہی ہے۔ Harriet Beecher Stowe کا (۱۸۹۶ء۔۱۸۱۱ء) ناول (۱۸۵۲ء) Uncle Tom's Cabin جس میں ایک غلام خاندان کی داستان کا ذکر ہے۔ ماریو پوزو کا "The God Father"، Don Winslow کا The power of the Dog جس میں امریکہ میں War on Drugs کی ابتدائی تیس سالہ تاریخ فکشن میں بیان کی گئی ہے۔ امریکہ میں ۱۹۵۰ء کے بعد جرمیات کو باقاعدہ اطلاقی عمرانیات کے تحت شکاگو یونیورسٹی USA، کیمبرج یونیورسٹی برطانیہ کے نصاب کا حصّہ بنایا گیا اور (Criminology) میں بے شمار کتب اور رسائل نے جنم لیا جس میں (۱۹۲۶ء تا ۲۰۰۱ء) Richard Cloward، Lloyed-e-ohlin (۱۹۱۸ء تا ۲۰۰۸) نے جرمیات کے شعبے قائم کیے۔ اُردو ادب میں جرمیات پر تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے، لیکن فکشن میں بالخصوص ناول نگاروں نے اسے اپنے ناولوں کا موضوع بنایا ہے۔ اس مقالے میں ان کا تحقیقی اور تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے۔ جرائم کو کس طرح پیش کیا گیا ہے۔ ان کی بڑی اقسام اخلاقی، معاشرتی، جنسی اور سیاسی اور جنگی جرائم کی عکاسی کس طرح کی گئی ہے، کا مطالعہ کیا گیا ہے۔

iii۔ مقاصد تحقیق:

دورانِ تحقیق مندرجہ ذیل مقاصد پیش نظر رہے ہیں:

۱۔ اردو ناولوں میں جرائم کے موضوع کی اہمیت کو اُجاگر کرنا۔

۲۔ منتخب اردو ناولوں میں جرائم کی نفسیاتی وجوہات اور مجرمانہ رویوں کا مطالعہ کرنا۔

۳۔ منتخب اردو ناولوں جرائم کا معاشرتی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور جنگی تناظر میں جائزہ لینا۔

iv۔ تحقیقی سوالات:

۱۔ اردو ناول اور جرمیات کا باہمی تعلق کیا ہے؟

۲۔ منتخب اردو ناولوں میں سماجی جرائم کو کیسے پیش کیا گیا ہے؟

۳۔ منتخب اردو ناولوں میں معاشی جرائم کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

۴۔ منتخب اردو ناولوں میں اخلاقی جرائم کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

۵۔ منتخب اردو ناولوں میں سیاسی اور جنگی جرائم کو کس طرح پیش کیا گیا ہے؟

v۔ نظری دائرہ کار:

مجوزہ تحقیقی کام منتخب اردو ناول میں جرمیات کے اسباب و محرکات کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ ہے۔ جرمیات کی صورت حال کو معاصر ناول نگاروں نے اپنے ناولوں میں کس طرح پیش کیا ہے۔اس تحقیقی منصوبے پر کام کے لیے ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی کتاب "جرمیات" کو پیش نظر رکھا گیا ہے۔ جس میں اُنہوں نے ماہرین جرمیات ایڈون سدرلینڈ، کلووارڈ، اوہلین، ڈرخائم اور کارل مارکس وغیرہ کے نظریات کو پیش کیا ہے۔ امریکی ماہرین اوہلین (Lioyed E. Ohlion 1918-2008) رچرڈ کلوارڈ Richard Cloward (1926-2001)کے مطابق :

> "Poverty and lack of education are the main causes of delinquency and crimes".

ان دونوں ماہرین کی فکر کی روشنی میں جرائم اور خطاکاروں کا سبب تعلیمی اور معاشی پسماندگی ہے۔ اوہلین اور کلووارڈ اپنے نظریات کی صحت کے لیے سرکاری اعداد و شمار پر بھروسہ کرتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ادنٰی طبقات میں جرائم کی شرح دوسرے طبقات کے مقابلے میں زیادہ ہوتی ہے۔ مگر آزادانہ مطالعے سے نتائج کچھ اور نکلتے ہیں۔ اس لیے بعض ناقدین نے ان پر اعتراضات اٹھائے ہیں۔

ڈرخائم اور مارکس نے معاشرتی خلا اور اجنبیت کی اصطلاحیں استعمال کی ہیں۔ "معاشرتی خلا" کے ماہرین نے "انحراف" کی اصطلاح روشناس کرائی تھی اوراس سے ان کی مراد قانون شکنی کی وہ قسم تھی جس کے مطالعے میں وہ زیادہ دلچسپی لینا چاہتے تھے۔ وہ اپنے پیش رو فلسفیوں کی اصطلاح "جرائم" کو بھی ناپسند کرتے تھے، کیونکہ ان کے نزدیک بڑے بڑے جرائم مثلاً قتل، خودکشی، راہزنی، ہوائی فائرنگ، بجلی چوری، اغوا برائے تاوان، وائٹ کالر کرائم، سائبر کرائم، غیرت کے نام پر عورت کا قتل، مزدور کا استحصال، غداری، دہشت گردی، جارحیت اور عصمت فروشی کا ہی ذکر کیا جا سکتا ہے۔ حالانکہ قانون شکنی میں ایسے انحرافات بھی آجاتی ہیں جو اقدار سے آزادی اور مسلمہ معاشرتی اصولوں کی خلاف ورزی سے متعلق ہوتے ہیں اور یہی رجحانات اور میلانات آگے چل کر بڑے بڑے جرائم کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک لکھتے ہیں:

> "ہر برائی میں ایک اور برائی پیدا ہوتی ہے۔ اگر ایک ماہر جرمیات صرف اسی قسم کی تجلیات اور اسباب کی تلاش میں لگا رہے کہ برائی الف، کا سبب کون سی برائی ہے تو یہ سلسلہ

کہیں ختم نہیں ہو گا اور وہ کوئی مفید کام انجام دینے سے قاصر رہے گا۔ اس لیے انہوں نے جرائم کے اسباب کے فلسفے کو نظر انداز کر دیا اور "جرمیت" کے مطالعے کو ضروری سمجھا یا یوں کہیے کہ کسی "مجرم" کا خطاب اس سارے عمل کی آخری کڑی ہے جو اسباب، علل اور عمل کی وجہ سے تکمیل پاتا ہے"۔

("جرمیات" ڈاکٹر مظفر حسن ملک، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء، ص۹۷تا۹۸)

معاصر ناول کے مطالعے سے ہم دیکھیں گے کہ کس طرح ناول نگاروں نے انفرادی طور پر جرائم کے اسباب و محرکات کو پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک اور ماہرین جرمیات کے نظریات کو پیش نظر رکھتے ہوئے معاصر منتخب ناولوں میں سماجی، معاشی، اخلاقی، سیاسی اور جنگی تناظر میں بیان ہونے والے جرائم کا مطالعہ کیا جائے گا"۔

vi۔ تحقیقی طریقہ کار:

مجوزہ موضوع کے تحت مطالعہ کے سلسلے میں تاریخی و دستاویزی طریقہ تحقیق اپنایا جائے گا جو استقرائی طریقہ تحقیق کے زمرے میں شمار ہوتا ہے۔ (Library Research) اس کے پیش نظر موجود مواد کی جمع آوری، تجزیہ اور اس کی روشنی میں نتائج اخذ کیے جائیں گے۔

اس میں موادی تحقیق کا طریقہ (Content Research Method) اختیار کیا جائے گا۔ (جس میں مواد کے اجزا یعنی Contents کو جمع کر کے تحقیق کا Content تحدید میں شامل ناول ہیں۔ جن کا مطالعہ موضوع کے مطابق تمام تر نکات جو نئے اور اہم ہوں جزئیات کے ساتھ پیش کرنے کے ساتھ ساتھ تغیر پذیر اقدار کے پیچھے کارفرما عوامل کو تلاش کیا جائے گا)۔ یہ مواد اکٹھا کرنے کا کیفیتی طریقہ تحقیق ہے۔ (Qualitative Method) جس میں معلوم کی جانے والی کیفیت کا حوالہ پیش کیا جاتا ہے۔ اس طرح اس اسے زیادہ قابل فہم اور زیادہ قابل قبول بنانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس میں محقق جس زاویہ اور نگاہ سے مواد کے ان اجزا کا مطالعہ کرتا ہے اس طرح ایک عام شخص انہی اجزا کو نہیں دیکھتا۔ اس خاص زاویے سے مجوزہ موضوع کے تحت تحقیقی و تنقیدی مطالعہ اطلاقی بھی ہو گا جو نظری دائرہ کار میں پیش کردہ مظفر حسن ملک کا جرائم کا نظریہ ان کی کتاب "جرمیات" سے لیا گیا ہے۔ اس نظریہ کو مد نظر رکھتے ہوئے ناولوں میں جرائم کے اسباب و محرکات کا جائزہ لیا جائے گا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے اس تحقیق کی بنیاد موضوع سے متعلق مصادر و مآخذ پر رکھی جائے گی۔ بنیادی مآخذ تک رسائی کے لیے کتب خانوں میں مختلف جامعات (نمل، اسلامک انٹرنیشنل

یونیورسٹی، علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، نیشنل لائبریری) اور نجی کتب خانوں کے ساتھ ساتھ پبلشرز جن میں سنگ میل پبلی کیشنز، مثال پبلشرز، دوست پبلشرز، فکشن ہاؤس، اکادمی ادبیات پاکستان، مقتدرہ قومی زبان اور نیشنل بک فاؤنڈیشن جیسے اداروں کی طرف رجوع کیا جائے گا۔ علاوہ ازیں ثانوی مآخذ جن میں تحقیقی و تنقیدی کتب شامل ہیں۔ اخبارات، رسائل، ناول نمبر اور مقالہ جات کو بھی مد نظر رکھا جائے گا۔ اہم ویب گاہوں سے بھی استفادہ کیا جائے گا۔ نیز آن لائن کتب خانوں جن میں ریختہ لائبریری پر دستیاب مواد سے بھی استفادہ کرنا تحقیقی طریقہ کار کا اہم حصہ ہو گا۔ بوقت ضرورت تغیر پذیر معاشرتی اقدار سے متعلق رہنمائی حاصل کرنے کے لیے ناول نگاروں اور ماہر جرمیات سے انٹرویوز اور کی قیمتی آراء بھی شامل تحقیق ہوں گی۔

vii۔ مجوزہ موضوع پر ماقبل تحقیق:

ادب اور جرمیات اردو ادب میں ایک نیا موضوع ہے۔ اس سے پہلے ادب میں اس موضوع پر تحقیق نہیں ہوئی البتہ کرائم رپورٹرز اخبارات میں مضامین جرائم کے حوالے سے لکھتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی کتاب ”جرمیات“ جسے مقتدرہ قومی زبان نے ۲۰۰۶ء میں شائع کیا تھا، میں بحث کی گئی ہے کہ معاشرے میں جرائم کیوں کر جنم لیتے ہیں؟ اگر ان جرائم کی روک تھام بروقت نہ کی جائے تو پھر یہ معاشرے کو کس آسانی کے ساتھ بیمار کر دیتے ہیں۔ کتاب کو دس ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ جرم اور معاشرہ، جرم اور مجرم، انسداد جرائم پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔ ڈاکٹر تنظیم الفردوس، صدر شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی نے اپنے مضمون ”ادب اور جرمیات“ میں اردو افسانے اور اردو ناول میں جرائم کی عکاسی ہے۔

مجوزہ مقالے میں اردو ناول میں معاشرے میں پائے جانے والے جرائم کا جو تذکرہ کیا گیا ہے ان کے تمام پہلوؤں کو یکجا کر کے ایک منظم با قاعدہ اور منضبط تحقیق کے طور پر پیش کیا گیا ہے جو کہ اپنی نوعیت کا ایک جدید تحقیقی کام ہے جو جرائم کے حوالے سے مستقبل کے محققین کے لیے نئی راہیں اور زاویے سامنے لایا ہے۔

viii۔ تحدید:

اردو ناول میں جرمیات کی عکاسی تقریباً ہر ناول نگار نے کی ہے۔ قراۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، قدرت اللہ شہاب، شوکت صدیقی، مستنصر حسین تارڑ، ڈاکٹر حسن منظر، مرزا اطہر بیگ، صدیق سالک، نسیم انجم، طاہرہ اقبال، اشرف شاد، نسیم حجازی کے ناولوں میں ہمیں قتل، چوری، ڈکیتی، منشیات فروشی، زنا، دہشت گردی، قبضہ مافیا، وائٹ کالر کرائم کے مافیا وغیرہ کے واقعات تسلسل سے ملتے ہیں۔ ساتھ ساتھ ان کے طریقہ واردات کو بھی بڑے عمدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ تاہم مجوزہ موضوع پر تحقیق کے لیے ۱۹۸۷ء تا حال کے منتخب پاکستانی ناولوں کو شامل کیا گیا ہے۔ مذکورہ مقالے میں جانگلوس، قید، غلام باغ، دھنی بخش کے بیٹے، قلعہ جنگی، نیلی بار، نرک، حبس، کنجری کا پُل، جج صاحب، چار درویش اور ایک کچھوا، العاصفہ اور برف کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے اور ان ناولوں میں جرائم کی پیشکش کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے فنی و فکری و موضوعاتی پہلو تحقیق کا حصہ نہیں ہیں۔

ix۔ پس منظری مطالعہ:

اردو ادب میں ادب اور جرمیات ایک نیا موضوع ہے اور زاویہ تنقید بھی۔ تا حال محدود پیمانے پر تھوڑا سا کام سامنے آیا ہے۔ ڈاکٹر مظفر حسن ملک کی کتاب "جرمیات" منتخب مضامین کا مجموعہ ہے جو میرے شامل مطالعہ رہی ہے۔ اس میں جرم اور معاشرہ، کمسنی کی خطاکاریاں، جرم اور مجرم، مجرمانہ کردار کی وضاحت، سالانہ اعداد و شمار جرائم کے بارے میں، سراغ رسانی، مجرموں کے خلاف مقدمات کی سماعت اور سزادہی، انسداد اور اصلاحی تدبیر اور ماہرین انسداد جرائم مثلاً پارک ایڈون سدر لینڈ، ملر، ڈرخائم، مرٹن، کوہن، کلووارڈ اور اوہلن کے نظریات کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں مشرق اور مغرب کے اندر پائے جانے والے جرائم پر بھی سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ آخر میں ان ماہرین جرمیات کی کتابوں کے نام کی بھی ایک لمبی تفصیل ملتی ہے جن میں حادثاتی مجرم، مجرم اور عادی مجرموں کے متعلق وسیع معلومات ہیں۔ پیشہ ور اور جرائم کرنے والے مافیا کا ذکر بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ (Max Weber) نے اپنی کتاب "Methodology of Social Sciences" میں کہا ہے کہ "فرد کو انفرادی طور پر جاننا ضروری ہے تاکہ اس کے معاشرتی ردعمل کے مقاصد کا پتہ چل سکے"، مزید لکھتے ہیں کہ "اگر کوئی کسی پر ظلم کر رہا

ہے تو اس کے پاس کون سا معاشرتی اختیار ہے۔ آیا کہ قانونی اختیار ہے، روایتی یا مذہبی اختیار ہے تب جا کر اس فرد کے ردعمل کا پتہ چلے گا"۔

ڈاکٹر جعفر حسن کی کتاب "اخلاقی سماجیات" انجمن ترقی اردو ہند علی گڑھ ۱۹۵۲ء میں معاشرے کے اندر پائے جانے والے مجرمانہ کردار کے لوگ اور ان کے جرائم کا ذکر بڑی تفصیل سے ملتا ہے۔ میتھیو آرنلڈ "ثقافت و انتشار" ترجمہ انعام عظیم درانی مطبوعہ اکیڈیمی آف ایجوکیشن ریسرچ، کراچی میں بھی جرائم کی اقسام جو معاشرے میں انتشار کا باعث بنتی ہیں، پر بحث کرتی ہے۔ مذکورہ دونوں کتابیں بھی میرے زیر مطالعہ رہی ہیں۔ علاوہ ازیں ناول "خدا کی بستی"، "اُداس نسلیں" اور "پریشر ککر" جیسے ناولوں کا بھی مطالعہ کیا ہے، جن میں جرمیات کو بڑی ہنرمندی سے پیش کیا گیا ہے۔ اپنے اسی پس منظری مطالعہ کو بنیاد بناتے ہوئے منتخب اردو ناولوں میں جرائم کی پیش کش کا جائزہ لیا جائے گا۔

x۔ تحقیق کی اہمیت:

انسانی معاشرہ ایک اچھے ماحول میں ترقی کرتا ہے۔ اگر ہمارے اردگرد دہشت، ڈر، خوف اور عدم تحفظ کا ماحول ہو تو معاشرتی بقا جمود کا شکار ہو جائے گی۔ ناول نگاروں نے نہ صرف جرائم کی تصویر پیش کی ہے بلکہ ان کا حل بھی اپنی تخلیقات کے ذریعے بتانے کی کوشش کی گئی ہے تاکہ اچھے ماحول میں معاشرہ ترقی کرے۔ دنیا بھر کے ناول نگاروں نے جرائم کی سیاسی وجوہات، معاشی اسباب، اخلاقی برائیاں، معاشرتی اونچ نیچ، کمزور ایمان، فرسودہ روایات کا ذکر کیا ہے۔ اردو ناول نگاروں نے بھی اس تغیر آمیز موضوع پر لکھا ہے اور جرمیات سے پیدا ہونے والی فکری، اخلاقی، سیاسی اور سماجی کشمکش کی تمام جہتوں کو بیان کیا ہے لیکن اس حوالے سے اردو ادب میں تحقیقی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ مجوزہ تحقیق سے اردو ناول میں بیان کیے گئے جرائم کا تجزیہ کر کے اسباب و محرکات کو سامنے لایا جائے گیا ہے تاکہ معلوم ہو سکے کہ اردو ناول نگاروں نے کس طرح جرمیات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ اس تحقیق سے اردو ناول میں جرائم کی پیشکش کے حوالے سے ایک مربوط کام سامنے آیا ہے جو یقیناً اردو ادب کے طلباء کے لیے سود مند ہو گا۔

ب۔ جرم کی تعریف اور جرمیات کا مفہوم:

جرم یعنی (Crime) عربی زبان کا لفظ ہے اس کے لغوی معنی گناہ، قصور اور تقصیر کے ہیں۔ فیروزاللغات میں اس کے معنی یوں ہیں:

"قصور، خطا، تقصیر، گناہ، خلافِ قانون حرکت"۔[1]

اوکسفرڈ ڈکشنری کے مطابق اس کی تعریف یوں ہے:

"An action which constites a serious offence against an individual or the state and is punishable by law".[2]

نافرمانی یا ریاستی قانون کی نظر میں قابل سزا فعل ہے۔ انگریزی میں اس کے لیے لفظ کرائم (Crime)اور اس کے متعلق علم کو(Criminology) کہا جاتا ہے. جو جرم کرتا ہے وہ مجرم کہلاتا ہے. مختصر الفاظ میں جرم ایک غیر قانونی, غیر اخلاقی اور قابل سزا اقدام یا فعل کو کہتے ہیں۔

ہوج۔ ڈی۔ بارلے(Hugh D. Barlow)نے جرم کی تعریف اس طرح کی ہے:

"جرم ایک انسانی فعل ہے جس سے فوجداری قانون کی خلاف ورزی ہوتی ہے"۔

"A crime is a human act that violates criminal law"[3]

"آئینی لحاظ سے جرم سے مراد انسان کا وہ فعل ہے جو قانون کی نگاہ میں قابل سزا ہو"۔

جرم کی عمرانی تعریف:

اس دنیا میں انسان کے دو بڑے دشمن ہیں۔ ایک آفات سماوی اور دوسرا خود انسان۔ قدرتی آفات میں سیلاب سمندری طوفان، بیماریاں جیسا کہ آج کل دنیا میں کروناوائرس نے تباہی مچائی ہوئی ہے وغیرہ۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ انسان اس کا علاج دریافت کرلیتا ہے اور معاشرہ اپنی زندگی جلد بحال کرلیتا ہے۔ دوسرا انسان کی اپنی لائی ہوئی تباہی ہے۔ جیسے جنگ وجدل، مہلک ہتھیاروں کا استعمال جس سے ایک ہی لمحے میں لاکھوں انسان موت کی وادی میں چلے جاتے ہیں۔ جنگ عظیم اوّل اور دوم کا حال ہمارے سامنے ہے۔ انسان کی اپنی لائی ہوئی آفت کا مداوا مشکل سے ہی حل ہوتا ہے۔ انسان اپنی خواہشات کی تکمیل کے لیے ہر جائز وناجائز

طریقہ استعمال کرتا ہے اور معاشرتی یا عمرانی اقداروں کو پامال کرتا ہے۔ اس طرح ان جائز و ناجائز طریقوں کا استعمال اسے جُرم کی طرف راغب کرتا ہے۔ جرم کی ایک تعریف اس طرح ہے:

> "Crime may be defined as any act which is punishable by law. It includes theft, robberies, dacoities, murders, kidnapping, smuggling, narcotics, trafficking, illegal transaction of foreign exchange and many more".[۴]

جرمیات اس مطالعے کا نام ہے جس میں معاشرے کے افراد کی مجرمانہ ذہنیت کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ قانونی خلاف ورزیوں کی نوعیت اوراس کی روشنی میں کی جانے والی قانون سازی کا جائزہ لیا جاتا ہے۔ قانونی محاسبے کے بعد مجرموں کی اصلاح اور بحالی کے لیے ان سے برتاؤ کی پالیسی مرتب کی جاتی ہے۔ ان اقدام کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ان سے انسداد جرائم کے اداروں خصوصاً عدالتوں کو ایسا طریقہ کار اختیار کرنے میں مدد ملتی ہے جو جرائم کی اصلاح کا باعث بنے اور آئندہ ایسا کرنے سے باز رہیں۔ جرم خواہ کتنا ہی بڑا یا بد اخلاق کیوں نہ ہو اس وقت تک اسے جرم نہیں کہا جا سکتا جب تک اسے قانوناً جرم قرار دے کر سزا مقرر نہ کی جائے۔ جرم کیوں کر ہوتے ہیں وہ کون سے حالات و واقعات ہیں جو جرائم پیشہ افراد کے لیے ماحول فراہم کرتے ہیں۔ جرمیات کے زمرے میں آتے ہیں۔ اس کی دو بڑی شاخیں جو درج ذیل ہیں۔

i۔ کرمنالوجی:

جرمیات یا کرمنالوجی کے ذریعے ایسے جسمانی نفسیاتی، حیاتیاتی، سماجی عوامل کا تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کیا جاتا ہے جس کی وجہ سے جملہ جرائم جنم لیتے ہیں یا جو کسی فرد کو مجرم بنانے کا باعث بنتے ہیں۔ اس تجزیہ میں جرمیات کے ماہرین کی رائے کو پیش نظر رکھتے ہوئے نتائج مرتب کیے جاتے ہیں۔ پھر نتائج کے معاشرے پر اثر و نفوذ کے حصول کے لیے مددگار عوامل کا جائزہ بھی لیا جاتا ہے۔ سادہ الفاظ میں جرمیات کے علم سے مراد:

۱۔ جرم کی حقیقت سے آگاہی اور ان کی روک تھام کرنا ہے۔
۲۔ سزا کے قواعد و ضوابط اور ان میں موجود خامیوں کو دور کرنا۔
۳۔ جرائم کے اسباب کی روشنی میں مجرموں اصلاح یا ذہنی بیمار مجرموں کے علاج جیسے معاملات پر غور کرنا۔
جرائم کی تشریح اور مطالعہ جرم پر بحث کرنا۔

ii۔ پنالوجی:

علم تعغیرات یا پینالوجی کے تحت مختلف جرائم کے اسباب و محرکات کو جاننے اور مجرمین کے لیے سزاؤں، ان کے مخصوص قید خانوں کے انتظام نیز مضروب کو ہرجانہ یا اس کا حق دلانے کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اس علم کے ذریعے عدل و احتساب کے نظام اور ضابطہ کی کارروائیوں کے طریقہ کار کا مطالعہ بھی کیا جاتا ہے تاکہ جرائم کا تدارک ہو۔ لفظ جرم سے ہی علم جرمیات نکلا ہے۔ جرمیات کے علم میں اس بات کا جائزہ لیا جاتا ہے کہ مجرم کے جرم کی نوعیت کیا ہے؟ مجرمین کے ساتھ سماجی درجہ بندی کے لحاظ سے برتاؤ نیز قید و بند اور مجرمین پر سزاؤں کے اثرات اور نفسیاتی اعتبار سے ان کے کردار کا جائزہ لینا بھی شامل ہے۔

جرم کی تاریخ:

جرم کی تاریخ کے حوالے سے ہمیں جرم کا پہلا ماخذ قرآن کریم سے ملتا ہے۔ قرآن کریم کی سورۃ البقرہ کی آیت ۳۰ تا ۳۹ میں حضرت آدم علیہ السلام کو زمین پر خلیفہ بنائے جانے، شیطان کی نافرمانی راندہ درگاہ ہونے، اس کے ساتھ حضرت آدم علیہ السلام اور حوّا کی تقصیر یا خدا تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی اور قربِ الٰہی کی حیثیت سے محرومی کا ذکر ملتا ہے۔ خدا کی نافرمانی کی شکل میں پہلا جرم ابلیس سے سرزد ہوا جو اس وقت معلم الملکوت کہلاتا تھا۔ اس نے خداوند تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لیے کفر یا انکار کرنے والوں کا مستحق قرار پایا۔ خدا تعالیٰ کی نافرمانی کا دوسرا جرم حضرت آدم و حوّا سے سرزد ہوا۔ شیطان کے بہکاوے میں آ کر انھوں نے ممنوعہ شجر کا پھل کھایا۔ پھر سزا کے طور پر قربِ الٰہی اور جنت سے محروم ہو گیا۔ ایک مقررہ وقت تک کے لیے زمین پر بھیج دیا گیا۔

تیسرا جرم حضرت آدم علیہ السلام کے دو بیٹوں ہابیل اور قابیل سے سرزد ہوا جس کا ذکر سورہ مائدہ کی آیت نمبر ۲۷ تا ۲۹ میں کیا گیا ہے۔ جس میں ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو اس لیے قتل کر ڈالا تھا کہ اس کی قربانی قبول نہیں ہوئی تھی اور اس ظلم کے سبب وہ زیاں کاروں میں شامل ہو گیا۔ یہ کائنات میں پہلا قتل تھا۔

جُرم کا اسلامی تصور:

شریعت اسلامیہ کی رو سے جُرم کی تعریف یہ ہے کہ:

> ”ایسی شریعی ممانعتیں جو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں مقرر فرمائی ہیں، جن کے کرنے پر حد یا تعزیر کا اطلاق ہوتا ہو، جرم کہلاتا ہے“۔[۵]

قرآن کریم کی سورۃ زخرف آیت نمبر ۷۴ میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

"اِنَّ الْمُجْرِمِینَ فِی عَذَابِ جَہَنَّمَ خَالِدُونَ"۔

"یعنی بے شک مجرمین جہنم کے عذاب میں رہیں گے"۔(۶)

قرآن کریم میں "المجرم" مجرما "مجرمین" اور مُجرِمون کا ذکر کئی بار آیا ہے۔ لفظ مُجرمون ۱۵ دفعہ اور لفظ مُجرمین ۳۴ دفعہ آیا ہے۔

شرعی اصطلاح میں وہ جرائم جن کے لئے عقوبت مقرر نہیں اور مقدار عقوبت کا فیصلہ حاکم مجاز یعنی عدالت قانون رائج الوقت کے تحت کرسکتی ہے نیز ایسی قانون سازی کا اختیار حکومت وقت کو ہوتا ہے۔ قصاص یا دیت کے علاوہ جو سزائیں حکومت نافذ کرے گی وہ تعزیز کے ضمن میں آئیں گی۔

اسلامی قانون کے بارے میں مغربی مفکروں کی آراء:

بعض مغربی مفکرین نے اسلامی سزاؤں کو بہت سخت کہا ہے بلکہ ان سزاؤں پر تنقید کی ہے لیکن بعض مفکرین جو کہ سنجیدہ ہیں ان کی اسلامی قانون کے بارے میں بہت اچھی رائے ہے۔ درجِ ذیل مفکرین کی آرا پیشِ خدمت ہیں:

۱۔ مفکرِ پاکستان علامہ اقبال جرمنی کے مشہور مفکر گوئٹے (۱۷۴۹ء تا ۱۸۳۲ء) کے بارے میں کہتے ہیں کہ اسلامی قانون کے بارے میں اس کے خیالات یہ تھے کہ: "یہ قانون کبھی ناکام نہیں ہوا بر خلاف ازاں ہم نظام ہائے مقررہ کے باوصف اس عظمت کی بلندیوں کو نہیں چھو سکے"۔(۷)

۲۔ مشہور مغربی مفکر جارج برناڈ شاہ (۱۸۵۶ء-۱۹۵۰ء) کے مطابق: "دورِ حاضر کی بداعتدالیوں اور ناانصافیوں کا تقاضا یہ ہے کہ انہیں زائل کرنے کے لیے کلی اختیارات شریعت محمدیہ کے بانی سیدنا محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے کر دیئے جائیں"۔(۸)

۳۔ (Thonissen Joseph:1816-1891)

اس کا یہ قول کہ "حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے عمداً برائیاں کرنے والوں کو سزا دینے کی اجازت اس مقصد سے دی کہ ان سے زیادہ سنگین برائیوں کا انسداد ہو سکے"۔(۹) انسان فطرتاً نیک اور صالح پیدا ہوا ہے جیسا کہ سورۃ وتین میں ارشاد باری تعالیٰ ہے:

"لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیٓ اَحْسَنِ تَقْوِیمٍ" اور ہم نے انسان کو بہت اچھی صورت میں پیدا کیا"۔(۱۰)

جب تک انسان اپنی اصل حالت میں ہوتا ہے اور اعمال صالح کرتا ہے تو وہ اشرف المخلوقات ہے۔ لیکن یہی انسان جب گناہ یا جرم کی آلودگی سے اپنے جسم کو داغدار کر لیتا ہے تو وہ اسفلا لسافلین (نیچوں سے نیچ) بن جاتا ہے۔ جب تک وہ تاریکی اور ذلت کے آخری درجے تک نہیں پہنچ جاتا۔ اس کا ضمیر اور اس کی عقل سلیم اسے معصیت اور جرم کے احساس سے لگاتار متاثر کرتی رہتی ہے اور اندر ہی اندر اسے ہر دم نیکی کی آواز سنائی دیتی رہتی ہے۔ انسانی روح کو نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کا فطری طور پر علم ہوتا ہے۔ نیکی اور بدی میں تمیز کرنے کے لیے ہر بات روح کے آئینے میں اس وقت تک منعکس ہوتی رہتی ہے جب تک انسان کا دامن پوری طرح گناہوں سے داغدار نہ ہو جائے۔

جرم کے نظریات:

i۔ کلاسیکی نظریہ:

جرم کی کلاسیکل نظریہ کی بنیاد سیزر بکیریا ۱۷۳۸ء تا ۱۷۹۴ء (Cesare Baccaria) اور جرمی (Jermy Benthan) نے رکھی۔ یہ نظریہ ۱۷۷۵ء میں مغرب میں بہت مقبول ہوا۔ انگریزی زبان میں کرائم یا آفنس قابل سزا تھے۔ بکیریا کو بابائے جرمیات کہا جاتا ہے۔ اس نے اپنا نظریہ ۱۷۶۴ء میں پیش کیا اور جرمیات میں نئے دور کا آغاز کیا۔ "قانون سازی اور اخلاقی اصول" کتاب اور اس میں جرائم کے بارے میں نظریہ اور انسانی زندگی میں خوشی حاصل کرنے اور غمی سے بچنے کے لیے کوشش کرتا ہے اور اسی طرح ہر انسان کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ غمی سے دور رہے اور خوشی کے قریب ہو۔ لوگ اکثر جرم اسی جذبے کے تحت کرتے ہیں۔ اس نظریے کے مطابق سزا جرم سے حاصل کی گئی خوشی کے مطابق ملنی چاہیے۔ انسان کی اپنی مرضی کو جرم قرار دیا۔ بکیریا کے مطابق:

> "When the opportunity for crime arises, the individual has a free choice between criminal and non-criminal behavior. It the payoffs for the criminal act are greater than the retribution it will brings, so the probability of a crime increases."(11)

یہ کلاسیکل نظریہ ضرور ہے لیکن اسے مجرمانہ نیت کے ساتھ جوڑ دیا گیا ہے جس کی وجہ سے اس کی افادیت کم ہو گئی اور اسے جلد ہی رد کر دیا گیا۔

ii۔اشتراکی نظریہ:

اشتراکی نظریہ کی ابتدا ۱۸۴۸ء میں کارل مارکس(۱۸۱۷ء تا ۱۸۸۳ء) (Karlmax)، انجلز (Angals)نے کی اور بونگر نے اس میں توسیع کی(W.A. Bonger)اس نظریے کے مطابق جرم کی سب سے بڑی وجہ سرمایہ دارانہ نظام ہے جو معاشرے میں دولت کی غیر منصفانہ تقسیم پیدا کرتا ہے۔اس غیر منصفانہ تقسیم سے کارخانہ دار، صنعت کار، بڑے بڑے سرمایہ دار غلط فائدہ اٹھاتے ہیں جس سے نچلے طبقے کے لوگوں میں شدید رد عمل پیدا ہوتا ہے۔ سرمائے کی غیر منصفانہ تقسیم غریب اور مالدار طبقہ پیدا کرتا ہے جس طبقاتی کشمکش کے نتیجے میں جرائم جنم لیتے ہیں۔جب تک یہ غیر منصفانہ تقسیم سرمایہ رہے گی جرائم ہوتے رہیں گے۔

> "In a capitalist system, the unequal distribution of wealth means that those without finance have to resort to crime enjoy the luxuries and advantages seen to be enjoyed by others. Crime there for is in some intances a function of porerty".(12)

iii۔اجسامی نظریہ:

چارلس ڈارون(۱۸۰۹ء تا ۱۸۸۲ء) (Charles Daron) نے اس نظریے کی بنیاد ۱۸۶۵ء میں رکھی۔اس نظریے کی بنیاد یہ ہے کہ انسان جرم کا ارتکاب جسمانی ساخت کی بنیاد پر کرتا ہے۔ڈارون سے قبل فراز جوزف(Fraz Josphgalt)کا نام ملتا ہے جو جیل میں قیدیوں کی کھوپڑیوں اور ہاتھوں کا مطالعہ کرتا تھا اس لیے اس کو باڈی ٹپ اسکول بھی کہا جاتا ہے۔ایماکر بیلن اس نظریے کا بڑا زبردست حامی تھا۔

> "کوئی بھی جسمانی ساخت کا نقص انسان کو جرم کرنے پر اکساتا ہے۔ مجرم کی جسمانی ساخت کا حامل شخص خود کو نارزن خیال کرتا ہے۔"(۱۳)

iv۔ تمدنی نظریہ:

اس نظریہ کا بانی ایمل ڈرخائم (۱۸۵۸ء تا ۱۹۱۷ء) ہے اور یہ اپنی فکر کی وضاحت کے لیے انومی (Anomie) کی اصطلاح کو استعمال کرتا ہے جس کا ترجمہ معاشرتی کا ہے۔ کئی دوسرے ماہرین مثلاً سیون بیو کر نے اس اصطلاح کی تشریح میں بڑی محنت کی .ماہر جرمیات مرٹن نے بھی ۱۹۳۸ء میں اس "معاشرتی خلا" پر مضامین لکھے۔ اس نظریہ کے مطابق جب مختلف تہذیب و تمدن مختلف انسانی رویوں کو جنم دیتے ہیں جو کہ مجرمانہ ذہنیت میں اضافہ کرتے ہیں۔ تمدن اور تہذیب ہی معاشرے میں انسانی کرداروں کو بنانے اور بگاڑنے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کے مطابق:

> "For a society to be flexible enough to permit positive deviation, It must permit negative deviation as well. If no deviation is permited, societies become stagnant. Crime helps prepare society for such changes. Crime is one of the prices we pay for freedom. Forthermore crime is normal."(14)

ماحولیاتی نظریہ:

اس نظریہ کے مطابق:

> "جغرافیائی حالات، ہجرت، نقل مکانی اور علاقائی ماحول انسان کو جُرم کرنے پر اکساتا ہے۔ مُجرم ماحول کو دیکھ کر جرم کرتے ہیں۔"(۱۵)

ماہر ماحولیات نقشوں یا چارٹوں کی مدد سے جرائم کی مقامی اور مکانی تقسیم کا دوسرے عوامل کے ساتھ تقابل کرتے ہیں۔ اس طرح مخصوص جرم والے علاقوں کی نشاندہی آسانی سے ہو جاتی ہے۔ اس لیے انگریزوں نے برصغیر میں پولیس ایکٹ ۱۸۶۱ء کے تحت اسی علاقے کے مقامی افراد کو اسپیشل پولیس میں بھرتی کیا جاتا ہے تاکہ مجرم کی تاریخ آسانی سے معلوم ہو۔ لیکن بعض علاقے مخصوص جرائم کے لیے بھی مشہور ہوتے ہیں جیسا کہ میانوالی اور اس کے گردونواح میں لواطت کے کیس زیادہ رپورٹ ہوتے ہیں۔ شیخوپورہ اور قصور میں کم سن

بچیوں سے جنسی زیادتی کے کیس رپورٹ ہوتے ہیں۔ بچوں میں جرائم کے لیے فیصل آباد کا علاقہ زیادہ مشہور ہے۔

vi۔ حیاتیاتی نظریہ:

اٹالین ماہر جرمیات لومبراسو(Lumbraso) گیری فیلو(Garifelo) گورنگ (Gorang) اور ہوٹن(Hoton) نے ۱۸۷۵ء میں اس نظریے کی بنیاد ڈالی۔ ہوٹن کے خیال کے مطابق انسان کی جسمانی ساخت، وراثتی نقائص نسلی خصوصیات اور جسمانی بدہیئتی کو بنیاد بنا کر جرائم کی وجوہات تلاش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لومبراسو جو کہ اٹالین فوج میں ڈاکٹر تھا، ڈارون کے انسانی ارتقا کے نظریے سے متاثر تھا۔ اس نظریئے کو لونیات کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس میں کلیہ ایکس وائی وائی(x-y-y) استعمال ہوتا ہے یعنی x23 اور ۲۳ ہی y لیکن ان میں سے ایک کا اضافہ ہوا اور وہ چوبیس ۲۴ ہو جائیں تو وہی پیدائشی نقص انسان کو جرم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

> "XYY Chromosomed abnormality presence of an extra Y chromosome in a male. It has been argued that this abnormality is related to criminal behavior."(16)

معاشرتی یا عمرانی نظریہ:

اس نظریے کی رو سے انسان ایک معاشرتی حیوان ہے اسے زندہ رہنے کے لیے معاشرے کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ ایک دوسرے کے حقوق و فرائض کا خیال رکھنا لازمی امر ہے۔ باہمی احترام کا رشتہ ہی اسے ایک اچھا شہری بناتا ہے۔ اس نظریے کے بانی شیلڈن(Sheldon) گلواک(Glveck) اور ینگ(Young) ہیں۔ ایڈون سدرلینڈ(Sotherland E.H) نے ۱۹۲۰ء سے لے کر ۱۹۵۰ء اپنی وفات تک اس نظریے پر کام کیا۔

ا۔ شیلڈن کے مطابق انسان معاشرے میں زندگی بسر کرتے ہوئے دوسرے ساتھی افراد سے جرم کرنا سیکھتا ہے۔

۲۔ گلواک اور ینگ کے مطابق جرم ایک معاشرتی رجحان ہے کیونکہ معاشرتی عمل ایک باہمی عمل ہے جو جرم کا سبب یا وجہ بنتا ہے۔ فرانسیسی مفکر جبرائیل ٹریڈ بھی اس نظریے کا حامی ہے۔

۳۔ ڈچ مفکر ڈبلیو اے،ہنیگر کے مطابق معاشرے میں امیری اور غریبی جرائم کا سبب بنتی ہے۔یعنی اس کا نظریہ کارل مارکس کا ہی نظریہ ہے۔

۴۔ ایڈون سدرلینڈ کے مطابق:

"جرم معاشرتی ارتقاء کے ساتھ جنم لیتا ہے اور معاشرتی تبدیلی کے ساتھ جرم کی تعریف بھی بدل جاتی ہے۔حالات ہی انسان کو مجرم اور اچھا شہری بننے میں مدد دیتے ہیں۔"(۱۷)

نفسیاتی نظریہ:

ماہر نفسیات فرائڈ (Faride 1856-1939) نے ۱۹۲۵ء میں اس نظریے کی بنیاد رکھی۔ اس نظریے کے مطابق جرم کا تعلق اس کے ذہنی تناؤ یا اس کے نفسیاتی پہلو سے جوڑا جاتا ہے۔یعنی موروثی طور پر اگر انسان کو ذہنی اور نفسیاتی کھچاؤ موجود ہو تو وہ اِسے جرم کرنے کے لیے آسانی پیدا کرتے ہیں۔ کورنگ (Goring) اور فیوڈ کے خیال کے مطابق جرم کرنے والا عام آدمی کی نسبت ذہنی اور نفسیاتی اعتبار سے کم ہوتا ہے۔ان کی ذہنی سوچ عام آدمی سے پست ہوتی ہے۔اسی وجہ سے وہ جرم کرتا ہے۔

> "According to freud, Humans have meutal conflicts because of desires and energies that are repressed into the unconscious. These urges, ideas, desire and instincts are basic, but they are repressed because of society's morility. People try frequently to express these natural drives in some way, often indirect to avoid the reactions of others."(18)

بعض اوقات وہ خودکشی جیسا جرم بھی کرتا ہے۔اس میں ڈر اور غصّے کا عنصر غالب ہوتا ہے۔

تحلیل نفسی کا نظریہ:

اس نظریے کا بانی فرائڈ تھا۔ اس نظریے کے تحت بعض اوقات انسان شریف النفس ہونے کے باوجود بعض مخصوص حالات میں گناہ یا جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔یعنی ذہنی تناؤ اسے جرم کرنے پر مجبور کرتا ہے۔

وہ انسان کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے۔ مثلاً بھوک، جنسی خواہش کے درمیان انحراف(Conflict) پیدا ہوتا ہے۔ دوسری طرف سے زندگی میں ترقی اور کامیابی کی خواہش محدود ذرائع اور مواقع درمیان ہوتی ہے۔

> "ایک شخص کو اپنی ذہنی آویزش کی بنیاد کا علم نہیں ہوتا۔ ابتدائی محرومیاں یا طویل عرصے سے دبی رہنے والی خواہشات کے نتیجے میں پیدا ہونے والا کھچاؤ برداشت کی قوت کو کمزور کر کے انسان کو اندر سے توڑ دیتا ہے اور وہ جرم کرتا ہے۔"(۱۹)

شکاگو کے ماہر جرمیات ڈاکٹر ولیم ہیلی نے بھی انسان کے اندر کی ٹوٹ پھوٹ کو جرم کی بنیاد قرار دیا۔

کثیر الاسبابی نظریہ:

اس نظریے کے تحت جرم کے کئی اسباب ہوتے ہیں جو انسان کو مجرم بننے پر مجبور کرتے ہیں۔ لہٰذا ان وجوہات اور اسباب کا علیحدہ علیحدہ تجزیہ ضروری ہے۔ گنجان آبادی کے علاقوں میں جرائم کم و بیش مختلف طریقوں اور وجوہات کی بنا پر ہوتے ہیں۔ کسی علاقے میں ڈاکے زیادہ پڑتے ہیں تو دوسرے علاقے میں قتل کی وارداتیں زیادہ ہوتی ہیں۔ تیسرے علاقے میں عصمت فروشی جیسے جرائم ہوتے ہیں۔ چوتھے علاقے میں منشیات اور شراب کا دھندہ زیادہ ہوتا ہے۔ یوں جرائم کا کثیر السبابی نظریہ وجود میں آیا۔ "کم آمدنی والا طبقہ غیر متجانس آبادیاں، آبادی میں بہت زیادہ اضافہ اس کے اسباب ہیں۔"(۲۰)

بدنامی کا نظریہ:

اس نظریے کے بانی فرینک ٹیفسن بام لیمرٹ اور ماہر جرمیات بیکر جیسے ماہرین شامل ہیں۔ بیکر نے اپنی کتاب (بیرونی لوگ) میں اس نے کہا کہ اگر کوئی شخص بھول کر بھی جرم کرتا ہے تو اس پر بدنامی کا داغ لگ جاتا ہے۔ جو کہ اسے جرم کی وادی میں دھکیل دیتا ہے اور یہی جرائم کی دنیا اسے جرم کرنے پر مجبور کرتے ہے۔

> "As the label becomes a role for the labelled individual, so the role is reinforced, so the person's life changes suite the role. More crimes are committed the peer group changes to others playing the some role, the person indentity be comes that of a "Criminal" with all its associated values, attitudes, and beliefs."(21)

تصادمی نظریہ:

کارل مارکس اس نظریے کا بانی ہے۔ اس نظریے کے مطابق معاشرتی ردِ عمل کے طور پر معاشرے کے اجتماعی کردار میں تصادم جرائم کا سبب بنتے ہیں۔ معاشرتی تصادم کی کئی اقسام ہیں۔ ایک گروہ دوسرے گروہ سے اس وقت تصادم ہوتا ہے جب دوسرے کے مفاد اور مقصد میں دخل اندازی ہو۔ بہت سے جرائم سیاسی اصلاحات کے سلسلے میں شروع کی جانے والی ایک احتجاجی تحریکوں کے نتیجے میں کیے جاتے ہیں۔ ادارے کی تنظیم اور انتظامیہ کے مفادات میں تصادم ہو جائے۔ تھارسٹن سیلن نے سماجی تصادم کی وجہ بیان کرتے ہوئے جرائم کی وجوہات کی وضاحت کی ہے کہ ہر شخص اپنے سیاسی، معاشرتی، ثقافتی، ماحولیاتی اور طبقاتی نظریات کا دفاع کرتا ہے اور یوں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے یا ذاتی مفاد کو حاصل کرنے کے لیے جرائم کرتے ہیں ان کی نوعیت اور طریقہ کار مختلف ہوتا ہے۔ ماہرین نے اس کی تعریف اس طرح بھی کی ہے:

> "There must something rotten in the very core of social system which increases in wealth without diminishing its misery and increases in crime even more rapidly than in numbers". (22)

مجرمانہ کردار کا نظریہ :

جبرائیل ٹارڈے (۱۸۴۳ء تا ۱۹۰۴ء) کے مطابق اچھے لوگوں کی صحبت سے اچھا انسان اور بُرے لوگوں کی صحبت سے بُرا انسان یعنی مجرم تیار ہوتے ہیں۔ شیخ سعدی کے مطابق:

صحبت صالح ترا صالح کند
صحبت تالح ترا تالح کند (۲۳)

جس طرح دوسرے پیشے سیکھے جاتے ہیں، اسی طرح بُرے لوگ بھی دوسروں کو بُری تربیت ہی دیتے ہیں۔ سدرلینڈ نے ٹارڈے کی حمایت میں مضامین لکھے جن میں کہا گیا کہ مجرم کے ذہن کو معاشرہ تیار کرتا ہے۔ ساز گار حالات کو دیکھ کر جرم کرتا ہے۔ جب وہ ایک بار جُرم کر لیتا ہے اور جیل کی ہوا کھا لیتا ہے تو جرم میں نکھار پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر وہ اغوا برائے تاوان، جرائم پیشہ گروہ کا کارندہ، ہر وہ کام دلیری سے کرتا ہے جس کے لیے پہلے اس میں ہچکچاہٹ تھی۔

جنیاتی نظریہ:

اس نظریہ کو(Endocriminology) کا نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ یہ نظریہ جنسی رجحان جرم پر منتج ہوتا ہے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد یورپ کی جیلوں اور معاشرے میں عام دیکھا گیا۔ دو مفکر جنہوں نے اس نظریے کو پروان چڑھایا وہ پی اے جیکب(P.A. Jakeb) اور جے جے اسٹرانگ(J.A. Strong) ہیں۔

> "It may be true that the role of genaties in criminal behavior cannot be separated from the role of autonomie and central nervous system of the body. Thus the finding relating genaties to criminal behavior may be important mainly in the fact that they point toward the importance of studing biological factors in general". (24)

غریب اور جنگ زدہ علاقوں میں ان کی تعداد میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ شام، عراق اور افغانستان میں ہوا۔

معاشرے میں جنم لینے والے جرائم کے اسباب:

پاکستان ایک غریب ملک ہے لوگوں کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے بہت زیادہ دشواریوں کا سامنا ہے۔ ۲۰۲۰ء سے کرونا وائرس کی وجہ سے کمر توڑ مہنگائی نے بڑے بڑے کاروباری لوگوں کو زمین پر بٹھا دیا ہے۔ ناخواندگی، غربت جہالت، طبقاتی کشمکش، اخلاقی گراوٹ اور لاقانونیت نے ہمارے معاشرے کو اپنی گرفت میں لے لیا ہے۔ بڑے کاروباری مگرمچھوں نے چینی اور آٹا جیسی بنیادی ضروریات کا ذخیرہ کر کے مہنگا کر دیا ہے جس سے جرائم میں اضافہ ہوا ہے۔ انسان فطری طور پر جرم سے پاک ہے۔ مذہب اور سائنس بھی اس پر یقین کرتے ہیں۔

i۔ گھریلو ماحول:

معاشرے کی بنیادی اکائی کنبہ یا خاندان ہوتے ہیں جس سے معاشرہ بنتا ہے اور تمام سماجی ادارے اپنی جڑ پکڑتے ہیں۔ مجرم غلط تربیت اور بُرے ماحول کی پیداوار ہوتے ہیں۔ غلط تربیت کی تمام تر ذمہ داری خاندانی

ماحول پر ہوتی ہے۔ والدین کے جھوٹ اور بد کلامی کی وجہ سے بچوں پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ والدین کی آپس کی لڑائی ایک طرف دوسری جانب بچوں کے ساتھ بُرا سلوک، ڈانٹ ڈپٹ، مار پیٹ اور گالم گلوچ ان کو گھر سے متنفر بنا دیتی ہے۔ بچے گھروں سے خراب، بُرے لوگوں کی صحبت ان کے ذہن میں جرم کی تحریک پیدا کرنے کا سبب ہے۔ ایسے بگڑے ہوئے کے آگے چل کر خطرناک مجرموں کی صف میں جگہ پاتے ہیں۔ پہلے خاندانی نظام میں لوگ اکٹھے رہتے تھے۔ کسی نہ کسی کا ڈر ہوتا تھا لیکن اب ہمارا خاندانی نظام ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے سے بچے جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ معاشرے میں طلاق کی شرح کا زیادہ ہونا بھی بچوں میں تنہائی پیدا کرتا ہے اور اس کی تربیت کا فقدان بھی جرائم کا سبب ہوتا ہے۔

ii۔ غربت:

عمرانیات کے ماہرین کے نزدیک نوجوان طبقہ میں بڑھتے ہوئے جرائم کا بڑا سبب غربت کو قرار دیا گیا ہے۔ زیادہ تر مجرم طبقے کا تعلق غربت یا معاشی بدحالی سے ہوتا ہے۔ پاکستان ایک غریب ملک ہے جہاں لوگوں کو ضروریات زندگی پوری کرنے میں مہنگائی اور بے حد مالی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ زمینوں اور جائیداد کی غیر منصفانہ تقسیم بھی غربت کا سبب ہیں۔ صنعت و حرفت کے میدان میں بھی ترقی نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیوں کہ صنعت و حرفت ہی بے روزگاری ختم کرنے میں کردار ادا کرتی ہے۔ اَن پڑھ تو ایک طرف پڑھے لکھے افراد کے لیے بھی ملازمت کے مواقع بہت ہی کم ہیں۔ ملک بیرونی قرضوں کی وجہ سے معاشی بدحالی کا شکار ہے۔ ان حالات میں روٹی انسان کو مجرم بننے پر مجبور کرتی ہے۔

iii۔ ناخواندگی:

جرائم میں اضافے کا ایک بڑا سبب غیر تعلیم یافتہ یا اَن پڑھ ہونا ہے۔ عوام کی اکثریت ناخواندہ ہے۔ پاکستان میں لاکھوں بچے سکول ہی نہیں جاتے میٹرک سے پہلے سکول چھوڑنے والے بچوں کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ لاعلمی کے باعث کوتاہ نظر اور قدامت پسندی بھی ہے۔ اچھے اور بُرے کی پہچان نہیں ہے۔ زیادہ جرائم پیشہ افراد سماجی، اخلاقی، مذہبی برائیوں کے سبب جرائم کرتے ہیں۔ محنت سے عاری طبقہ راتوں رات مالدار ہونے کے چکروں میں جرم کرتے ہیں۔

iv۔ طبقاتی تقسیم:

ہمارے ملک میں مسالک اور پارٹی اصولوں کی خلاف ورزی، اونچ نیچ اور طبقاتی کشمکش پائی جاتی ہے۔ یہی اونچ نیچ اور کشمکش کئی جرائم کا سبب ہے۔ اس طبقاتی کش مکش کی وجہ سے آئے روز گروہوں کے درمیان قتل، جھگڑا، مار پیٹ، چوریاں، ڈکیتیاں، اغوابرائے تاوان، جنسی ومالی جرائم ہوتے ہیں۔

v۔ معاشرتی اقدار وروایات:

ہمارے معاشرے میں اکثریت دیہات کی ہے۔ دیہاتی معاشرے میں دشمن سے بدلہ لینا ذاتی وقار اورانا کی حیثیت رکھتا ہے۔ نیز ذات برادری کی عزت و حرمت مذہب سے بھی آگے نکل گئی ہے۔ عدالتوں کی بجائے خود بدلہ لینے کا جذبہ غالب ہے۔ قاتل کی بجائے اس کے رشتہ داروں کی شامت آجاتی ہے اور یہ سلسلہ نسل در نسل جاری وساری ہے۔ جس کے سبب قتل سے لے کر ہر طرح کے جرائم جنم لیتے ہیں۔

vi۔ جذباتی کش مکش:

ہمارے اکثر جرائم کا سبب جذبات ہوتے ہیں۔ میاں بیوی میں غلط فہمی، مخالف پارٹی یا مسلک کے خلاف جذبات کو بھڑکانا جرائم کو جنم دیتا ہے۔ لوگ جذبات میں آکر عورتوں تک کی تذلیل کر گزرتے ہیں۔ حال ہی میں سیالکوٹ میں مذہبی جنونیوں نے سری لنکن فیکٹری مینجر کو قتل کر کے لاش کو جلاڈالا جو پوری دنیامیں ملک کی بدنامی کا سبب بنا۔

vii۔ غیر اخلاقی فلمیں:

غیر اخلاقی فلمیں اور انٹرنیٹ کی غلط سائٹس نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی، مار پیٹ، عریانیت جیسے جرم کی ترکیب ملتی ہے۔ ایسی فلموں سے نوجوانوں میں فرسودہ عشق و محبت، والدین سے بدتمیزی، گھروں سے فرار ہونا، راہ چلتے لڑکیوں کو چھیڑنا، موبائل فون چھیننا، لڑکیوں کو فقرے کسنا، ایک پہیے پر موٹر سائیکل چلانا جیسی تربیت ملتی ہے۔ ان فلموں سے زنا، اغواہ، قتل، ڈکیتی اور جنسی بے راہ روی کے رجحانات پیدا ہوتے ہیں جو کہ معاشرے میں جرائم کا سبب بنتے ہیں۔

viii۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی:

جرائم میں اضافے کا سبب ذرائع آمدورفت کی ترقی بھی ہے۔ تیز رفتار ذرائع آمدورفت نے چوری اور ڈکیتی جیسے جرائم کرنے کے بعد اکثر لوگ بیرون ملک فرار ہو جاتے ہیں۔ بڑے جرائم پیشہ افراد جیسے عزیز بلوچ، اجمل پہاڑی کو انٹرپول کی مدد سے دبئی یا بیرون ملک سے پکڑنا پڑا۔ اسلام آباد میں اکثر چوری اور ڈکیتی کی وارداتیں کرنے والے راتوں رات دوسرے شہروں میں فرار ہو جاتے ہیں۔ ان جرائم کا بڑا سبب ذرائع آمدورفت کی ترقی ہے۔

ix۔ صنعت و حرفت میں ترقی:

دنیا نے صنعت و حرفت کی ترقی سے بے روزگاری ختم کی۔ ہمارے ہاں صنعت و حرفت کی ترقی نے گاؤں کو شہروں میں بدل دیا۔ دیہی لوگوں کے لیے ایسے ماحول میں رہنا اور دوسروں کا مقابلہ کرنا اتنا آسان نہیں رہا تو راتوں رات امیر بننے کے چکر نے انہیں جرائم میں ملوث کر دیا۔ مجرم لوگ دیہاتیوں کی سادہ لوحی سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ پھر دیکھنے میں یہ بھی آیا کہ یہی لوگ ان کے آلہ کار بن کر بڑے مجرم بن جاتے ہیں۔

x۔ مذہب سے دوری:

مذہبی اُصولوں سے دوری کے سبب بہت لوگ گناہوں (جرائم) کا مرتکب ہوتے ہیں۔ خوف خدا اور قانون کا ڈر جیسے تصور ماند پڑتے جا رہے ہیں۔ ذہن میں گناہ جیسا تصور انسان کو جرائم سے روکتا ہے۔ مذہب سے سختی پر عمل کرنے والے افراد کی اکثریت جرائم سے پاک ہوتی ہے ۔ مذہب سے دوری گناہ کو جنم دیتی ہے۔

xi۔ نفسیاتی اسباب:

جرائم میں انسان کی نفسیات کا بڑا عمل دخل ہے۔ بعض مجرم روپے پیسے اور لالچ کے بغیر صرف ذہنی نفسیات کی تسکین کے لیے کرتے ہیں۔ اس قسم کے جرائم میں آبروریزی، زنا، ایذارسانی، قتل، اغوا، دوسروں کو نیچا دکھانے کے حربے وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ بعض لوگوں میں بیماریاں بھی ہیں، جیسا کہ ذہنی اور دماغی بیماری اس کا محرک بنتی ہے۔ غصہ، حسد، نفرت، ڈر اسب سے بڑے اسباب ہیں۔

xii۔جسمانی نقائص کے اسباب (بدصورتی) :

جسمانی نقائص قدرت کی طرف سے ہوتے ہیں لیکن معاشرے میں ایسے افراد دوسروں کے مذاق اور طنز کا نشانہ بنتے ہیں۔ دوسرے لوگوں کے خلاف حسد، غصہ، نفرت اور دوسروں پر طنز کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ اپنے آپ میں موجود خامیوں کا بدلہ دوسروں سے لیتے ہیں۔ ایسے لوگ کئی جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں۔ دوسروں کی ایذارسانی جرائم کا سبب بنتی ہے۔

xiii۔انٹرنیٹ یوٹیوب، فیس بک:

انٹرنیٹ، یوٹیوب، فیس بک اوراس کی ویب سائٹس اچھائی اور جدید سہولیات کے ساتھ فحش مواد غیر قانونی مالیاتی دھندہ اور فیس بک شادیاں بھی جرائم کا سبب ہیں۔

xiv۔نظام عدل کی کمزوری:

ہمارے ملک میں عدلیہ اور پولیس کا سسٹم انتہائی کمزور ہے۔ عام آدمی کی رسائی یہاں تک نہیں ہے۔ پولیس اتنی بدعنوان ہے کہ مجرم کا ساتھ دیتی ہے اور عام آدمی کا تحفظ اس کا منشور ہرگز نہیں۔ عدلیہ عدل کے لیے ہوتی ہے ہمارے ملک میں انصاف بہت مہنگا ہے۔ کئی کئی سال کیسوں کے فیصلے نہیں ہوتے۔ غریب آدمی سے پولیس تعاون نہیں کرتی جبکہ کرپٹ لوگ بڑے وکیل کر کے جلد ضمانت کروالیتے ہیں۔

xv۔قوانین سے ناآشنائی:

جرمیات یا کرمنالوجی کے علماء نے جرائم کی تحقیق اور مطالعہ کے لیے جو اصول وضوابط مقرر کیے ہیں ان کے مطالعہ کی روشنی میں علیحدہ علیحدہ کلاسز بنائی گئی ہیں۔ وہ دو ہی ہیں لیکن مجرمین کی کئی اقسام بھی ہیں۔

الف۔ مجرموں کی پیشہ ورانہ زندگی ان کے سیاسی و مذہبی عقائد کا مطالعہ نیز نسل اور خاندان کے پس منظر کا جائزہ حالات اور ماحول کا مطالعہ کرنا۔

ب۔ چھپے مجرم، گرفتار مجرم، سزایافتہ مجرمین آئین کا مطالعہ شامل ہوتا ہے۔

مجرمین کی جو اقسام ہیں وہ درج ذیل ہیں:

xvi۔ خطاکاریاحادثاتی مجرم:

ان کو اتفاقی مجرم بھی کہا جاتا ہے۔ یہ مجرم قانون کے پابند ہوتے ہیں اور معاشرتی روایات و اصول کی پاسداری کرتے ہیں۔ معمولی غصہ یالاشعوری طور پر جرم کر بیٹھتے ہیں جبکہ جرم کی نوعیت معمولی ہوتی ہے سنگین نہیں ہوتی۔ یعنی کسی وجہ سے یا احساس برتری یا کمتری کی وجہ سے ٹریفک کے اُصولوں کو نظر انداز کرنا۔ یہ لوگ معمولی جرمانہ یا تنبیہہ سے ٹھیک ہو جاتے ہیں۔ لعنت ملامت سے کام چل جاتا ہے۔

xvii۔ معصوم مجرم:

یہ وہ مجرم ہوتے ہیں جن کو اپنے جرم تک کا پتہ نہیں ہوتا یا جیل میں پیدا ہوئے۔ بڑے لوگ ان مجرموں کو استعمال کرتے ہیں۔ جیسا کہ کسی کو یہ کہا کہ آپ کو جج پر بھیجتا ہوں ساتھ منشیات کا تھیلہ بھی دے دیا کہ وہاں میرا بیٹا وصول کر لے گا یا ماؤں کے ساتھ دودھ پیتے بچے شامل ہیں۔ یہ مجرم معصوم ہوتے ہیں ظاہر کسی اور کے جرم کی سزا کاٹ رہے ہوتے ہیں۔

xviii۔ عادی مجرم:

یہ وہ مجرم ہیں جو شوق سے جرم کرتے ہیں اور جیل کو اپنا گھر سمجھتے ہیں یا بعض اوقات ایسی بُری عادت میں مبتلا ہوتے ہیں کہ بار بار جیل جاتے ہیں۔ ان میں زانی طوائف، چور، مذہبی و جنسی جنون کا شکار مجرم، نشہ کرنے والے جن میں ہیروئن، شراب، چرس اور افیون سرِ فہرست ہیں۔

xix۔ پیشہ ور مجرم:

پشہ ور مجرم عام طور پر اکیلے کم لیکن گروہ کی صورت میں زیادہ جُرم کرتے ہیں۔ یہ لوگ بڑے شاطر ہوتے ہیں۔ ان کے پولیس، قانون نافذ کرنے والے اداروں سے تعلقات ہوتے ہیں۔ یہ لوگ، منشیات، شراب، ذخیرہ اندوزی، اغوا برائے تاوان، رنڈی خانے، جعلی کرنسی جیسے جرائم میں ملوث ہوتے ہیں۔ غنڈوں کو پالنا اور سرکاری اراضی پر قبضہ کرنا ان کا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ یہ لوگ معززین شہر بھی کہلاتے ہیں۔

xx۔ خطرناک مجرم:

ایسے لوگ جو اشتہاری ہوں آئے روز قتل، ڈکیتی، فائرنگ کرتے ہوں، خطرناک مجرم کہلاتے ہیں۔ بڑے بڑے لوگوں سے بھتہ وصول کرتے ہیں۔ پولیس خود ان سے خوف کھاتی ہے لیکن یہ لوگ اکثر پولیس مقابلوں میں مارے جاتے ہیں جیسے لدی گینگ، چھوٹو گینگ وغیرہ۔

xxi۔ نوجوان مجرم:

بعض ایسے مجرموں کی ماہرین نے نشاندہی کی ہے جو جوش جوانی میں جرم کرتے ہیں۔ ان میں اکثر کی داڑھی مونچھ ابھی نئی نئی آئی ہوتی ہے۔ یہ عام طور پر انتقام، غصّہ، ڈر کی وجہ سے جرم کرتے ہیں۔

xxii۔ کمسن مجرم:

نوعمری میں بچے کی تربیت انتہائی ضروری ہے۔ اگر اس کو نظر انداز کر دیا جائے تو وہ مختلف جرائم میں پھنس جاتے ہیں۔ ان میں بڑی وجوہات غربت، والدین کا بچوں کو نظر انداز کرنا، چوری، والد یا والدہ کا فوت ہو جانا، بُری صحبت، ماحول کی خرابی شامل ہوتے ہیں۔ یہ بچے گداگری، چوری، منشیات، جنسی جرائم یا بُرے مجرموں کے معاون ہوتے ہیں۔

xxiii۔ منظم گروہ کے مجرم:

یہ مجرم باقاعدہ گروہ بنالیتے ہیں پھر جرم کرتے ہیں۔ اکثر پکڑے بھی نہیں جاتے کیونکہ گروہ کے افراد کی ذہنیت ایک جیسی ہوتی ہے۔ یہ اکثر نسل در نسل ایسے ہی چلتے ہیں۔ مثلاً گروہ کا بڑا اگر مر گیا یا بوڑھا ہو گیا تو نیا جانشین پیدا ہو جاتا ہے اور وہ گروہ کو چلاتا ہے۔ ان کے جرم کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔ اکثر جرم کے طریقہ کار کا علم بڑوں کو ہوتا ہے۔ یہ گروہ منشیات، عصمت فروشی اور لینڈ مافیا پر مشتمل ہوتے ہیں۔

xxiv۔ سفید پوش مجرم:

سفید پوش مجرموں کی اکثریت کا تعلق اعلیٰ طبقہ سے ہوتا ہے۔ یہ مجرم حکومت کے بڑے بڑے ٹھیکوں میں مال بناتے ہیں، ناجائز راہ داریوں سے پیسہ کماتے ہیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ لوگ بیٹھے بیٹھے کروڑ پتی بن جاتے ہیں۔ ان میں اعلیٰ افسران، سیاستدان، بڑی تعمیراتی کمپنوں کے مالکان، اعلیٰ بنکار، ٹیکس چور شامل ہوتے ہیں۔

xxv۔ کالرز آف کرائمز:

i۔ وائٹ کالر کرائم:

وائٹ کالر کرائم کی اصطلاح کو سب سے پہلے ایڈورڈ سدر لینڈ نے ۱۹۳۹ء میں استعمال کیا۔ اس کو عدم تشدد کا جرم بھی کہا جاتا ہے۔ اکیلا یا گروہ کے ساتھ مل کر کاروبار یا گورنمنٹ کے پیسے سے مال بنانا، بد عنوانی کرنا،

فراڈ، رشوت ستانی، لاٹری سکیمیں، غبن، منی لانڈرنگ، سائبر کرائم، لینڈ مافیا وغیرہ۔ اس کو کارپوریٹ کرائم بھی کہا جاتا ہے۔ اس کے لیے خواجہ میر درد کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

تر دامنی پہ شیخ ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں[۲۵]

ii۔ بلیو کالر کرائم:

وہ تمام کردار جو وائٹ کالر میں معاونت کرتے ہیں۔ وائٹ کالر کرائم کرنے والوں کے کارندے شامل ہوتے ہیں مثلاً بینک کے ملازم وہ ملازم جن کے نام پر کاروبار یا شیئرز خریدے جاتے ہیں۔ پاکستان میں بڑے بڑے مجرمین ملازموں کے اکاونٹ میں کروڑوں روپے ملے ہیں انہیں لوگوں کو بلیو کالر کرائم کے کارندے کہا جاتا ہے۔ منشیات، آبروریزی، ڈاکے بھی اس میں شامل ہیں۔

iii۔ سٹیٹ کالر کرائم:

سرکاری املاک پر قبضہ کرنے والوں کو اس صف میں شامل کیا جاتا ہے جو کہ سرکاری اور کارپوریشنز کے اہلکار مل کر کرتے ہیں۔ اسلام آباد میں سی ڈی اے سمیت ہر سوسائٹی میں ناجائز الاٹ منٹ اپنوں کو نوازنا اس میں شامل ہوتا ہے۔ امریکی ماہرین مچل وسکی اور کریم نے اس نظریے کو ۱۹۹۰ء میں دوبارہ پیش کیا۔

iv۔ ریڈ کالر کرائم:

جرم میں تشدد، قتل وغارت، خودکشی، دھمکیاں وغیرہ شامل ہوں تو اسے ریڈ کالر کرائم کہا جاتا ہے۔

v۔ بلیک کالر کرائم:

اس کرائم میں دوسروں کے مذہبی معاملات میں مداخلت اور توہین وغیرہ شامل ہوتے ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں تکفیری عمل ہے۔ پھر اس کا ردعمل یورپ میں مسلمانوں کے مذہبی جذبات کی توہین بھی ان جرائم کا حصہ ہے۔

vi۔ گرین کالر کرائم:

عام طور پر گرین کالر کرائم اسے کہا جاتا ہے جس میں ماحولیاتی آلودگی اور وائلڈ لائف یعنی جنگلی حیات کو نقصان پہنچانے جیسے جرائم شامل ہوتے ہیں۔ اینٹوں والے بھٹے، فیکٹریوں کا فضلہ اور دھواں اس میں شامل ہوتے ہیں۔ پنجاب میں لوگوں نے چاول کی فصل کی باقیات کو اتنا جلایا کہ لاہور دنیا کا آلودہ ترین شہر بن گیا۔

vii۔ گولڈ کالر کرائم:

مذہب، رنگ یا قومی اعتبار سے کسی قوم یا کمیونٹی کا قتل عام گولڈ کالر کرائم کہلاتا ہے۔ مثلاً فلسطین، کشمیر، میانمار میں مسلمانوں کا قتل عام اس میں شامل ہے۔ ماہرین جرمیات کے نزدیک یہ ایک قسم کی شدید مذہبی دہشت گردی ہے۔

ج۔ معاشرتی اقدار اور جرائم:

i۔ معاشرہ اور جرائم :

انسانی تاریخ گواہ ہے کہ آج تک کسی عہد میں بھی معاشرے کو جرائم پیشہ افراد سے مکمل طور پر پاک نہیں رکھا جا سکا۔ وقتی طور پر مجرمانہ سرگرمیوں پر کسی حد تک کنٹرول ضرور ہوتا ہے۔ لیکن قانون کی گرفت ڈھیلی پڑتے ہی جرائم پیشہ افراد سر اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ پہلے ادوار میں آبادی بہت کم تھی، پیداواری مسائل ضرورت سے زیادہ تھے۔ زندگی بڑی سادہ تھی اور عام سے پیشے ہوتے تھے۔ مثلاً کاشت کار، لوہار، بڑھئی، حلوائی، پرچون کی دکان، حکیم، جراح، قصائی، مؤذن، کھیل تماشے اور جھاڑ پھونک والے، بہت کم ناچ گانے والی عورتیں، معاشرتی سرگرمیوں کا تعلق انہیں پر مشتمل ہوتا تھا۔ مجرمانہ سرگرمیوں کا تعلق بھی معاشرتی حالات پر منحصر ہوتا تھا۔ کبھی کبھار مار پیٹ، برسوں بعد ایک ادھ چوری، ٹھگی یا فریب دہی کی واردات ہوتی تھی۔ جرم کو مستقل اپنانے والا گروہ موجود نہیں تھا۔ پیداواری وسائل بڑھنے سے چوری اور راہزنی میں اضافہ ہوا۔ زرعی معیشت میں انقلاب کے ساتھ ساتھ مجرمانہ سرگرمیوں میں نمایاں طور پر اضافہ ہوا۔ دیہات سے لوگوں نے معاش کی خاطر شہر کا رخ کیا۔ شہری زندگی اور مجرمانہ سرگرمیوں کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ شروع میں چھوٹی چھوٹی چوریاں ہوئی ہوں ہوگی۔ اس سے ان چوروں کے حوصلے بلند ہوئے، شہر کی زندگی میں مجرمانہ سرگرمیاں تیزی سے ترقی کرتی ہیں۔ اس لیے جرائم پیشہ افراد کو شہر کی زندگی راس آگئی۔ آج بھی دیہات کے مقابلے میں شہر اور بالخصوص بڑے شہر جرائم پیشہ لوگوں کے گڑھ بنے ہوئے ہیں۔

ii۔ جرمیات اور فوجداری قانون:

ہر معاشرے میں جرائم کی روک تھام کے لیے قانون بنائے جاتے ہیں۔ اگر کسی معاشرے میں قانون نہ ہو تو روایات کی صورت میں قانون موجود ہوتا ہے۔ ہمارے قانون میں بھی فوجداری قانون ایک مکمل ضابطہ ہے جو جرائم کے متعلق ہے جو ملکی سطح پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر انداز ہوتے ہیں۔ مثلاً قتل، غارتگری، چوری، ڈکیتی، اغوا، دھوکہ دہی وغیرہ۔ کیونکہ ہر قسم کے جرائم کے متعلق قانون ضابطہ فوجداری میں آتا ہے۔ اسلام میں بھی سزاؤں کو قانون کے ساتھ جوڑا گیا ہے۔ ہندوستان میں فوجداری قوانین کا اجراء انگریزوں نے آتے ہی کر دیا تھا اور پھر اس میں وقت کے ساتھ ساتھ ترامیم بھی کرتے رہے۔ عام طور پر یہ دیکھا گیا کہ جو جرائم بڑھتے گئے ان کے بارے میں انگریز کا قانون سخت ہوتا گیا۔ پولیس ایکٹ ۱۸۶۱ء میں تمام فوجداری قوانین کا احاطہ کیا گیا ہے۔

iii۔ اسلام اور فوجداری قانون:

اسلام ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں سزاؤں اور حدود کا تعین کیا گیا ہے۔ مثلاً حد قصاص اور تعزیر۔ ”حد کی تعریف یہ ہے کہ وہ جرائم جن کی سزا اللہ سبحانہ وتعالیٰ یا شارع علیہ السلام نے خود مقرر کر دی ہے وہ حد کی ذیل میں آتے ہیں۔ مثلاً ۱۔ زنا ۲۔ قذف ۳۔ ڈاکہ ۴۔ خمر ۵۔ خون ریزی غارت گری ۶۔ غداری ۷۔ ارتداد۔

قصاص اور دیت میں آنے والے جرائم پانچ ہیں:
۱۔ قتل بالارادہ ۲۔ قتل شبہ عمد ۳۔ قتل خطا ۴۔ جارحیت بالا ارادہ ماسوائے قتل ۵۔ جارحیت بلاارادہ ماسوائے قتل۔[۲۶]

iv۔ جرم اور معاشرتی اقدار:

جرم کو کنٹرول کرنے کے لیے معاشرتی اور ثقافتی اقدار کی بڑی اہمیت ہے۔ جب تک کوئی معاشرہ عملی طور پر برائی کے خلاف ردِ عمل یا ایکشن نہیں دکھائے گا اس وقت تک جرائم کو قابو نہیں کیا جا سکتا۔ کوئی بھی معاشرہ برائی سے پاک ہونے کا دعوی نہیں کر سکتا۔ اس وقت تک برائی کی جڑیں مضبوط رہیں گی جب تک معاشرے کی جانب سے سخت رد عمل نہیں آجاتا۔ قصور میں مشہور زینب زیادتی و قتل کیس میں مجرم ۱۳ وارداتوں کے بعد پکڑا گیا تو وہ معاشرتی ردِ عمل کا ہی نتیجہ تھا۔ ورنہ اس سے پہلے بھی بارہ معصوم بچیاں اس درندے کی ہوس کا نشانہ بن کر قتل ہو چکی تھیں۔ وہی معاشرہ دنیا میں کامیاب ہوتا ہے جس میں لوگ بُرائی کے

خلاف اُٹھ کھڑے ہوں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے سے بے روزگاری کا خاتمہ ہو، نوجوانوں کی تربیت ہو، معاشرتی رویوں کا جاگنا ضروری ہوتا ہے۔ کیونکہ بہت سے جرائم معاشرے کی آنکھوں کے سامنے ہوتے ہیں لیکن عوام پولیس کے ناقص رویے سے کسی قسم کا ردِ عمل دینے سے گریز کرتی ہے۔ یہ بالکل حقیقت ہے جس طرح بلی کبوتر کو دیکھ کر آنکھیں بند کرلے۔ روزانہ ہم یہ دیکھتے ہیں کہ راہ چلتی لڑکی کو دیکھ کر اوباش نوجوانوں کا فقرے بازی کرنا یا پبلک مقامات جیسے پارک وغیرہ میں لڑکیوں سے دست درازی کرنا، حال ہی میں ۱۴ اگست ۲۰۲۱ء کو لاہور کے گریٹر اقبال پارک میں ٹک ٹاکر لڑکی سے دست درازی ہوئی۔ معاشرتی ردِ عمل آنے پر پولیس حرکت میں آئی۔ دکانداروں کو ہم سرعام ملاوٹ کرتے دیکھتے ہیں، تول پورا نہیں ہوتا، دونمبر چیزوں سے بازار بھرے پڑے ہیں۔ یہ سب غیر قانونی اور غیر اخلاقی چیزیں ہیں اور یہ جرائم ہیں۔ معاشرہ ان کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ اسی طرح بینک ڈکیتیاں ہوتی ہیں۔ پولیس خاموش تماشائی کھڑی رہتی ہے۔ پٹرول کم دینا، سرِعام رشوت لینا چوری چکاری، دنگا فساد۔ عوام ان جرائم سے نفرت کرتے ہیں۔ اگر معاشرہ اس کے خلاف سخت ردِ عمل دے تو مجرمانہ سرگرمیوں اور رویوں میں خاطر خواہ کمی لائی جاسکتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ تعلیم یافتہ ہو اور ایسے مجرمانہ رویے کی حوصلہ شکنی کرے جو اس کی ترقی میں رکاوٹ ہو۔ ناول نگار کا مقصد بھی یہی ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت کئی جہات کو سوچ کر کبھی ایک یا کبھی زیادہ جہتوں پر لکھتا ہے۔ اس کا مقصد معاشرے کی ناہمواری کو ختم کرنا ہوتا ہے۔ لوگوں کے ذہنوں کی آبیاری کرنی ہوتی ہے تاکہ وہ ذہن بنجر نہ ہوں۔

د۔ جرمیات اور دیگر انظباطات:

اکثر ممالک میں یونیورسٹیوں میں جرمیات کے شعبے کو قانون کے شعبے سے جوڑا گیا ہے۔ اسلام میں بھی جرمیات کو قانون سے منسلک کیا گیا ہے۔ دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیاں امریکہ کی شکاگو یونیورسٹی، برطانیہ کی کیمبرج یونیورسٹی میں شعبہ جرمیات قانون کے شعبہ کے ساتھ منسلک ہے۔ باقی کئی ممالک مثلاً کینیڈا میں شعبہ نفسیات کے ساتھ اس کو جوڑا گیا ہے۔ جاپان میں شعبہ عمرانیات کا ساتھ اس کا انضباط ہے۔ بعض ممالک میں طبی، نفسی، عمرانیات، معاشرتی انتظام مثلاً سوشل سائنسز اور نفسیاتی تجزیاتی مطالعے کے شعبے کے ساتھ منسلک ہے۔ لیکن اب دنیا میں ہر شعبہ علوم نے ترقی کر لی ہے۔ آج کل امریکہ سمیت کئی ممالک جن میں ہمارا ملک

پاکستان بھی ہے، جرمیات کو شعبہ عمرانیات کے ساتھ منسلک کیا ہے لیکن دیگر علوم کے ساتھ بھی اس کا گہرا تعلق ہے۔ جو درج ذیل ہے۔

i۔ جرمیات اور اخلاقیات:

اخلاقیات ایک ایسا علم ہے جس میں انسان کے کردار کے بارے میں خیر اور شر کے نقطۂ نظر سے بحث کی جاتی ہے۔ اسلام میں اخلاقیات کا ایک باقاعدہ نظام ہے۔ بلند اخلاق والے ہی دنیا وآخرت میں کامیاب ہیں۔ دنیا میں اخلاق سے بڑی کوئی تعلیم نہیں۔ یہ ایک ایسی سائنس ہے جو انسان کو معاشرے میں جینے کا گر سکھاتی ہے۔ اس کو اپنا کر ہی انسان کامیاب ہو سکتا ہے۔ اگر کوئی انسان کتنا ہی علم اور دولت رکھتا ہو لیکن اخلاقیات کا پاس نہ کرتا ہو تو معاشرہ اور قانون اس سے رعایت نہیں برتتے۔ علم الاخلاق کی ہی بدولت معاشرے کے معیار مقرر کیے جاتے ہیں۔ ان سے انحراف کو جرم وسزا کا نام دیا جاتا ہے۔ اسلام میں جرم سے نجات کا نظریہ اخلاقیات ہے لہٰذا اخلاقیات اور جرمیات کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ii۔ جرم اور نفسیات:

جرم اور نفسیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ نفسیات کے علم نے ہر علم کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ تعلیمی نفسیات، طبی نفسیات، معاشی نفسیات، سیاسی نفسیات وغیرہ انسانی جسم میں ہونے والی ٹوٹ پھوٹ جس میں غصہ، ڈر، لالچ، ہوس، تجسس، تفکر، ہیجان، ادراک شامل ہوتے ہیں۔ ان کا مطالعہ نفسیات کرتی ہے۔ اسی لیے بعض ممالک مثلاً کینیڈا وغیرہ میں جرمیات کو نفسیات کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ جرمیات میں نفسیات نے بڑے اہم کام کیے ہیں۔ انسانی رویوں پر بحث خواہ وہ مجرمانہ ذہنیت کے زیر اثر ہوں، بعض امراض مثلاً جنون، خبط، مراق، ضبط عظمت، منشیات، مافیائے سرقہ وغیرہ کو سدھارنے میں نفسیات کا اہم کردار ہے۔ بار بار ایک ہی کام کے جرم کا ارتکاب کرنے والوں کی اصلاح ایک ماہر نفسیات ہی کرتا ہے۔ جرمیات اور نفسیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ نفسیات میں جرائم کو کم کرنے میں بڑی مدد دی ہے۔

iii۔ جرمیات اور بشریات:

جرمیات اور بشریات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ بشریات چونکہ انسان کے افعال و کردار کی سائنس ہوتی ہے۔ اس میں روایات، اخلاقیات، عقائد کی خلاف ورزی کو جرم سمجھا جاتا ہے۔ اس لیے بشریات کا جرمیات سے تعلق ہے۔

iv۔ جرمیات اور حیاتیات:

یہ وہ سوال ہے جس کے جواب میں ہر کوئی یہ کہتا ہے کہ اس کے جینز میں جرم شامل ہے یعنی لونیات جس میں (ڈاؤن سینڈروم) کا بڑا کردار ہے۔ مختلف عوارض کا باعث بنتا ہے۔ مثلاً جنون، خبطِ جنون، مالیخولیا وغیرہ لومبر وسو اور شیلڈن جیسے ماہرین جرمیات اس نظریے کے بانیوں میں سے ہیں۔ ان لوگوں نے جرمیات میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا ہے۔ لیکن بعد میں آنے والے ماہرین جن میں ہیلے اور برونر (Hely & Broner) نے واضح کیا کہ جسمانی ساخت کے اعتبار سے جرم کے ساتھ اس کا کوئی تعلق نہیں بنتا بلکہ یہ حالات و واقعات پر منحصر ہوتا ہے۔

v۔ جرمیات اور نسلیات:

پولیس ڈیپارٹمنٹ کے پاس ہر ضلع کا ریکارڈ ہوتا ہے جس میں آپ کو آسانی سے بعض خاندان یا گاؤں یا علاقہ کے افراد کی فہرست مل جائے گی جس میں آپ آسانی سے امتیاز کر سکتے ہیں کہ یہ علاقہ سرقہ مویشیاں، رسہ گیری اور ڈکیتی کے لیے مشہور ہوتے ہیں۔ بعض علاقوں میں زنا، عصمت فروشی، بعض علاقے جیسے ہمارے قبائلی علاقوں میں چرس، افیون، اغوا برائے تاوان، جعلی کرنسی، چوری کی گاڑیوں کے پرزہ جات عام مل جائیں گے۔ نسلیاتی مطالعہ سے ہمیں جرائم کی تحقیق میں بڑی مدد ملتی ہے۔

vi۔ جرمیات اور معاشیات:

انسان اور معاشرے کا تعلق زندگی اور موت سے مشابہ ہے۔ غربت انسان کو مجرم بنا دیتی ہے۔ دنیا میں زیادہ تر جنگوں کا دارومدار صرف معاشی ہی رہا ہے کیونکہ وعظ و نصیحت سے پیٹ نہیں بھر سکتا۔ آخر اسے روٹی کی ضرورت رہے گی۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے علاوہ انسان نے اپنی ضروریات کو لامحدود کر لیا ہے جس میں گاڑی، کوٹھی، دولت کی بے جا نمائش نے انسان کو گھٹیا سے گھٹیا جرائم کرنے پر مجبور کر دیا ہے۔ صنعتی انقلاب نے اس میں آجر اور آجیر کا نیا مسئلہ کھڑا کر دیا ہے۔ ایک مزدور صبح سے لے کر شام تک کام کرتا ہے۔ فیکٹری مالک ایک سے دو پھر تیسری فیکٹری لگا لیتا ہے جب کہ مزدور صرف اچھی دہاڑی کی خاطر صرف فیکٹریاں ہی بدلتا ہے۔ المختصر جرمیات اور معاشیات کا آپس میں گہرا تعلق بنتا ہے۔ زیادہ معاشرے میں جرائم صرف معاش کی بنیاد پر ہوتے ہیں۔ ایک چور، فراڈ کرنے والا، جوا کھیلنے والا دوسروں کا حق کھانے والا، اغوا کار، منشیات کا دھندہ کرنے والا ان کے جرائم کے پیچھے صرف معاش ہوتا ہے۔

vii۔ جرمیات اور سائنس:

جرمیات اور سائنس کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ جوں جوں سائنس نے ترقی کی ہے جرائم نے بھی ان سائنسی ایجادات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے جرائم میں اس سے بھرپور استفادہ حاصل کیا ہے۔ پہلے پہل ڈنڈے اور چھرے سے واردات کی جاتی تھی۔ لیکن پستول اور جدید اسلحے نے جرائم کی دوڑ میں بے پناہ اضافہ کیا ہے۔ ذرائع آمدورفت کی ترقی نے بھی جرائم کی رفتار کو بڑھایا ہے۔ لیکن جرائم کی روک تھام کے لیے سائنس کا بڑا کردار ہے۔ آج کے دور میں ڈی این اے، جیوفنسنگ، فنگرپرنٹس، ٹاکسی کالوجی، بیالوجی اور کیمسٹری کی مدد سے مجرم تک آسانی سے پہنچا جاسکتا ہے۔ Fire Arms & Tool Marks (FTM) کی مدد سے ہم اسلحے کی جانچ اور استعمال ہونے والی بندوق یا پستول کی نشاندہی کرسکتے ہیں۔ دنیا کا پہلا فرانزک سورۃ یوسف کی آیت نمبر ۲۵، ۲۶ اور ۲۷ میں ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ آخرکار یوسفؑ اور عزیز مصر کی بیوی آگے اور پیچھے دروازے کی طرف بھاگے۔ عزیز مصر کی بیوی نے پیچھے سے یوسفؑ کی قمیص کو کھینچ کر پھاڑ دیا تو ایک منصف نے فیصلہ کرتے ہوئے کہا کہ قمیص چوں کہ پیچھے سے پھٹی ہے اس لیے عورت قصوروار ہے۔ یہ دنیا کا پہلا فرانزک تھا۔

viii۔ ڈی این اے –DNA:

Deoxiyribonucleic Acid ہے جسے ایک سوئس سکالر (۱۸۴۴ء – ۱۸۹۵ء)، (Johann Friedrich Miescher) نے ۱۸۶۹ء میں دریافت کیا۔ جوئس لائن ای کرب کے مطابق:

> “The hereditary basic of every living organism is its genome, the complete sequence of deoxyribonucleic Acid (DNA) the provides the full set of hereditary information curried by the organism’s cells”. (27)

پھر آہستہ آہستہ آنے والے ماہرین نے اس میں جدت پیدا کی۔ آج انسانی جسم کے بالوں، خون، ناخن، جلد، ہڈیوں سے بآسانی ڈی این اے لے سکتے ہیں۔ جرائم میں بھی ہمیں اچھی خاصی مدد ملتی ہے اور آج سائنس نے ۶۴ سال پرانے قتل کے مجرموں کی نشاندہی کی ہے جیسے میری سلون کا کیس ۔

ix۔جیو فنسنگ:

جیو فنسنگ ایک ایسا طریقہ ہے جس میں ہم جی پی ایس یعنی گلوبل پوزیشننگ سسٹم کے ذریعے وقوعہ کی جگہ کی نشان دہی ٹھیک طریقے سے ہوتی ہے اور اس جگہ اس وقت ان نمبروں کی آپس میں بات ہوتی تھی۔ جرائم پر قابو پانے کے لیے اس کا بڑا کردار ہے۔ جیو فنسنگ ایسا طریقہ ہے جس میں جائے وقوعہ پر استعمال ہونے والے موبائل فون کے جی ایس پی معلوم کر کے ملزمان تک رسائی آسانی سے ممکن ہوتی ہے۔

x۔فنگر پرنٹس:

ڈاکٹر میکس ہاکس کے مطابق فنگر پرنٹ کی تعریف یوں ہے:

> "The patterns of Raised skin found on the fingers of every individual are known as finger prints."(28)

فنگر پرنٹ یا ہاتھوں کے نشانات جس کی تین بڑی اقسام محرابی، پھندا اور بھنور قسم کے نشانات سے مجرم پکڑنے میں آسانی ہوتی ہے۔ سائنس کی ترقی سے پیچیدہ مسائل کا حل آسانی سے ممکن ہے۔ اس کو سائنس کی زبان میں LFP کہتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ سائنس اور جرمیات کا آپس میں گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعے جرائم کو آسانی سے پکڑا جا سکتا ہے۔

xi۔ٹاکسی کالوجی:

Mathiew Orfila(۱۷۸۷ء-۱۸۵۳ء) ٹاکسی کالوجی کے باپ ہیں۔ اس کے معنی زہریلا کے ہیں۔ اگر کوئی مجرم زہر کا استعمال کر کے دوسرے شخص کا قتل یا اسے بے ہوش کرتا ہے تو اس علم کے ذریعے استعمال ہونے والا زہر اور اس زہر کی کوالٹی کو با آسانی ہم جانچ کر سکتے ہیں۔ اس سائنسی علم کو ہم لیبارٹری میں ٹاکسی کالوجی کہتے ہیں۔ ٹاکسی ذہنی مریضوں کی دوائیوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔

xii۔FTM(Fire Arms of Tool Marks)اسلحے کی جانچ پڑتال:

ڈاکٹر میکس ہاکس کے مطابق اسلحے کی جانچ تعریف اس طرح کی گئی ہے:

> "Ballistics is the study of the motion of projectiles. Fiream investigation is a subfield of ballistics that focuses on firearms, handheld

weapons that expel a projectiles via an explosive material, such as gun powder. Firearm investigation tries to determine the eircumstances surrounding a crime involving a firearm, including the type of firearm used to commit the crime what specific gun a bullet multiple bullets came from and where a shooter was positioned when the bullet were fired. To do this or investigators exmine bullet charateristics, gun barrel charateristics and bullet trajectory".[29]

FTM کے ذریعے اس بات کا پتہ چل جاتا ہے کہ واردات میں استعمال ہونے والا اسلحہ کون سا تھا اور کس کس وقت اس کا استعمال ہوا تھا۔ سائنس نے آج اس کام کو بھی سہل بنا دیا ہے۔ اس لیے سائنس اور جرمیات کا آپس میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔

ر۔ اردو ناول میں جرمیات کی روایت:

ناول نے قوموں کی زندگی میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ جب سے ناول وجود میں آیا ہے اس نے جرمیات کی عکاسی بڑے اچھے انداز سے کی ہے۔ اگر ہم مغربی ناول کو دیکھیں تو (Harriet Beechr Stowe-)[۵۷] کا ناول "Uncle Toms Cabin" میں آیا اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی ساڑھے تین لاکھ کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اس میں ایک غلام خاندان پر مجرمانہ سلوک کی کہانی تھی اور اس بات پر زور زور دیا گیا تھا کہ گورے امریکی انسان نہیں مجرمانہ درندے ہیں۔ اس غلام خاندان کی دردناک کہانی کو پڑھ کر ہر پڑھا لکھا امریکی غلامی کے خلاف آواز اٹھانے لگا اور جلد ہی امریکہ دو دھڑوں میں تقسیم ہو گیا اور ان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ ساڑھے چھ لاکھ انسان مارے گئے۔ آخرکار غلامی کے مخالف حامیوں سے جیت گئے۔ ناول انکل ٹامز کیبن نے امریکی معاشرے میں ایک شعور کا کردار ادا کیا۔ اس وقت کے امریکی صدر ابراہیم لنکن (۱۸۰۹ء-۱۸۶۵ء) جب ہیرٹ بیچر سٹو سے ملے تو انھوں نے پہلی بات یہ کہی (اچھا تو تم ہی وہ عورت ہو جس نے یہ جنگ شروع کروائی تھی ؟) ماریو پوزو کا[۳۱] (The God Father) جس میں اٹلی کے جزیرے

سسلین مافیا کا ذکر بڑی خوبی سے کیا گیا ہے اس کے بعد اٹلی کی حکومت نے کسی پریشر کے بغیر ملک میں موجود ان تمام کرداروں پر فوج کشی کی کیونکہ یہ لوگ افسروں اور ججز کو قتل کرانے جیسے جرائم میں بھی ملوث تھے۔

زندگی کا کوئی شعبہ بھی ان کے شر سے محفوظ نہیں تھا۔ جرائم پیشہ لوگوں کا نیٹ ورک اتنا مضبوط ہوتا ہے کہ ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد ان کے لیے کام کرتے ہیں۔ مثلاً ٹرانسپورٹر، طلبہ، اساتذہ، وکلا، تاجر، سیاستدان، پولیس، فوجی اہلکار، صحافی، اعلیٰ افسران، سب ان کی بات مانتے ہیں اور اگر کوئی نہیں مانتا تو اس کی سزا موت ہوتی ہے۔ ڈان ونسلو کا ۲۰۰۵ء میں ۵۳۹ صفحے کا ناول جس نے بڑی شہرت پائی (The Power of the Dog)[۳۷] میں ایسی کہانی بیان کی گئی جس میں امریکہ میں (Wor on Drugs) کے ابتدائی تیس (۳۰) سالوں کو فکشن کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول کی یہ خوبی ہے کہ اس میں فکشن کے پردے میں حقیقت بیان کی گئی ہے کہ کس طرح امریکی ادارے ڈرگ انفورسمنٹ ایڈمنسٹریشن، سی آئی اے یا ایف بی آئی اور امریکی سیاست دانوں کے کالے کرتوت بڑی خوبصورتی سے بیان کئے گئے ہیں۔ اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کس کس طریقے سے منشیات فروشوں کی مدد کرتے ہیں جیمز رائے کا (L.A. Confidencial-) پڑھنے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے کس خوبی کے ساتھ جرائم کے سربراہوں کا ذکر کیا ہے۔ ۴۹۶ صفحے کا یہ ناول لاس اینجلس پولیس کے آفیسر کس طرح منشیات اور عصمت فروشی جیسے جرائم کی پیدائش میں صرف روپے کی خاطر ان کی مدد کر رہے ہوتے ہیں۔ "Dongri to Dubai" انڈین صحافی حسن زیدی نے بڑی عمدگی سے ساٹھ سالہ جرائم کی تاریخ بیان کی ہے جس میں بمبئی کے اسمگلر اور منشیات فروش کن کن طریقوں سے جرائم کرتے ہیں اور وہ وہ معززین شہر بھی ہیں یعنی وائٹ کالر کرائم کے ماہر بھی ہیں۔ ایس کے گھوش کی کتاب "The Indian Mafia" جس میں بمبئی شہر کے مافیا کا ذکر ہے جس میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۸۰ء تک بھارت کے معاشی اور بڑے شہر ممبئی میں ان مافیاز نے ہر قسم کے جرائم کی پرورش کی۔ اس میں ڈکیتی، اسمگلنگ، اغوا برائے تاوان، قتل، رشوت ستانی، ان کے ساتھ، روسی، افریقی، سری لنکن اور اسرائیلی مافیاز کا اشتراک بھی تھا۔ ان میں حاجی مستان، کریم اللہ، حیدر مرزا اہم کردار تھے۔ کراچی سی ٹی ڈی کے سربراہ عمر شاہد نے اپنے دو انگریزی ناولوں The Prisoner اور The Party worker جس میں کراچی کے گزشتہ چار دہائیوں میں یہ شہر کس طرح ان جرائم پیشہ افراد کے قبضے میں رہا اور اب بھی ہے۔ اجمل پہاڑی اور عزیز بلوچ کس طرح اپنے اپنے علاقے میں پولیس پر اثر انداز ہوتے تھے ان ناولوں میں بیوروکریٹس، پولیس آفیسر اور سماجی شخصیات کے چہرے بے نقاب ہوئے ہیں۔ جس میں ایک ٹارگٹ کلر صرف دو سو روپے دیہاڑی

پر آدمیوں کو قتل جیسے جرائم کرتا ہے۔ جنرل ضیاء الحق (۱۹۷۷ء تا۱۹۸۸ء) کے دور میں قائم ہونے والی ایک سیاسی جماعت دشمن ملک سے پیسہ لے کر شہر میں ہر قسم کے جرائم کراتی ہے۔ ناول نگار نے معاشرے کی سچی تصویر پیش کی ہے جو کہ حقیقت ہے۔ اگر ہم اُردو ناول کی تاریخ دیکھیں تو اُردو کے پہلے ناول مراۃ العروس کے آٹھویں باب میں جرائم پیشہ کردار کی عکاسی ڈپٹی نذیر احمد (۱۸۳۰ء-۱۹۱۰ء) نے بڑے عمدہ انداز میں کی ہے، جس میں ایک (چوری کرنے والی چالاک عورت) کا کٹنی کا کردار ہے جو اکبری کو بے وقوف بنا کر سارا زیور دلوانے کے بہانے لے کر رفو چکر ہو جاتی ہے۔ ماما عظمت کا کردار ایک جرائم پیشہ عورت کا کردار ہے جس میں وہ عورت گھر میں روپے پیسے کے معاملے میں ہیرا پھیری کرتی ہے۔ مثلاً پیسے کے دس پان آتے ہیں اور ماما عظمت صرف دو لے کر آتی تھی۔ ماما عظمت کھلے منہ کہتی تھی کہ میں گھر نیلام کر کے نکلوں گی۔ اینٹ سے اینٹ بجا کر جاؤں گی۔ پہلے یہ محمد کامل اور اصغری کے درمیان اختلافات کو ہوا دیتی ہے۔ پھر پورے گھر میں ایک کو دوسرے سے بد ظن کر دیتی ہے۔ گھر جنگل کا ماحول پیش کرتا ہے۔ مرزا ہادی رسوا کے ناول امراؤ جان ادا میں ایک مجرمانہ کردار دلاور خان کا ہے جو امراء کو اغوا کرتا ہے پھر بیل گاڑی پر بٹھا کر اپنے رشتہ دار پیر بخش سے مل کر اسے لکھنؤ کے بازار حُسن میں خانم کے کوٹھے پر جا کر سوا سو (۱۲۵) روپے میں فروخت کرتا ہے۔ پیر بخش ۵۰ روپے اور ۷۵ روپے دلاور خان لے لیتا ہے۔ ایک ڈبل شاہ کا کردار ہے جو زیور لے کر کٹورے میں ڈالتا ہے اور کہتا ہے کل کھولنا دو ہو جائیں گے لیکن اتنی دیر میں وہ غائب ہو جاتا تھا۔ فیض علی جیسے لوٹیروں کا کردار بھی اس کا حصہ ہے۔ رسوا نے اس وقت کے معاشی اور اخلاقی جرائم کا ذکر اپنے ناول میں نہایت ہنر مندی سے پیش کیا ہے۔

فردوس بریں میں عبدالحلیم شرر (۱۸۶۰ء-۱۹۲۶ء) کے شیخ وجودی جیسے مجرمانہ کردار اور اس کے قتل جیسے جرائم کو ناول کا مضبوط کردار بنایا ہے جس میں حسین کو کاظم جنونی جنت میں لے جانے اور جنتی حوروں کے بارے میں بتاتا ہے جیسے ہمارے ملک میں دہشت گرد جنت کا ٹکٹ دے کر خودکش حملوں کے لیے اکساتے تھے اور معاشرے میں دہشت و خوف کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ شیخ جودی اسے وقت کے امام مسلم نصر بن احمد کی جان لینے کے لئے دمشق بھیجتا ہے۔ وہ مسجد میں داخل ہو کر آدھی رات کو قتل جیسا جرم سرانجام دیتا ہے اور آلہ قتل اور اپنے کپڑے نہر کے کنارے دھوتا ہے۔ شیخ وجودی حسین کے چہرے کے داغ کو جو کہ بچپن میں لگا تھا گرنے کی وجہ سے یہ کہتا ہے کہ رات کو حور نے بوسہ لیا تھا۔ پھر پتہ چلنے پر حسین علی وجودی کو قتل کرتا ہے اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس نے برائی کی جڑ کو ختم کر دیا ہے۔ شیخ علی وجودی جیسے جرائم پیشہ کردار ہماری تاریخ کا سیاہ کردار ہیں۔ ناول ملک العزیز ورجینا ملت اسلامیہ کی حمیت کو جوش میں لاتا ہے لیکن کچھ مجرمانہ تاریخی کردار بھی

شامل ہیں۔ "فسانہ آزاد" میں پنڈت رتن ناتھ سرشار نے خوجی کے کردار کی صورت میں ایک معاشرتی خطاکار کو ملکے شیطان کے روپ میں پیش کیا ہے۔ علامہ راشد الخیری (۱۸۶۸ء-۱۹۳۶ء) کا ناول "شام زندگی" بھی ایک اہم ناول ہے اسی ناول کی وجہ سے انہیں مصور غم بھی کہا جاتا ہے۔ ان کو اردو کا پہلا افسانہ نگار ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ انہوں نے ناول میں جرائم کا اسباب بننے والے کرداروں کو زیر بحث لاتے ہوئے جرائم کو غم کا سبب قرار دیا ہے۔ منشی پریم چند (۱۸۸۰ء-۱۹۳۶ء) اردو کے اہم ناول اور افسانہ نگار ہیں انھوں نے ۱۹۰۱ء سے لے کر ۱۹۳۶ء تک یعنی اپنی وفات تک اردو کو بہترین ناول دیے جن میں "بازار حُسن"، "چوگان ہستی"، "نرملا"، "گئو دان"، "میدان عمل" اور "بیوہ" شامل ہیں۔ ان کا پہلا ناول "اسرار معابد" ہندوستان میں اَن پڑھ مذہبی پیشواؤں، جعلی قسم کے مذہبی رہنماؤں کے جرائم کا ذکر بڑی سچائی سے پیش کیا ہے۔ مذہب کی آڑ میں یہ جرائم پیشہ لوگ معاشرتی ناہمواری کا باعث بنتے ہیں۔ "گئو دان" میں جاگیرداروں کا غریب کسانوں پر مظالم اور ان کی لاقانونیت کو عمدہ انداز میں تحقیقی نقطہ نظر سے پیش کیا ہے۔ پریم چند نے اصلاح معاشرہ میں اہم کردار ادا کیا اور جرائم پیشہ کرداروں کو بے نقاب کیا جو مذہب یا روایت کی آڑ میں کرتے ہیں۔ سجاد ظہیر (۱۸۹۹ء-۱۹۷۳ء) نے "لندن کی ایک رات" میں شعور کی رو اور ہندوستانی طلبہ کی ذہنی، جسمانی کشمکش کے ساتھ انگریز سرکار کو ڈاکو کے روپ میں دکھایا گیا ہے، جو ہندوستان کی دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں۔ ۱۹۳۶ء میں ترقی پسند تحریک کا آغاز ہوا تو گویا ناول میں بھی انقلاب آ گیا اور پہلے کی نسبت اچھے ناول لکھے گئے۔ قاضی عبد الغفار کا "لیلیٰ کے خطوط" ۱۹۳۲ء اور "مجنوں کی ڈائری" ۱۹۳۴ء گو کہ یہ ناول ترقی پسند تحریک سے پہلے وجود میں آئے لیکن ان میں "لیلیٰ کے خطوط" کو پہلا ترقی پسند ناول ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ "مجنوں کی ڈائری" ایک طوائف کی داستان کو بڑے اچھے انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ ناول کی تکنیک روزنامچہ یا ڈائری کی ہے۔ طوائف یعنی عصمت فروش مرکزی کردار ہے۔ "امراؤ جان ادا" میں انیسویں صدی کی طوائف ہے اور قاضی عبد الغفار کی لیلیٰ بیسویں صدی کی طوائف ہے۔ دونوں کے پاس مجرموں کا آنا جانا رہتا ہے۔ ناول کا آخری حصہ بڑا جاندار ہے جس میں مجرموں سے انتقام لینے کے لیے لیلیٰ بے تاب نظر آتی ہے۔

> "مجرموں سے میرے انتقام کا وقت آئے گا جب میں بیوی اور ماں بن کر بغاوت کا علم بلند کروں گی۔ ابھی تو میں ایک بازاری عورت ہوں۔ ذلیل، حقیر، گردن زدنی۔ جس شریعت کے پردے میں مرد، عورت پر جابرانہ حکومت کرتا ہے اسی شریعت کا نام لے کر اس کے سارے پردے فاش کروں گی۔ عصمت فروش بازاری عورت کی دو باتیں سن کر تم اس قدر

خفا ہو گئے مگر جب ایک خانہ نشین ، پاک نہاد بیوی کی دو چار باتیں سنو گے تو کیا کہو گے ؟ آواز محض تحقیر اور ذلیل سے روکی نہیں جا سکتی ! یہ اوچھوں کے ہتھیار ہیں جن کی دھار ہمیشہ کند ہوتی ہے "۔[۳۰]

اس ناول میں قاضی عبد الغفار نے ایک طوائف کی زندگی کی عکاسی کی ہے جو عصمت فروشی سے واپس عورت بننے کا سوچ رہی ہے کیونکہ اب اس کے اندر کی عورت بیدار ہو گئی ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے اپنے عصمت فروش کردار سے وہ تنگ آ گئی ہے اور ایک اچھی عورت کے روپ میں اپنے آپ کو ڈھالنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کیونکہ معاشرے میں عصمت فروشی کا کردار ایک مجرمانہ کردار ہے اور وہ اس سے توبہ کرنا چاہ رہی ہے۔ معاشرہ میں جرائم پیشہ افراد ایسا نہیں چاہتے۔

کرشن چندر (۱۹۱۴ء-۱۹۷۷ء) کا (شکست ۱۹۴۳ء) عزیز احمد کا (گریز ۱۹۴۳ء) اور "ہوس" عصمت چغتائی کا (ٹیڑھی لکیر) ان ناولوں میں ظلم و ستم اور بیجا معاشرتی جرائم کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ترقی پسند اردو ناولوں میں عریاں نگاری یعنی جنس نگاری، عصمت فروشی، جنسی زیادتی جس میں عزیز احمد کا "گریز" ناول شامل ہے۔ جنسی جرائم کی عکاسی ایک اچھے انداز میں کی ہے۔ ہمارے نقادوں نے اس پر رائے دی ہے۔ ڈاکٹر خالد اشرف نے اپنی کتاب "برصغیر میں اردو ناول" میں کہا ہے:

"سید وقار عظیم ، علی عباس حسینی، ڈاکٹر احسن فاروقی جیسے ناقدین فن کی شریفانہ ذہنی ساخت نذیر احمد اور پریم چند کے آدرش وادی اور صاف ستھرے کرداروں کے برعکس نئے مصنفین کے بے باک کرداروں اور کھلے موضوعات کو ذہنی طور پر قبول کرنے سے لاچار ہے مصنف نے اس ناول میں مشرقی اور مغربی تہذیب متوسط طبقے کی نفسیاتی اور جنسی بھوک کو کامیابی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ناول کا ہیرو نعیم اس طبقے کی ذہنی اور جذباتی الجھنوں کی تصویر ہے۔ عزیز احمد نے پہلی بار فرائڈ کے نظریات کو اپنے ناولوں میں مقام دیا ہے۔ "گریز" پہلی جنگ عظیم کے بعد تباہ و تاراج یورپ کی منتشر زندگی کا قصّہ ہے جب کوئی مثبت قدر معاشرے میں باقی نہیں بچی تھی۔"[۳۱]

قراۃ العین کا ناول "آگ کا دریا" بہت مشہور ہوا۔ آزادی کے وقت ہونے والے کشت و خون کی، ہولی قتل و غارت، ہندوؤں کا مسلمانوں کو قتل کرنا، جواہر لال نہرو کا مگرمچھ کے آنسو بہانا، غرض کہ انسان کو درندہ ثابت کرنے جیسے جرم کی داستان اس میں واضح نظر آتی ہے۔ قراۃ العین حیدر کے اس ناول میں شعور کی رو اور رچرڈسن، جیمز

جوائس اور ورجیناوولف جیسے ناول نگاروں کی طرح تہذیب و ثقافت کی بہترین عکاس ہے۔اس میں ہر عہد کا مجرم چھپا بیٹھا ہے ہندو صدیوں مسلمانوں کے ساتھ رہ کر بھی اس کا دشمن ہے اور وقت آتے ہی اس کے اندر کا درندہ باہر آجاتا ہے جس کا نتیجہ قتل جیسے جرائم سے نکلتا ہے۔عبداللہ حسین کا ناول ''اداس نسلیں'' ایک انعام یافتہ ناول ہے جس نے آتے ہی اپنی کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔کہانی جنگ عظیم اوّل سے شروع ہوتی ہے اور ۱۹۶۰ءتک کے حالات اس میں درج ہیں۔اس میں انگریز کی جبری بھرتی پھر ان کو افریقہ میں بے تربیت جنگی محاذ پر بھیجنا غرض کہ بے گناہوں کو جنگ کا ایندھن بنانا۔سکھ نوجوان کا قتل کرنا،پھر قتل کا انتقام قتل،جنگ میں غفلت نوجوانوں کا بے گناہوں کو قتل کرنا،نعیم کا واپس گاؤں آکر دہشت گردوں میں شامل ہونا۔امرتسر کے مشہور جلیانوالہ باغ کا واقعہ جس میں انگریزوں نے کھل کر قتل عام جیسا جرم کیا۔معاشرے میں جرائم کی حقیقت کو ناول نگار نے عمدگی سے پیش کیا ہے اور اس کی مذمت کی ہے۔اردو ناول میں اپنی مثال آپ ہے۔

شوکت صدیقی (۱۹۲۳ء-۲۰۰۶ء) کا ناول ''خدا کی بستی'' ۱۹۶۱ء میں انہوں نے بڑی خوبی سے متوسط طبقے کے جرائم کی عکاسی ایک اچھے نبض شناس کی طرح کی ہے کہ قاری خود چشم تصور سے اپنے آپ کو اس بستی میں موجود پاتا ہے۔کرداروں کی شکلیں ان کے معمولات اور انداز گفتگو اور الفاظ کا چناؤ حقیت نگاری کا ایک عکس ہے۔جو ان کی سحر بیانی اور مقصدیت کو عمدہ انداز میں ناظرین کو دکھاتا ہے۔کراچی کے نچلے طبقے کے آوارہ نوجوانوں کے مجرمانہ مکالمے بھی اس قدر حقیقی انداز میں پیش کرتے ہیں جس سے ان کا معاشرتی مشاہدہ نظر آتا ہے۔معاشرے کے جرائم پیشہ عناصر کس طرح تین کم سن کرداروں کو اپنے راہ پر لگاتے ہیں۔اس کے لیے نیاز کباڑیے کا کردار لاتے ہیں۔نیاز کباڑیے کا کرایہ دار نوشا اور اس کی والدہ ہوتے ہیں۔جب نوشا کرایہ دینے کے لیے کباڑیے کے پاس جاتا ہے تو کباڑیہ اس کو جرم کی ترغیب دیتا ہے بلکہ باقاعدہ طریقہ کار سکھاتا ہے۔

> ''اے نوشے! آج کل تو کیا کرتا ہے؟نوشا نے جواب دیا''عبداللہ مستری کی ورکشاپ میں کام سیکھ رہا ہوں۔۔۔۔۔۔موقع لگے تو کبھی کبھار کوئی پرزہ اوزار اڑا لیا کر اس سالے پاپی کا مال کھانا تو ثواب کا کام ہے۔۔۔۔۔۔کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں سیدھا یہاں آجایا کر۔چائے پانی کا خرچہ نکل آئے گا۔میں نے سنا ہے تجھے تو فلم دیکھنے کا بھی بہت شوق ہے۔نوشا سہما ہوا تھا کہنے لگا کہیں مستری کو پتہ چل گیا تو میری شامت آجائے گی''۔نیاز اپنے ڈھب پر لانے کے لیے اکسانے لگا۔ابے جب اس سالے کو پتہ لگے گا تب۔بس ذرا ہوشیاری کی ضرورت ہے۔دیکھ میں تجھے ترکیب بتاؤں گا''۔اس نے پرزے چرانے کے کئی طریقے نوشے کو بتائے۔۔۔۔''۔(۳۲)

اپنے کرداروں کے ذریعے شوکت صدیقی نے یہ بتایا ہے کہ معاشرے میں بڑا چور چھوٹے چور کیسے پیدا کرتا ہے۔ ان کرداروں میں نیاز، راجہ، شامی، نوشا اہم ہیں۔ چھوٹے جرائم کی گھناؤنی دنیا کی جس طرح پردہ کشائی کی ہے۔ ایک اچھے ناول نگار کی طرح معاشرے کا صحیح ترجمان ہے۔ ''خدا کی بستی'' میں اچھے اور بُرے لوگ سب ہی آباد ہیں لیکن جرائم کی دنیا الگ ہی ہے جس میں ہر طرح کا مجرم اپنا اپنا کردار بڑی خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔

شوکت صدیقی کا دوسرا بڑا ناول ''جانگلوس'' ہے جس میں وہ پنجاب کی دیہی زندگی پر سے پردہ اُٹھاتا ہے۔ اس ناول میں جرائم زدہ شخص کے متعلق گہری معلومات پر ناموں کے تبدیل کیے بغیر ناول میں بھرپور ان کی عکاس مکالموں اور منظر نگاری کا اعلیٰ شاندار نمونہ پیش کیا ہے۔ پڑھنے والا حقیقی طور پر اپنی آنکھوں کے سامنے چلتے ہوئے ان کرداروں کو دیکھ سکتا ہے۔ ''جانگلوس'' کے دو کردار جن میں رحیم داد اور لالی ہیں۔ لالی کا دنیا میں کوئی خونی رشتہ باقی نہیں ہے لیکن وہ اپنی فطری انسانی ہمدردی دوسروں کی زندگی بچانے کی خاطر اپنے تیئں خطرے سے دوچار بھی ہو جاتا ہے۔ ناول کے کردار ''حیات محمد'' ایک بیوروکریٹ جو اخلاقی پستی جیسے جرم میں ملوث ہے، خودی سے گزر کر تمام انسانی اقدار کو پامال کرتے ہوئے فقط ہوا و ہوس کا پجاری بن جاتا ہے۔ اس کی بیوی جب اپنی دکھ بھری کہانی لالی کے سامنے بیان کرتی ہے تو شوکت صدیقی اس تصویر کو بیان کرتا ہے۔

> ''حیات محمد چاہتا ہے کہ مہمانوں کا دل بہلاؤں۔ ان کے ساتھ سوؤں'' اس کی آواز بھرا گئی اس نے ٹھنڈی سانس بھری میں اب تک آٹھ مہمانوں کے ساتھ سو چکی ہوں۔ کل رات وہ مجھے نویں کے ساتھ سلانا چاہتا تھا۔ اسے وہ سیاست کہتا ہے۔ بادشاہ گری بتاتا ہے اور جب میں اس کی سیاست اور بادشاہ گری میں مدد کرنے سے انکار کرتی ہوں، مجھے بے رحمی سے مارتا ہے ہڈی پسلی توڑ دیتا ہے۔ لہولہان کر دیتا ہے۔ تجھے کس طرح بتاؤں کہ کیسے کیسے ظلم کرتا ہے۔۔۔۔۔۔وہ جاگیر دار جائیداد کے بغیر کسی سے پیار نہیں کرتا''۔ فاخرہ نے گہری سانس بھری جب تک یہ جاگیر جائیدادا اور زمین داری ہے نہ وہ اپنی بیٹی کا پیو بن سکتا ہے، نہ میرا شوہر''۔ (۳۳)

شوکت صدیقی لکھنو کے رہنے والے تھے۔ پاکستان بننے کے بعد کراچی آکر اس نے اچھے مسلم معاشرے کا خواب دیکھا تھا۔ وہ اسے نظر نہ آیا۔ اس نے سماجی، سیاسی، اخلاقی گراوٹ کا جو انتشار معاشرے میں دیکھا اپنے قلم کے ذریعے محفوظ کر لیا۔ ساتھ ساتھ اخلاقی تلقین بھی کر رہا ہے۔ رحیم اور لالی جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہیں۔ پھر جرائم پیشہ افراد ان کی اصلاح کی بجائے انہیں مختلف جرائم میں اپنا حصہ دار بنا لیتے

ہیں۔ شوکت صدیقی نے "خدا کی بستی" اور "جانگلوس" میں معاشرے کے ایسے کرداروں کو بے نقاب کیا ہے جو معاشرے میں عزت دار بنے ہیں یا درمیانے طبقے کے جرائم سے نقاب اٹھایا ہے۔ جانگلوس میں کسان کی حالت زار اور جاگیر دار کے مجرمانہ رویے کی عکاسی کرتے ہیں۔ انہیں جرائم پیشہ کرداروں کی وجہ سے وہ ایک اچھے ناول نگار ہیں۔ شوکت صدیقی کے ناولوں کی بنت ہی حقیت نگاری ہے۔ یعنی جو معاشرے کے اندر موجود ہے وہی دکھایا جارہا ہے۔ اس کے ناولوں میں تمام کردار حقیقی زندگی کا غماز ہیں اور یہی ناول کی خصوصیت بھی ہوتی ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان اس کے فن پر یوں رائے دیتے ہیں۔

> "شوکت صدیقی ترقی پسندوں کی بھیڑ میں ایک ایسے حقیقت نگار حیثیت سے بر آمد ہوئے جنہوں نے مخصوص نظریات کو فنی دائروں میں رکھ کر پیش کیا ان کا دوسرا ناول جو تین جلدوں میں آیا ہے، دیہی معاشرت کی انڈرورڈ کی حقیقت پسند عکاسی کی بنا پر پیش کیا گیا ہے وہ جانگلوس ہے۔"(۳۴)

نسیم حجازی (۱۹۱۴ء-۱۹۹۶ء) کا "خاک اور خون" ایم اسلم کا "رقص ابلیس" اور قدرت اللہ شہاب (۱۸۶۸ء-۱۹۳۶ء) کا "یا خدا" میں جرائم کے اسباب اور ان کا محرک بننے والے عناصر کی عکاسی بڑے اچھے انداز میں کی ہے۔ سیاسی لوگوں کے اکسانے پر عوام الناس کا قتل عام یا جنگی حکمت عملی کے تحت کسی قوم کی داستانیں ناول میں موجود ہیں۔ عبداللہ حسین کے ناول "قید" میں ایک مجبور عورت تین آدمیوں کو قتل کر کے پھانسی کی سزا پاتی ہے۔ اس ناول کی خوبی یہ ہے کہ اس میں نام نہاد مذہب کا لبادہ اوڑھے شخص کا جرم جب سامنے آتا ہے تو وہ پاگل ہو جاتا ہے۔ اس ناول میں بچپن کا خطاکار بڑا ہو کر بڑے جرم کرتا ہے۔ "قلعہ جنگی" مستنصر حسین تارڑ کا ایک جدید ناول ہے جس میں قید سات قیدیوں کی داستان ہے جو قلعہ جنگی (افغانستان) کے تہہ خانے میں قید ہیں۔ ان پر اپنے ہی مسلمان بھائیوں نے امریکیوں سے ان کو ڈیزی کٹر بموں سے مرواتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ ناول میں جنگی جرائم کو بڑی باریک بینی سے بیان کیا ہے جس کے پیچھے اقتدار حوس اقتدار اور عیسائی مسلم کی جنگ ہے۔ "قلعہ جنگی" ایک ایسے المیے کو طشت از بام کرتا ہے جس میں ہزاروں انسانوں کا لہو پانی کی طرح بہا۔ دانستگی یا نادانستگی میں کچی عمر کے انسان پکی عمر کے تجربہ کاروں کی انا کی بھینٹ چڑھ گئے۔ یہ مجرمانہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے اسلام کی مقدس جہادی روح کو عالمی استعمار نے جدید مہارت سے اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔ مقاصد کے حصول کے بعد یہی جہادی مجرم ٹھہرے۔ افغانستان کی دھرتی کو میدانِ جنگ بنانے والے اپنی جنگیں دوسروں کی زمین پر لڑتے رہے اور ان کے اپنے بیٹے ہجرت پر مجبور ہو کر لاوارث قرار پائے۔ لاکھوں افغانی کسی کا بازو نہیں، کسی کی ٹانگ نہیں۔ ان غیر ملکی طاقتوں کے جنگی جرائم کا ثبوت ہیں۔ اس ناول میں مصنف کا نظریہ یہی ہے۔ مصنف دوسروں کے معاملات

میں مداخلت کو جرم قرار دیتا ہے۔ اگر دوسروں کے معاملات میں مداخلت جرم ہے تو دوسرے ممالک کے لوگوں کا پرائی زمینوں پر جا کر جنگیں لڑنا نا قابل معافی جرم ہے۔ انہیں خیالات کی چہ مگوئیاں ناول میں کہیں کہیں چنگاریوں کی صورت میں دکھائی دیتی ہیں۔ مصنف نے انہیں جذبات کی بھڑاس اُس طرح کا رنگ دیا ہے۔

"ان میں کئی جو سرحد پار سے آئے تھے اور وہ صرف تلواروں سے مسلح تھے اور انہیں اس جذبے سے سرشار کیا گیا تھا کہ اگر ایمان مضبوط ہو تو کفر کو تلوار سے زیر کیا جاسکتا ہے لیکن کفر تھا کہ آسمانوں پر ہی اڑان کر کے چلا جاتا تھا نیچے آتا تو اس پر وار کر کے اپنے ایمان کی پختگی کا مظاہرہ کرتے۔ مومن ہو تو بے تیغ بھی لڑ سکتا تھا۔ ان کے پاس پھر زنگ آلود تلواریں تھیں"۔[۳۵]

مصنف نے اپنے نظریات کا اظہار کرداروں کی زبانی بڑی خوبی سے کیا ہے اور ہر کردار کی ذاتی رائے میں بڑی عمدگی سے اپنا خیال آنے دیتے ہیں۔ اس میں اَن پڑھ ملاؤں کے کردار پر طنز کیا ہے جو ان لوگوں کے قتل کا محرک ہے۔

"ہم میں سے کچھ ایسے بھی ادھر آئے جو ملاؤں کے مکر اور سحر میں اندھے ہو کر آگئے اور یہاں پہنچ کر ان پر کھلا کہ ان کے ساتھ کیا کھیل کھیلا گیا ہے۔ اس لیے ملا پیچھے رہ گئے۔ احتجاجی جلوس نکالنے اور چندہ جمع کرنے کے لیے۔۔۔۔۔۔ لیکن ہم میں سے بیشتر اپنے اپنے شعور کے تابع ایک پر وقار موت کے لیے اپنے پورے ہوش و حواس کے ساتھ ادھر آئے تھے"۔[۳۶]

ناول میں مصنف نے بار بار اس المیے کا ذمہ داران ملاؤں کو ٹھہرایا ہے جو کھل کر اپنی رائے کا اظہار کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ اسی نوعیت کے ناول کا ایک اقتباس درج ذیل ہے:

"وہ کسی شریعت یا شہادت یا جہادی فلسفے سے متاثر ہو کر صدقِ دل سے اگر چہ کچی عمر کی ناپختہ فہم کے صدق دل سے اِدھر آنکلا تھا، اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ اس کے مدِ مقابل جو کافر ہوں گے وہ شاید اس سے کہیں بڑھ کر پرہیز گار، شریعت کے پابند اور باریش ہوں گے۔ اور وہ بھی شہادت کے طالب ہوں گے اور کسی مولانا سنڈ وچ کا بہکایا ہوا صدق دل کی بے دھیانی میں اِدھر آنکلا تھا"۔[۳۷]

یہ ناول جس میں جنگی جرائم کا ذکر بڑی خوش اسلوبی سے کیا گیا ہے۔ قلعے کا ماحول موت کا سایا بہت سے قیدی پنجروں میں قید تھے۔ کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں دیا گیا پھر ایک سب سے بڑا جرم کہ قلعے کے تہہ خانے میں قید انسان خود ہی بھوک سے مر جائے لیکن اس میں پانی چھوڑنا کہانی کے سٹر کچر کو توڑنے کے مترادف ہے۔ یہی ناول کی خصوصیت بھی ہے کہ وہ کہانی اور زبان کے سٹر کچر کو توڑے۔ جنگی جرائم کے ذکر سے اس نے بڑی طاقتوں کے جرائم کو بے نقاب کیا ہے۔

شوکت صدیقی کا ناول "چار دیواری" لکھنؤ کی طرز معاشرت کے بارے میں لکھا گیا ہے لیکن اس میں توہمات اور جعلی پیری مریدی جن کی بڑی وجہ ناخواندگی ہے۔ پیری مریدی کی آڑ میں پیر زنا جیسے جرائم کرتے ہیں اور عوام کو بے وقوف بنا کر ان سے رقوم اور اخلاقی جرائم کا باعث بنتے ہیں۔ شوکت صدیقی نے اس جرائم زدہ کلچر کی عکاسی بڑے اچھے انداز سے کی ہے۔ اس معاشرے میں عورت کی حیثیت ایک جانور کی سی ہے جو گھر کی چار دیواری تک محدود تعلیم سے کوسوں دور جو اپنے ذاتی سائے سے بھی خوف زدہ ہو جاتی ہیں۔ جن، بھوت، آسیب عورتوں کے اعصاب پر سوار ایک عجیب سا ماحول ہے۔ اس ناول میں نواب تقی اور نواب صفی دو بھائیوں میں جائیداد کا جھگڑا اچل رہا ہے۔ نواب تقی کو پان میں زہر ڈال کر قتل کر دیا جاتا ہے۔ پولیس رپورٹ کرانے کی بجائے الٹا نزدیک قبرستان سے جنوں پر شک ہونے لگا۔ پھر اگلے جرم کی داستان یوں ہے کہ ایک منجھا ہوا چور جنوں کا شہزادہ بن کر نواب کی بیٹی سے زنا جیسا جرم کرتا ہے جس سے ایک ناجائز بیٹی بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس مجرم میں قلزم شاہ کا حلیہ بھی جعلی پیروں جیسا تھا۔ نواب تقی کا قتل دراصل دوسرے بھائی نے حویلی ہتھیانے کے لیے کیا تھا۔ جیسا کہ ناول میں قتل کی واردات کو شوکت صدیقی نے اچھے انداز سے بیان کیا ہے۔

> "نواب تقی محل کی چھت پر سو رہے تھے۔ اچانک ان کی آنکھ کھلی تو انھوں نے سامنے ایک کفن پوش کر ٹہلتے پایا جو پلک جھپکتے غائب ہو گیا۔ انہوں نے گھبرا کر تپائی سے خاصدان اٹھا کر پان منہ میں رکھا اور چباتے ہی انہیں اپنا گلا گھٹتا محسوس ہوا۔ ملازمہ کو آواز دی اور بیگم صاحبہ کو بلانے کا کہا جب تک سب آئے انہیں خون کی قے ہوئی اور اللہ کو پیارے ہو گے"۔ (۳۸)

یہ وہ قتل کی واردات ہے جس نے سگے بھائی کو قتل پر اکسایا تھا۔ اس میں جرم کی وجہ جائیداد کا تنازعہ تھا لیکن اس سے بھی بڑی وجہ ناخواندگی اور مجرمانہ رویہ تھا جس نے لالچ میں آکر بھائی کو رستے سے صاف کر دیا۔ توہم پرستی اتنی کہ شبہ قتل کی بجائے جن اور بھوت موت کا سبب قرار پائے۔

منشا یاد کا وسیع کینوس کا حامل ناول "راہیں" جس میں دیہی زندگی کے تجربات، تہذیب وثقافت، روایات، کھیل کود، معاشرتی اونچ نیچ کا مشاہدہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ معاشرتی روایت مجرمانہ رویوں پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ مثلاً چودھری سرور کا نجی سنیارن کو برباد کرنا۔ کبڈی کے کھلاڑی نیچ ذات کمہار ہونے کی وجہ سے حاصدوں کے ہاتھوں ایک ٹانگ سے محروم ہو جانا اور آخر میں چاک پر برتن بنانا۔ ذات برادری، خاندانی رنجش، جاگیروں اور زمینوں پر قبضے کرنا اور فسادات کروانا شامل ہے۔ پاکستان کا خواب دیکھنے والوں کا خیال تھا کہ اب گائے ذبح کرنے اور اب مسجد میں اذان دینے پر کوئی پابندی نہیں ہوگی۔ جائز کام کے لیے رشوت یا سفارش کی ضرورت نہیں ہوگی۔ سرکاری افسران اس کے خادم ہوں گے، فوج صرف سرحدوں کی حفاظت کرے گی۔ چوری، ڈکیتی قتل، اغواء نہیں ہوں گے، اگر کہیں ایسی واردات ہوگی تو پولیس کے ہاتھوں محرم بچ نہیں سکیں گے، کوئی بھی کسی کی خودداری اور عزت نفس کو مجروح نہیں کرے گا۔ منشا یاد نے پولیس کے مجرمانہ رویے پر کھل کر بات کی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> ”یہ کسی کو بھی نہیں بخشتے۔ ہمارے تھانے، چوکیاں اور کچہریاں جو عوام کی بھلائی اور حفاظت کے لیے بنائی گئی تھیں۔ یہ سب جرائم کے اڈے بن گئے ہیں۔ رشوت، سفارشم چھوٹی شہادتیں، جعلی بیانات اور آدمی کی انا کو مجروع کرنے والی سزاؤں کے مراکز، یہی وجہ ہے کہ اصلاح کی بجائے مجرم یہاں آکر عادی مجرم بن جاتے ہیں۔ ان کے اندر انسانیت کی کوئی رمق ہو تو بولیس نکال پھینکتی ہے۔ ان کی ساری شرم اور جھجھک دور ہو جاتی ہے“۔ (۳۹)

حوالہ جات

۱۔ فیروزاللغات فیروز سنز، لاہور ۲۰۰۵ء، ص ۸۵

۲۔ Oxford English Dictionary, Oxford University Press, New York 2011, P 338

۳۔ Frank E. Hagan. Introduction in Criminology: Theories Methods and Criminal Behavior USA 1986, P-281

۴۔ ایضاً، ص ۲۸۲

۵۔ محمد عبدالمالک، ڈاکٹر، پاکستانی بچوں میں جرائم کا بڑھتا ہوا رجحان، شعبہ سماجی بہبود جامعہ کراچی ۲۰۱۰ء، ص ۲۴

۶۔ سورۃ زخرف، آیت نمبر ۴۷، القرآن، ترجمہ مولانا فتح محمد خان جالندھری، قدرت اللہ کمپنی اردو بازار، لاہور

۷۔ ابوعبداللہ محمد بن فرج المالکی القرطبی، دربارِ رسول کے فیصلے، بک کارنر جہلم، ۲۰۱۹ء، ص ۲۳

۸۔ ایضاً، ص ۲۳

۹۔ امیر علی سیّد "روحِ اسلام" ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ لاہور، اشاعت پنجم، ۱۹۷۸ء ص ۲۹۷

۱۰۔ سورۃ و تین، آیت ۴، فتح محمد خان جالندھری، فتح الحمید قدرت اللہ کمپنی، لاہور

۱۱۔ Criminilogy principles and concepts- Dr.G.S.Rojpurohit Random publication, New Delhi, 2016, p.5

۱۲۔ ایضاً، ص ۶

۱۳۔ Richard Quinny, The Social Realities of Crimes, Little Brown, Boston 1970, P- 78

۱۴۔ Emile Durkheim, The Rules of Socialgical Method, free press, New York, 1964, P.71

۱۵۔ Robert K. Marton, Social Theories and Social Structure, P.131, Free Press, New York, 1957

۱۶۔ Sue Titus Reid writer, MC Graw Hill, New York,1986, P.109

۱۷۔ Edwin Sutherland, White Collar Crime, Dradon Press, New York, 1949,

P. 240

۱۸۔ Sigmund Freud, Criminological Thought Martin, New York, 1933, P.67

۱۹۔ آصف حسن، سیگمنڈ فرائڈ، حیات و نظریات، بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۵ء، ص۱۵۸

۲۰۔ ایضاً، ص۱۵۹

۲۱۔ Dr. G.S Rajpurohit, Criminology: Principles and Concept, Random Publication, New Delhi, 2016, P.7-8

۲۲۔ Karl Marx, population crime and pauperism in Karl Marx and Friedrich Engels, Ireland and the Irish Question (Moscow- Progress) 1859, reprint 1971, P.92

۲۳۔ الطاف حسین حالی، خواجہ، حیات سعدی، مرتبہ، شیخ اسماعیل پانی پتی، مجلس ترقی ادب، لاہور، طبع دوم ۱۹۹۵ء، ص۱۷۵

۲۴۔ Vicky Pollocketal, Crime causation: Biological Thoeries" in Encyelopedia of Crime and Justice Vol-01, New York- Macmillan , 1983, P.311

۲۵۔ خواجہ میر درد، دیوان درد، مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی، مجلس ترقی ادب، لاہور، ۱۹۸۸ء، ص۱۰۰

۲۶۔ محمد عبدالمالک، ڈاکٹر، پاکستانی بچوں میں جرائم کا بڑھتا ہوا رجحان، شعبہ سماجی بہبود جامعہ کراچی ۲۰۱۰ء، ص۲۷

-27 Jocelyn E. Krebs, Lavin Essential Gene, Jones Bartlett learning 2021, P.4

۲۸۔ Forensics Lab Manual by Dr. Max Houck, Chalet London, 2016, P.186

۲۹۔ ایضاً، ص۳۸

۳۰۔ ادبیات، سہ ماہی، اکادمی ادبیات پاکستان (اردو ناول قصہ ڈیڑھ صدی کا)، حصّہ اوّل، اسلام آباد، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص۴۲۹

۳۱۔ خالد اشرف، ڈاکٹر، برصغیر میں اُردو ناول، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۷ء، ص۶۴

۳۲۔ شوکت احمد صدیقی، خدا کی بستی، حصّہ اوّل، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۴۶

۳۳۔ شوکت احمد صدیقی، جانگلوس، حصّہ اوّل، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۷ء، ص ۲۴۵

۳۴۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، ہیئت، اسالیب اور رجحانات ۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۷ء، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۳۹۴

۳۵۔ تارڑ مستنصر حسین، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۸ء، ص ۴۲

۳۶۔ ایضاً، ص ۱۲۰

۳۷۔ ایضاً، ص ۱۲۳

۳۸۔ شوکت صدیقی، ناول چار دیواری، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، مئی ۱۹۹۰ء، ص –۵۸

۳۹۔ منشا یاد، راہیں، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء، ص ۲۰۳

باب دوم:

منتخب اردو ناولوں میں سماجی جرائم کی پیش کش

الف۔ سماج:

انسان سماجی حیوان (Social Animal) ہے۔ سماج کے بغیر انسانی زندگی کی بقا ممکن نہیں۔ معاشرتی زندگی کی ابتدا سے زمانۂ حال تک انسانی سماج نے نو بہ نوع ارتقائی کروٹیں لی ہیں جو انسانی ترقی، شعور اور عظمت کا حوالہ ہیں۔ اس کے برعکس حیوانی معاشرہ اس درجہ منظم اور ترقی یافتہ نہیں جس درجہ انسانی معاشرہ ہے۔ انسانی سماج کی تعمیر و تشکیل میں صدیوں کے ارتقائی سفر کا نتیجہ ہے اور اس طویل عرصے میں زندگی نے مختلف صورتیں اختیار کیں۔ مادی اعتبار سے حیات کو دو اقسام میں بانٹا جاتا ہے۔ ا۔ حیوانات ۲۔ نباتات

پہلی قسم میں انسان کا شمار ہوتا ہے۔ انسان کو تمدن سازی کی صفت ودیعت ہوئی ہے اور یہی تمدن انسانی وجود کا پتہ دیتا ہے جبکہ اس کے برخلاف دوسرے حیوانات اس معاشرے کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔ جب زیادہ انسان اکٹھے ہو کر اپنے لئے زندگی کے اصول و ضوابط اور رسوم و رواج بناتے ہیں تو اسے معاشرہ یا سماج کہتے ہیں۔ ماہرین نے اس کی تعریف یوں کی ہے۔ امریکی مفکر لسٹر فرنیک وارڈ (Lester Frankward) کے الفاظ میں:

> "Sociology is the science of society or social phenomena."(۱)

"یعنی سماجیات، سماج یا سماجی ماحول کا علم ہے"۔ برطانوی مفکر گنبرگ (Morrisgisnberg) کے الفاظ کے مطابق سماج:

> "Sociology is the study of human interactions and interrelations, their conditions and consequences."(۲)

یعنی سماج انسانی آپسی اعمال اور آپسی تعلقات نیز ان کے حالات اور نتائج کا مطالعہ ہے۔ سماج افراد کے مجموعے کا نام ہے۔ جہاں انسان زندگی گزارتا ہے۔ سماج میں کئی علوم جن میں معاشیات، سیاسیات، نفسیات، قانون، تاریخ، انسانیات اور ادب پروان چڑھتے ہیں۔ ناول وہ صنف ادب ہے جس میں ناول نگاروں کے اندر پائے جانے والے حالات و واقعات کا تجزیہ بڑا خوبصورتی سے کیا ہے۔ ان میں روسی، فرانسیسی ناول نگاروں نے سماج کی اپنے اپنے انداز میں گہری تصویر کشی کی ہے۔ خاص طور پر سماجی جرائم پر لکھا ہے ہمیں انیسویں صدی کی

آخری دہائیوں میں روس اور فرانسیسی سماج میں ہونے والے جرائم کی تصویر نظر آتی ہے اور ان کو پڑھنے والا آسانی سے محسوس کرسکتا ہے۔ ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "ابن الوقت" سماجی شعور پر مشتمل ہیں۔ سرشار، شرر، مرزا ہادی رسوا، کے ناولوں میں سماج کی تصاویر ملتی ہیں۔ منشی پریم چند کے ناول "گاؤ دان"، "نرملا"، "بازار حسن" ہمیں سماج کے جرائم روایتی اور غیر روایتی لیٹروں کا ذکر ملتا ہے۔ قراۃ العین حیدر، عبد اللہ حسین، انتظار حسین، مستنصر حسین تارڑ کے ہاں بھی سماج میں ہونے والے مظالم کی تصویر ملتی ہے۔ شوکت صدیقی جیسا ناول نگار تو ایک منجھے ہوئے ادیب کی طرح سماجی جرائم کی تصویر کشی کرتا ہے۔

ب۔ ناول جانگلوس میں سماجی جرائم:

شوکت صدیقی اردو ادب کے نامور ناول نگار ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کو بہت اچھے ناول دیے ہیں۔ کرمنالوجی یا جرمیات کا تذکرہ تو ہر ناول میں ہوتا ہے کیونکہ ناول سماج کا عکس ہوتا ہے۔ جرائم بھی معاشرے میں تواتر سے برپا ہوتے ہیں اور بیشتر جرائم ایسے ہیں کہ انسان دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ ان جرائم میں خاندانوں کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں لیکن دشمنی ہے کہ ختم ہونے کا نام ہی نہیں لیتی۔ روزانہ قتل و غارت، دہشت گردی راہزنی، تشدد اغوا، سٹریٹ کرائمز غرض کہ قانون کہیں نظر ہی نہیں آتا لیکن جوں جوں دنیا ترقی کر رہی ہے، جرائم نے بھی ترقی کی ہے۔ اس دوڑ میں اپنا طریقہ واردات بدلا ہے یعنی سائبر کرائم منی لانڈرنگ، کرنسی اسمگلنگ وغیرہ۔ جاسوسی ناول تو جرائم کی دنیا ہوتے ہیں لیکن ادبی ناولوں میں ضرورت کے تحت ہی ایسا کیا جاتا ہے۔ ہر ناول نگار نے جرائم کی نشاندہی کی ہے۔ مراۃ العروس سے لے کر آج کے جدید ناول تک جنگ عظیم اوّل ہو، سانحہ جلیانوالا باغ ہو، جنگ عظیم دوم یا ۱۹۴۷ء آزادی کے وقت کے فسادات ہوں، مارشل لاء ہو یا سقوط ڈھاکہ معاشرتی انتشار ہو یا ظلم، ناول نگاروں نے انسان کے اندر چھپے ہوئے درندے کی نشاندہی بھرپور طریقے سے کی ہے۔ اردو نہیں بلکہ عالمی ادب نے بھی جرائم پر بہت لکھا ہے۔ فیودر دستوئیفسکی کا (Crime and Punishment) یعنی "جرم وسزا" جرم کے حوالے سے عالمی ادب میں اپنا مقام رکھتا ہے۔ اردو ناول نگار شوکت صدیقی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ "خدا کی بستی" میں انہوں نے جرائم کی دنیا کو بے نقاب کیا ہے۔ اس نے جرائم اور جرم برائے جرم کو پیش کیا ہے جس کا نمائندہ شاہ جی ہے اور گھر سے اسکول سے بھاگے ہوئے لڑکوں کو تربیت دے کر چوری چکاری اور جیب تراشی جیسے جرائم کی طرف راغب کرتا ہے، وہ ایک لحاظ سے جرم کے ایک مرکز کا بانی ہے اور ہزاروں گھرانے اجاڑنے کا ذمہ دار ہے۔ اس کے پیچھے غربت مفلسی اور تعلیم کی کمی ہے۔ شاہ جی کے گھناؤنے کاروبار نے ترقی کی اور وہ جرائم کی ترقی

دینے میں معاون ثابت ہوا۔ اس طرح جرم مفلسی اور غربت کی کوکھ سے نمودار ہوا اور اس نے معاشرے کو جکڑ لیا۔ "خدا کی بستی" میں دوسرا کردار خان صاحب سفید پوش ہیں اور معاشرے میں ان کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے لیکن اس سفید پوشی کی آڑ میں جو شخص جرائم کرتا ہے وہ ڈاکٹر موٹو کا مکروہ کردار نیاز کباڑیے کا بُرا کردار جو چھوٹے بچوں کو جرم کی ترغیب دیتا ہے۔ یہ تھے وہ جرائم جو شہری آبادی میں ہوتے ہیں۔ میرا موضوع ان کا ناول "جانگلوس" ہے جو تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس میں دنیا کے (انڈرورلڈ) کے لوگوں کو بے نقاب کیا گیا ہے کہ کس طرح جاگیردار جرائم کی پرورش کرتے ہیں تاکہ ان کی چودھراہٹ قائم رہ سکے۔ انہوں نے نجی جیلیں بنائی ہوئی ہیں۔ دوسروں کی بھینسیں چوری کرانا، غریب مزارعوں کا معاشی اور جسمانی قتل ان کا دلچسپ مشغلہ ہے۔ شوکت صدیقی کا اس میں بڑا تجربہ ہے کہ اس نے کرداروں میں حقیقی ناموں کو بھی نہیں بدلا۔ مفلسی اور غربت کی وجہ سے لوگ چھوٹی چھوٹی باتوں پر قتل، چوری ڈکیتی اور لوٹ گھسوٹ کر رہے ہیں۔ لالی اور رحیم کے پلاٹ سے لے کر تمام کردار جو اس میں شامل ہیں، ان کو بڑی خوبی سے بے نقاب کیا ہے۔ شوکت صدیقی نے اپنے ایک انٹرویو میں جانگلوس کے بارے میں کہا تھا:

> "جب میں یہ ناول لکھ رہا تھا تو میرا اسٹڈی روم ایک ایسا ورکشاپ بن گیا تھا جس کے در و دیوار پر ناول سے متعلق شہروں اور اضلاع کے نقشے آویزاں تھے"۔[۳]

شوکت صدیقی نے پاکستان کی تخلیق سے پہلے "کوکا بیلی" نامی ناولٹ لکھا تھا لیکن ان کو اصل شہرت "خدا کی بستی" ناول سے ملی جس میں انھوں نے چھوٹے جرائم پیشہ لوگوں کی زندگی کے بارے میں لکھا ہے۔ انھوں نے جانگلوس میں جاگیردار اور وڈیرا شاہی کے طرز ہائے عمل کو بھی واضع کیا ہے۔ جانگلوس دراصل دیہی جرائم کی کہانی ہے۔

ج۔ چوری اور راہزنی:

جانگلوس میں ہماری دیہی زندگی کے جرائم پر ایسی ایسی باتوں کو کریدا گیا ہے کہ ناول نگار خود سامنے کھڑا بھینسیں چوری ہوتے دیکھ رہا ہے۔ نجی جیلیں پھر چودھریوں کے فریب لوگوں کو آپس میں لڑانا الیکشن سے پہلے اور بعد کی وارداتیں کرنے والے چودھریوں کے مجرمانہ چہروں کو اپنے خوبصورت کرداروں سے دکھایا گیا ہے۔ ناول کا آغاز ہی جیل سے بھاگے ہوئے دو قیدیوں سے ہوتا ہے پھر وہ جہاں جاتے ہیں ہر کوئی انہیں اپنے مقصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ لالی اور رحیم داد جیل سے بھاگے ہوئے دو مجرم ہیں۔ وہ ہر جگہ جرم کی نئی داستان رقم

کرتے ہیں یا مجرموں کے ہتھے چڑھتے ہیں۔ راستے میں پل کے ساتھ ایک کار کا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے وہ مرنے والے کے کپڑے اور بٹوا بھی نکال لیتے ہیں۔ اس جرم کو شوکت صدیقی نے کیسے بیان کیا ہے، یہ ہمارے مجرمانہ رویے کی تصویر کشی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"لالی نے پلٹ کر رحیم داد کو دیکھا اور کچھ کہے بغیر جھک کر زمین پر پڑے ہوئے آدمی کے ہاتھ سے گھڑی اتاری اور اپنی کلائی پر باندھ لی۔ پھر اس کے پیروں سے جلدی جلدی جوتے اتارنے لگا۔ اس کے بعد اس نے پتلون کے بٹن کھولے اور دونوں پائنچے پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔ پتلون اُتر کر اس کے ہاتھ میں آگئی۔ لالی نے فوراً جیبیں ٹٹولیں۔ پینٹ کی پچھلی جیب سے چمڑے کا پرس نکلا۔ لالی نے پرس کھول کر اندر نظر ڈالی۔ پرس میں نوٹ تھے۔ اس نے پرس جیب میں رکھ لیا۔ پھر وہ بش شرٹ اتارنے لگا تو لاش میں ہلکی سی حرکت ہوئی ساتھ ہی اکھڑی ہوئی سانس لینے کی آواز آئی۔ رحیم داد چیخا "ابھی زندہ ہے" بش شرٹ اس نے ایسے اتاری جیسے کوئی بکرے کی کھال اتارتا ہے"۔ (۴)

یہ اس شخص کی کہانی تھی جو حادثے کی وجہ سے مر گیا ہے تو چوروں نے اس کی کلائی سے گھڑی، پرس اور کپڑے اتار لیے ہیں تاکہ جیل والے کپڑے بدل سکیں لیکن پھر ساتھ ہی ایک اور واردات کی۔ ایک ٹرک آکر رُکتا ہے۔ اس کا ڈرائیور اور کنڈیکٹر اس گاڑی کے پہیے کھول رہے ہوتے ہیں حالانکہ وہ دیکھ بھی رہے ہیں کہ بندہ مرا پڑا ہے۔ یہ وہ منظر ہے جو شوکت صدیقی نے ناول میں بیان کیا ہے لیکن حقیقت میں ہمارے ہاں ہوتا بھی ایسے ہی ہے یونہی حادثہ ہوا حادثے والے کو اپنی ہوش نہیں ہوتی لوگ اس کی چیزیں چرا کر لے جاتے ہیں۔ یہ معاشرے کی تصویر کشی ہے۔ پاکستان میں جو فوجداری قانون رائج ہے اس کے مطابق اس جرم کی سزا زیرِ دفعہ ۳۷۹ بیان کی گئی ہے۔ تین سال قید یا جرمانہ ہو سکتی ہے۔ ناول میں شوکت صدیقی معاشرے میں پھیلے کرداروں کے جرائم کو بے نقاب کرتے دکھائی دیتے ہیں۔ ناول کے دو کردار لالی اور رحیم داد ایک مکان میں چوری کی نیت سے داخل ہوتے ہیں۔ رات کو لالی جلتی ہوئی لالٹین کو مدھم کر کے صندوق سے کپڑے نکال رہا تھا کہ اچانک ہاتھوں میں خون سے لپٹی چھری لیے ایک عورت آگئی۔ اس نے چھری سے لالی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔ اندر لالی نے ایک گردن کٹی لاش دیکھی تو پوچھنے پر عورت نے بتایا کہ اس کو میں نے قتل کیا ہے اور یہ میرا یار ہے۔ میں اس کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی۔ گھر کا سارا زیور اسے لا کر دیا۔ میں چودھریوں کے گھر کام کرتی تھی۔ اس نے مجھے دھوکا دیا۔ چپکے سے دوسرا نکاح کر لیا۔ تب میں نے اسے قتل کیا ہے۔ یہ گاؤں کے جرائم کی ایسی داستان

ہے جو ہر روز ہمارے معاشرے میں دہرائی جاتی ہے۔ قتل جیسے جرم کی سزا سزائے موت یا عمر قید ہے۔ لیکن معاشرہ ہے کہ سدھرنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ ناول نگار کا کام صرف جرم کی نشاندہی کرنا ہوتی ہے نا کہ آگے بڑھ کر اس کو روکے: قانون کی حکمرانی قائم کرنا اربابِ اختیار کا کام ہے۔ شوکت صدیقی نے یہ کردار شاداں کا ڈالا ہے جو اپنے ہی خاوند کی قاتلہ ہے۔ اس کا اگلا کردار ماسٹر فیض محمد کا ہے جو لالی کو راہ چلتے ہوئے ملا تھا۔ یہ ماسٹر جی جعلی کلیم داخل کروا کے چار مربعے اراضی الاٹ کرا چکا تھا۔ اس کی بیٹھک میں ہی اخبار میں لالی نے یہ خبر پڑھی کہ دو قیدی جیل سے بھاگے ہوئے ہیں اور ایک ہفتے سے مل نہیں رہے۔ پولیس ان کو تلاش کر رہی ہے۔ ماسٹر جی کی گاؤں میں تو بڑی عزت تھی لیکن تھا وہ پاپی اور جرائم پیشہ۔ یہاں آکر ناول نگار نے کہانی کے رُخ کو موڑا ہے کہ لالی بالکل اجنبی ہے اور ماسٹر ایک منجھا ہوا واردا تیا ہے۔ اس کی بڑی بڑی خوبصورت بھینسیں تھیں۔ شوکت صدیقی نے کمال مہارت سے جرم سے جرم کی پیدائش کی ہے۔ یعنی ایک تو لالی جیل سے بھاگا ہوا ہے اوپر سے ماسٹر جی جو کہ وائٹ کالر کرائم کا بادشاہ ہے اسے اپنا بیٹا بنانے کے چکروں میں ہے۔ اس کی بیٹی طاہرہ کو جب پتا چلتا ہے کہ ابّا اس سے میرا رشتہ کر رہا ہے تو وہ رات کو لالی کو کہتی ہے کہ میں کسی کی امانت ہوں میرے پیٹ میں کسی کا بچہ پل رہا ہے۔ یہ ہمارے سماج کا سچ ہے۔ شوکت صدیقی سچ جیسے جرائم لکھنے میں بڑی عمدگی دکھاتے ہیں۔ ایک ایک تار کو لڑی میں اچھی طرح پروتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

"اس نے اپنے بدن سے چادر اُتار کر میز پر رکھ دی اور نہایت بے باکی سے اپنا پھولا ہوا پیٹ دکھا کر بولی "یہ کسی کی امانت ہے اور جس کی یہ امانت ہے میں اس کی امانت ہوں"۔(۵)

جانگلوس میں جابجا کرائم سین ہماری سوسائٹی میں موجود ہیں اور یہ ایک جُرم دوسرے جُرم کی پیدائش کا ذمہ دار ہے۔ اس لڑکی نے جو جرم کیا زیرِ دفعہ ۳۷۶ زنا بالرضا ہے۔ اب لالی کی ہوا کو بھی پتہ نہیں تھا کہ یہ کیا چکر ہے۔ لڑکی نے یہ بھی بتایا کہ لاہور میں کالج میں پڑھتی تھی وہیں ٹیوشن پڑھانے والے پروفیسر سے اس کی محبت ہو گئی تھی یہ بچہ اسی کا ہے۔ لالی بھی منجھا ہوا چور تھا اس نے کہا کہ ایک سمگلر کی بیٹی ہو۔ میں آپ کی بات تب مانوں گا جب اپنی بھوری مج مجھے کھول کر اس کا رسہ پکڑا دو اور دور تک اسے چھوڑنے بھی جاؤ۔ ساتھ اپنا زیور مجھے دے دو اور پھر ایسے ہی ہو۔ آگے جا کر لالی کو ڈاکوؤں نے پکڑ لیا۔ ڈاکوؤں کا پولیس سے مقابلہ ہوا تو وہ بھاگتا ہوا حیات محمد خاں وٹو کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ایک نمبر کا شرابی اور جرائم پیشہ سیاستدان تھا۔ اس کی اپنی شراب کی بھٹیاں تھیں اور وہ پورے علاقے میں بلکہ پولیس کو بھی شراب سپلائی کرتا تھا۔ اس نے اپنے بھائی کی جائیداد ہتھیانے کے لیے اسے ہر روز نشے کے ٹیکے لگواتا تھا۔ وہ بندوں کو قتل کروا کے اپنے تہہ خانے میں دفن کرا دیتا

تھا۔ اس کے بڑے بھائی نے اپنے ملازم کی زبان اس لیے کٹوائی تھی کہ اس نے اس کے کتے کا گوشت چرا کر کھایا تھا۔ اس نے اپنی بیوی کے ناجائز تعلقات انگریزوں سے بنا کر جاگیر حاصل کی تھی بعد میں بیوی کو بھی قتل کر دیا۔ اس کی جائیداد اب اس کا بھائی چھیننے کے چکر میں ہے۔ زمین اور پیسے کی ہوس ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔

i۔ پولیس تشدد:

شوکت صدیقی نے ہمارے تھانہ کلچر کی عکاسی کی ہے جو کہ مجرمانہ کلچر ہے۔ ناول میں ایک سماجی جُرم جو ہماری پولیس کرتی ہے سے پردہ اُٹھایا گیا اگرچہ پولیس کا کام لوگوں کی جان و مال کا تحفظ کرنا ہوتا ہے تاکہ لوگوں پر تشدد نہ ہو، لیکن ہماری پولیس تفتیش، جُرم اور مجرم کی پہچان سے محروم ہے۔ تفتیش میں ہر جگہ نقص پائے جاتے ہیں۔ نفسیاتی طریقۂ تفتیش کا انتہائی فقدان ہے۔ بڑے کے لیے تو سہولیات ہی سہولیات ہیں لیکن غریب شک کی بنا پر بھی پکڑا جائے تو سارے شہر کے کیس اس پر ڈال دیئے جاتے ہیں۔ بڑے آدمی کو کرسی جبکہ چھوٹے آدمی کو ہماری پولیس دھکے دیتی ہے۔ جانگلوس میں ایک پولیس تشدد کے واقعے کو بیان کیا گیا ہے، جو کہ ہماری پولیس کی کارکردگی ہے۔ ہمارے ہاں چھے قسم کی پولیس ہے لیکن پھر بھی دوران تفتیش ملزم کا قتل، جعلی پولیس مقابلے، دو نمبری کرنے والوں کو کھلی چھٹی دینا ہماری پولیس کا طرۂ امتیاز ہے۔ ۲۰۱۷ء میں لاہور نصیر آباد پولیس نے ۴ سالہ بچے پر جوا کھیلنے اور کارِ سرکار میں مداخلت کا مقدمہ درج کیا۔ ۲۰۱۷ء میں ہی شیخوپورہ پولیس نے دو سالہ بچے پر فائرنگ کا مقدمہ درج کیا تھا۔ ۲۰۱۸ء میں ڈی جی خان میں پولیس نے چار سالہ بچے پر ڈکیتی کا مقدمہ درج کیا تھا اور تو اور ۲۰۱۴ء میں لاہور کی عدالت نے ۹ ماہ کے بچے کے خلاف مقدمہ خارج کرتے ہوئے سخت ناراضی کا اظہار کیا۔ یہ ہے ہماری پولیس کی کارکردگی جبکہ مہذب دنیا ایسا کرنا ناممکن ہے۔ ۹ ماہ کے بچے پر فائرنگ کرنے اور اقدام قتل کا مقدمہ تھا۔ اس بچے کو باپ نے گود میں لے کر ضمانت کا انگوٹھا لگوایا۔ اسی طرح چند سال قبل پنجاب پولیس نے چھے سالہ بچے پر ریپ کا مقدمہ درج کرایا۔ ان تمام واقعات سے واضح ہوتا ہے کہ پاکستان میں قانون کے محافظ بچوں کے متعلق قانون کتنا جانتے ہیں اور عوام کی جان و مال کا تحفظ کدھر ہے۔ پولیس تشدد کی سزا زیرِ دفعہ ۳۴۲، ۳۳۷ت۔پ کے تحت برطرفی اور قید ہے۔ یہ بات بھی نہیں کہ ساری پولیس ہی اسی طرح کی ہے۔ لیکن بعض اچھے لوگ بھی ہیں جو واقعی عوام کی جان و مال کی حفاظت اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ناول میں شوکت صدیقی نے ایک پولیس تشدد کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

> ”پولیس نے کسی لاری کا چلان کیا اور اس کے ڈرائیور کو پکڑ کر تھانے لے گئی۔ سنا ہے وہاں اس کی پٹائی کی گئی اور حوالات میں بھی بند کر دیا گیا۔ چوکیدار بتانے لگا کہ اس پر لاری

اڈے والوں نے ہڑتال کر دی۔ ڈاکیا آیا تھا اس نے بتایا تھا کہ لاری مالکان اور پولیس افسروں کے درمیان بات چیت چل رہی ہے پر ڈرائیور پولیس کے رویے سے بہت بگڑے ہوئے ہیں۔ وہ نہیں مانتے، ان کا کہنا ہے کہ کرپٹ تھانے دار کو نکالو اور اس کے خلاف چھان بین کی جائے۔ اس نے قدرے تامل کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ ابھی کچھ طے نہیں ہوا"۔[۶]

ایسے واقعات آئے روز ہمارے ہاں معمول کا حصّہ ہیں۔ لوگ سڑکوں پر لاشیں رکھ کر احتجاج کر رہے ہوتے ہیں کہ ہمارے پیاروں کو پولیس نے تشدد کر کے مار دیا۔ اگر پولیس خود جرم کرے تو معاشرہ سدھرنے کی بجائے بگڑتا ہے۔ شوکت صدیقی نے معاشرے کو میک اپ کے بغیر پولیس والوں کا اصل چہرہ دکھایا ہے اور لوگ اسے محسوس بھی کرتے ہیں۔

ii۔ صفدر علی اُوورسیئر کی کرپشن:

اگلا کردار صفدر علی اوورسیئر کا ہے۔ یہ کردار بھی بڑا دلچسپ ہے۔ لالی ریسٹ ہاوس کے جس کمرے میں سویا تھا وہاں کچھ عرصہ پہلے ایک عورت بانو کا قتل ہوا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں رات گزارنے والے اس کمرے سے ڈرتے تھے لیکن لالی نے ہمت کر کے رات گزارنا شروع کر دی۔ عین آدھی رات کو اسے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز آئی۔ لالی پہلے ڈرا ہوا تھا کہ اس کمرے میں بانو کی روح چڑیل بن کر آتی ہے۔ خوفناک سسکیوں کی آواز کے ساتھ خوشبو بھی پورے کمرے میں پھیل گئی تھی۔ لالی نے ہمت کر کے اس کی چوٹی پکڑی اور پوچھا کہ تو کون ہے؟ اس نے بتایا کہ صفدر علی میرا میاں اوورسیئر ہے اور آجکل وہ دو مہینے سے معطل ہے وہ مجھے جیپ میں اپنے ساتھ بٹھا کر لایا ہے تاکہ میں بڑے انجینئر کا دل بہلاؤں۔ انجینئر رپورٹ اوکے کرے گا تو میرے میاں کی انکوائری بند ہو جائے گی، ورنہ جو اس نے ٹھیکیدار سے پیسے لیے ہیں نوکری سے بھی جائے گا اور جیل کی ہوا بھی کھانی پڑے گی۔ صفدر علی نے میری بڑی منت سماجت کی ہے۔ اس لیے میں بڑے انجنیئر کو خوش کرنے کے لیے یہاں آگئی۔ لالی اسے کہتا ہے کہ تیرے بقول ابھی آپ کی شادی کو چھے ماہ ہوئے ہیں اور تمہارا خاوند تجھے پرائے مرد کے ساتھ غلط کاری کرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ اوپر سے کہہ کر بھی گیا ہے کہ اگر انجینئر کے ساتھ گڑبڑ کی تو کھڑے کھڑے طلاق دے دے گا۔ اس کو شوکت صدیقی نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اس نے گھور کر زرینہ کو دیکھا وہ تجھے انجینئر کے ساتھ سونے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔ یہی بات ہے نا؟ لالی کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔ تیرا خصم چکلا تو نہیں چلاتا؟ ایسی بات نہیں ہے

وہ اوور سیئر ہے۔ وہ آہستہ آہستہ بتانے لگی۔ بات یہ ہے کہ وہ ایک چکر میں آ گیا ہے۔ دو مہینے سے معطل ہے۔ اس کے خلاف انکوائری ہو رہی ہے۔ وہ جھجکی، سڑک کے ٹھیکے میں صفدر نے ٹھیکیدار سے رشوت لی تھی۔ کسی نے اوپر شکایت کر دی۔ اب بڑا انجینئر انکوائری کرنے آیا ہے جو رپورٹ وہ دے گا اسی پر صفدر کے کیس کا فیصلہ ہو گا"۔[۷]

iii۔ کمشنر ہمدانی اور اس کے جرائم:

ناول کے ہیرو لالی کی ملاقات سڑک کے کنارے کمشنر ہمدانی صاحب سے ہو جاتی ہے۔ ہمدانی کی گاڑی خراب ہو گئی ہے اور لالی اس کی مدد کرتا ہے۔ پھر وہ لالی کو یہ کہتا ہے کہ تو جیل سے بھاگا ہوا قیدی ہے۔ سن میرے پاس رہ تجھے کوئی کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ کمشنر تو ضلعے کا بادشاہ ہوتا ہے بادشاہ۔ کمشنر کے گھر آنے کے بعد لالی کے کپڑے تبدیل کرائے گئے اور نہا دھو کر وہ جنٹلمین بن گیا۔ کمشنر نے رات کو اسے جہاں وہ ٹینس کھیلتا تھا بلایا ساتھ اس کی بیوی نوشابہ تھی۔ اسے کہنے لگا کہ آپ ہمارے امپائر ہیں کیونکہ ہمارے پرانے امپائر سمرا صاحب کو دل کا دورہ پڑا ہے ان کی جگہ آپ کی ڈیوٹی ہو گی۔ سسپینس نائٹ میں آپ کا حکم ہی آخری حکم ہو گا۔ تیرا نام سردار نور محمد خان بزدار ہو گا۔ امپائر کیا تھا کہ زنا کرنے والوں کی نگرانی کرنا۔ یہ بعد میں لالی کو پتہ چلا تو بہت پچھتایا۔ مہر سلمان نے جنگل میں ایک بہت بڑی حویلی بنا رکھی تھی، ساتھ ساتھ آموں اور مالٹے کے باغات لگائے گئے تھے۔ مہر سلیمان، شیخ عبدالحمید مگوں، شیخ حمید چنیوٹ والے، اس کی بیوی مہہ جبیں، چوہدری نواز بھنڈر، مرزا ابو الحسن، اس کی بیوی سائرہ وہ علاقے کا ایس پی تھا۔ مسعود صاحب ایڈیشنل کمشنر، ڈاکٹر بٹ صاحب سب بڑے بڑے بیوروکریٹ اور تاجر تھے، سب جرائم پیشہ اکٹھے ہو کر اپنی اپنی بیویوں کو تیار کر کے بڑے سے لان میں بیٹھے تھے۔ اتنے میں لالی نے ان کے ساتھ خود بھی وسکی پی۔ پھر قرعہ اندازی کی جس جس کے ہتھے جو جو عورت آئی لے کر کمرے میں رنگ رلیاں منانا شروع ہو گئے۔ کمرہ نمبر ۱، ۲، ۳ سے لے کر ۱۰ تک سب میں بکنگ ہو گئی۔ سیٹھ حمید مگوں جو کہ مُردوں کے ڈھانچوں کی ایکسپورٹ کا بہت بڑا اسمگلر تھا، اس نے قرعہ اندازی پر اعتراض کیا کیونکہ کمرہ نمبر ۱۰ اس کو ملا تھا۔ اس میں کمشنر کی بیوی نوشابہ تھی۔ لالی پھر خود نوشابہ کے کمرے میں گیا۔ وہ میک اپ کر کے بالکل تیار بیٹھی تھی۔ لالی نے کہا کہ میں امپائر ہوں۔ یہاں اب میری باری ہے۔ نوشابہ کے ساتھ اس کا جھگڑا ہوتا ہے وہ کہتی ہے کہ تم کو جیل بھیج دیں گے جاو اپنی امپائری کرو لیکن لالی کہتا ہی کہ جب کرنا ہی غلط کام ہے تو میری باری کیوں نہیں آئے گی۔ آخر میں امپائر ہوں۔ یہاں کوئی قاعدہ قانون نہیں ہے بلکہ ساتھ والے کمروں میں قانون کے رکھوالے قانون سے کھلواڑ کر رہے ہیں۔ نوشابہ لالی کو دھمکی دیتی ہے

کہ تیرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے نہر میں بہا دیا جائے گا پر وہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ ناول کا موڑ بڑا اہم ہے کہ شہر کے بڑے افسر کی بیوی ایک جرائم پیشہ کے ہاتھوں بلیک میل ہو رہی ہے۔ نوشابہ اسے کہتی ہے کہ یہ بے غیرتی نہیں بلکہ چند بڑوں کا ایک خفیہ کلب ہے۔ ہر بندہ اپنی بیوی کے بغیر نہیں آ سکتا اور تم کلب کے ممبر نہیں ہو۔ ہم نے پلیئیر ہاؤس (Pleasure House) اس لیے بنایا کہ مرد اور عورت جب چاہیں رنگ رلیاں منائیں کیونکہ یورپ اور امریکہ میں بھی ایسے پلیئیر ہاوس ہیں وہاں عورتیں جس مرد کو چاہیں اپنی خوشی سے ہر اچھا بُرا کام کر سکتی ہیں۔ لالی اسے یہ کہتا ہے کہ یہ تو کھلی بے غیرتی ہے۔ خیر شیخ مگوں کو لالی نے اجازت دی کہ وہ نوشابہ کے پاس کمرے میں چلا جائے جاتے ہوئے لالی نے شیخ مگوں کی نوٹوں بھری جیب خالی کر دی۔ اس منظر کو ناول نگار شوکت صدیقی نے اس طرح پیش کیا ہے:

> ”سیٹھ حمید میں نے تیری جیب سے بٹوا نکال لیا ہے۔ تو مجھے رشوت دے رہا تھا نا۔ یہ رہا تیرا بٹوا۔ اس نے پرس حمید کو دکھایا۔ حمید گھبرا گیا۔ نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا بٹوے میں پانچ ہزار سے بھی زیادہ روپے ہیں۔ تم اتنے پیسے نہیں لے جا سکتے۔ لالی نے ہنس کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ حمید تو بنئے کا بنیا ہی رہا۔ تیرے پاس بانکی مٹیار چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ پانچ ہزار کیا پانچ لاکھ بھی کم ہیں اگر یہ مانگے تو اس کا سر کاٹ کر ہتھیلی پر رکھ دوں آزما لے نوشابہ پھر نہیں ملوں گا چاہنے والے تو تو نے بہت دیکھے ہیں مرنے والا بھی دیکھ لے“۔[۸]

یہ ہیں وہ جرائم جو ہمارے بڑے کرتے ہیں۔ یہاں پر ایک ٹرین کے حادثے والا واقعہ بھی ہوا تھا۔ اس میں بھی شوکت صدیقی نے سچ لکھا ہے کہ ہسپتال میں کوئی ایمبولنس نہیں جو کہ زخمیوں کو ہسپتال لے جا سکے۔ کوئی سینئر ڈاکٹر نہیں بس جگاڑ سے کام چلایا جا رہا ہے۔ عوام کو کا کوئی پرسان حال نہیں بڑے لوگ جن کی ذمہ داریاں تھیں عیاشی میں پڑے ہیں۔ ناول نگار نے یہ ایک خاص تصویر لی ہے کہ جن لوگوں کی ذمے عوام کے جان و مال کے تحفظ کی ذمہ داری ہوتی ہے انہیں غافل نہیں ہونا چاہیے۔ لیکن دیکھنے میں آ رہا ہے اکثر یہی لوگ غفلت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک شعبہ دوسرے پر ذمہ داری ڈال دیتا ہے جبکہ بڑا چھوٹے پر ذمہ داری ڈال کر خود کو بری الذمہ سمجھتا ہے۔ سرگودھا کے ڈی ایچ کیو اسپتال میں آکسیجن ختم ہونے سے چھے بچے دم توڑ گئے / انکوائریاں ہوئیں لیکن آخر میں صرف دو جونیئر سٹاف کے لوگوں پر بات آئی۔ بڑے سب بچ گئے۔ سکھر میں کتے کے کاٹنے کی وجہ چار لوگ سرکاری ہسپتال میں گئے لیکن وہاں ویکسینیشن نہیں تھی جو کتے کے کاٹنے پر لگائی جاتی ہے۔ مجبور عوام کو پرائیویٹ دوا خریدنا پڑتی ہے۔ لاہور میں ینگ ڈاکٹر نے اپنے احتجاج میں انکشاف کیا کہ لاہور کے سرکاری ہسپتالوں میں زائد المیعاد ادویات کا استعمال بھی ہوتا ہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کو فکشن کی صورت

میں ناول نگار بیان کرتا ہے۔ نظام کو ٹھیک کرنا حکومت کا کام ہے۔ اپنے فرائض سے غفلت مجرمانہ رویہ ہوتا ہے جو کہ جرم ہوتا ہے۔

iv۔ رحیم داد کا حکیم نذر محمد چشتی کو قتل کرنا:

رحیم داد جنگل میں چھپا ہوا تھا کیوں کہ پچھلی رات پولیس مقابلہ ہوا تھا اور یہ مشہور ہو گیا تھا کہ لالی مر گیا ہے لیکن حقیقت کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ رحیم داد پھر اپنی جگہ غار میں جا کر چھپ گیا۔ دوسرے دن جب دھوپ نکلی تو وہ بھوک کے مارے باہر آ کر پانی کی تلاش میں نکلا اسے کہیں پانی نہ ملا۔ پھر اس کو حکیم نذر محمد چشتی صاحب مل گئے۔ حکیم صاحب جنگل سے جڑی بوٹیاں اکٹھی کر رہے تھے۔ حکیم صاحب نے جب رحیم داد کو دیکھا تو پوچھا کہ تم کون ہو۔ رحیم داد نے سچ سچ بتا دیا کہ میں رحیم داد ہوں اور میرا ساتھی اور میں منٹگمری جیل سے بھاگے ہوئے قیدی ہیں۔ حکیم صاحب نے اس کو ٹوبھے سے پانی پینے سے روکا۔ حکیم صاحب نے سمجھایا کہ ٹوبھے کا پانی پینے سے بندہ بیمار ہو جاتا ہے۔ آپ میرے ساتھ کھانا کھائیں اور میرا پانی پئیں۔ حکیم صاحب نے کھانا کھانے کے بعد رحیم داد کو بتایا کہ السی، سداب، حرمل، کاسنی، کلتھی، منڈی، کچری، بھتوا اور شاترا کارآمد بوٹیاں ہیں۔ رحیم داد نے حکیم صاحب کی تعریف کی اور کہا کہ حکیم صاحب آپ نے تو اپنی عمر میں محنت کی ہے تو آپ بہتر جانتے ہیں۔ ورنہ لوگ تو ان بوٹیوں کو فضول سمجھ کر تلف کر دیتے ہیں۔ اتنے میں حکیم صاحب پر مرگی کا دورہ پڑا وہ لڑکھڑایا اور دھڑام سے زمین پر گرا۔ اس کے منہ سے جھاگ نکلنا شروع ہو گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے حکیم اللہ کو پیارا ہو گیا۔ سوائے رحیم داد کے وہاں جنگل میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے جلدی جلدی جیل کی وردی اتاری اور حکیم کے کپڑے اتار کر خود پہن لیے اور اپنی جیل کی وردی کو حکیم کو پہنا دیا۔ حکیم کا جسم ابھی حرکت کر رہا تھا۔ رحیم داد نے پتھروں سے اس کے چہرے اور جسم کو مسخ کر دیا۔ اس جرم کی داستان کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ”رحیم داد نے جھٹ قریب پڑا ہوا ایک بھاری پتھر اٹھایا اور حکیم کے چہرے کی جانب پھینکا۔ نشانہ ٹھیک بیٹھا۔ حکیم کے حلق سے گھٹی ہوئی آواز نکلی اور خاموشی میں ڈوب گئی۔ اس کا چہرہ بھاری پتھر سے کچلنے کے بعد بری طرح مسخ ہو گیا۔ نہ آنکھیں نظر آ رہی تھیں، نہ ناک اور کان۔ اس کا پورا چہرہ گوشت کا کٹا پھٹا لوتھڑا بن گیا تھا۔ حکیم کا جسم ذرا دیر تک پھڑکتا رہا پھر ٹھنڈا پڑ گیا“۔[۹]

حکیم کے قتل کے بعد اس کی لاش کو اسی جھاڑی کے نیچے چھوڑا جہاں انہوں نے روٹی کھائی تھی۔ اس کے بعد رحیم داد نے اس کا ناشتے دان، تھرماس، ٹوپی اور موٹے شیشوں والی عینک پہن لی۔ پھر وہاں سے رفو چکر ہو گیا۔ پولیس آئی اس نے لاش کا معائنہ کیا۔ جگہ کو دیکھا اور اس کیس کو ایک جیل سے بھاگے ہوئے قیدی کا

اندھا قتل قرار دیا۔ جیل میں جرائم پیشہ قیدیوں کے ساتھ رہنے کے باعث رحیم داد جرائم کی دنیا کے بارے میں بہت سارے گُر اور حربے جان گیا تھا۔ اس لیے اس نے حکیم کے قتل میں ایسی کوشش کی کہ یہ ایک اندھا قتل ہی ثابت ہو تو وہ ہوا۔ شوکت صدیقی نے یہاں پر اس کے قتل کا ذمہ دار رحیم داد کے ڈر کو کیا ہے. شاید مرگی کے دورے کے بعد حکیم صاحب ٹھیک ہو جاتا ہے لیکن رحیم داد نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور بھاری پتھر سے اس کا کام تمام کر دیا۔ وہاں کوئی اور انسان موجود بھی نہیں تھا۔ ناول نگاروں نے فیودر دوستوفیسکی کے ناول (Crime and Punishment) یعنی "جرم و سزا" کو عالمی ادب کا کوہ نور ہیرا قرار دیا ہے۔ اس نے بڑھیا کے قتل کے منظر کو جو بیان کیا ہے ویسے ہی شوکت صدیقی بھی اس ناول میں منجھے ہوئے کرائم رپورٹر ثابت ہوئے ہیں۔ دوستوفیسکی نے جو نقشہ کھینچا ہے وہ درج ذیل ہے:

> "اسی وقت رسکول نی کوف نے پوری طاقت سے دوسرا وار کیا۔ کلہاڑی کے کند والے حصّے ہی سے اور پھر کھوپڑی ہی پر۔ خون اُبل پڑا، جیسے لڑھکتے ہوئے گلاس میں سے بہہ رہا ہو اور دھڑ زمین پر چت کرنے لگا۔ رسکول نی کوف پیچھے ہٹ گیا، اس نے اسے گرنے دیا پھر فوراً ہی جھک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ مر چکی تھی۔ آنکھیں مارے اچھنبے کے لگ رہا تھا کہ باہر نکلتی آ رہی ہیں، جیسے نکل پڑنا چاہتی ہوں، ماتھا اور سارا چہرہ کھنچ گیا تھا اور تشنج میں اینٹھ سا گیا تھا"۔[۱۰]

شوکت صدیقی نے بھی اسی طرح کا نقشہ کھینچا ہے۔ شوکت صدیقی نے قتل کی واردات کو جنگل میں دکھایا ہے۔ جنگل میں آلۂ قتل پتھر ہے اور دوستوفیسکی نے قتل کی واردات کو شہر پیٹر برگ میں دکھایا ہے اور آلۂ قتل کلہاڑی ہے۔ دوستوفیسکی نے منظر میں لڑھکتے ہوئے گلاس سے تشبیہ دی ہے جبکہ شوکت صدیقی نے چہرہ گوشت کٹا پھٹا لوتھڑا دکھایا ہے۔ قتل کے وقت دونوں قاتلوں کے سانس پھولے ہوئے ہیں اور دونوں گھبراہٹ کی وجہ سے اِدھر اُدھر دیکھ رہے ہیں۔ دونوں ذرا سی آہٹ سے ڈر جاتے ہیں۔ لیکن اپنا کام پورا کرتے ہیں۔ شوکت صدیقی اور دوستوفیسکی کی نفسیاتی گرپ پوری پوری ہے یعنی اگر کوئی بندہ جرم کرتا ہے تو دل کی دھڑکن زور زور سے دھڑک رہی ہوتی ہے۔ خوف خدا کم جبکہ دنیا کا خوف زیادہ ہوتا ہے کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ کسی کو پتہ نہ چلے۔ اس کے بعد رحیم داد نے نوردین رسہ گیر کی بیوی راجَو کو زمیندار کی قید سے آزاد کرایا اور اس راجو اور اس کے خاوند نوردین کو رات کے اندھیرے میں منزل مقصود تک پہنچایا۔ جرائم پیشہ لوگوں میں ایک چیز مشترک ہوتی ہے کہ وہ مخلوق کی خدمت بھی کرتے ہیں تاکہ لوگ انھیں غریب کا حامی کہیں۔

v۔ ڈھولا امیر خان میں سلدیرے کے جرائم:

رحیم داد رات کے اندھیرے میں گاؤں ڈھولا امیر خان پہنچتا ہے۔ گاؤں کے شروع میں قبرستان آتا ہے۔ رحیم داد وہیں رک گیا۔ آگے سے ایک دکھی شخص ملا جس نے اسے روٹی کھلائی اور اپنی داستان رحیم داد کو بتائی۔ اس کا نام دلدار تھا اس کا چھوٹا بھائی ادریس تھا۔ دونوں بھائی اپنی زمینوں پر کھیتی باڑی کرتے تھے۔ گاؤں کا بڑا زمیندار عارف سُلدیرا تھا جس نے گاؤں میں قتل وغارت گری کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ کبھی وہ لوگوں کے مویشی اٹھوالیتا، کبھی لوگوں کو اپنے ڈیرے پر بلوا کر ان کی زمینوں پر قبضہ کر لیتا۔ ایک دن اس نے مجھے بھی ڈیرے پر بلوا کر اپنی زمین اس کے نام کروانے کو کہا، نہ کروانے کی صورت میں نتائج بھگتنے کا کہہ کر چلا گیا۔ میرا بھائی ادریس غصّے والا تھا اس نے سلدیرے کی دھمکی کی پرواہ نہیں کی۔ اتنے میں سلدیرے کے بیٹے کی شادی پر اس نے گاؤں والوں پر ٹیکس لگایا کہ ہر آدمی میرے بیٹے کی شادی پر دو دو بکریاں مجھے دے۔ ساتھ ہی اس کے کارندے گاؤں سے زبردستی بھیڑ بکریاں اکٹھی کرنا شروع ہو گئے۔ ہم نے کچھ نہیں دیا۔ سلدیرے نے افسروں کے ساتھ مل کر پہلے میری زمین شاملات دیہہ میں شامل کرائی پھر اس پر قبضہ کر لیا۔ ایک دن رات کو ہم دونوں بھائی کہیں جا رہے تھے تو سلدرے کے بندوں نے میرے بھائی کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے اور گاؤں کے ایک درخت کے ساتھ اس کی لاش کو لٹکا دیا۔ پھر بعد میں پنڈ کے بزرگوں نے منت کی کہ اس کی لاش سے بدبو آرہی ہے اب یہ مر گیا ہے تو تیرا غصہ کیوں نہیں ٹھنڈا ہو رہا ہے۔ پھر جا کر اس نے لاش کو دفنانے کی اجازت دی۔ اس جرم کے واقعے کو شوکت صدیقی نے یوں لکھا ہے۔ ناول میں جُرم کی حقیقت اس طرح ہے کہ کلیجہ منہ کو آتا ہے:

> ”ادھر کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا۔ ادریس آگے آگے چل رہا تھا مجھ سے کوئی تیس چالیس قدم آگے آگے چل رہا تھا۔ اچانک شفیع سلدیرا، سکندر کھنڈ اور نادر دین دار ایک گلی سے نکلے اور ادریس پر کلہاڑیوں اور گنڈاسوں سے حملہ کر دیا۔ ادریس خون میں لت پت پڑا تھا اور قاتل ہوائی فائرنگ کرتے، کلہاڑیاں لہراتے صاف نکل گئے۔ وہ ادریس کی لاش لے گئے۔ سلدرا کے حکم پر اسے پنڈ کے بیچوں بیچ ایک درخت سے لٹکا دیا گیا“۔[۱۱]

یہ تھا وہ حال جو شوکت صدیقی نے اپنے ناول جانگلوس میں بیان کیا۔ یہ وہ مظالم یا جرائم ہیں جو ہمارے معاشرے کا حصّہ ہے کہ بڑا زمیندار علاقے کی پولیس اور افسروں سے مل کر دوسروں کی زمین اور مال مویشی پر قبضہ کرتے ہیں اور اگر کوئی بات نہیں مانتا تو اسے قتل بھی کروا دیتے ہیں۔ جیسے ادریس کو صرف اس لیے قتل

کرایا کہ وہ اپنی زمین عارف سلدیرے کے نام نہیں کرا رہا تھا۔ الٹا اس نے اس کے بھائی دلدار کو مویشی چوری کے جھوٹے کیس میں پھنسا کر جیل بھجوا دیا۔ اس کی بیوی کو اپنے بیٹے کی شادی پر کنجریوں کے ساتھ ناچنے پر مجبور کیا جس سے وہ پکی ناراض ہو کر ملتان کے بازار حُسن میں کنجری بن کر بیٹھ گئی۔ پاکستان میں ابتدائی کرپشن جعلی زمین کے کلیم سے ہوئی۔ یہ پاکستان بننے کے دوسرے مہینے ہی شروع ہو گئی اور اب تک جاری ہے۔

بڑے بڑے زمین دار جعلی کلیم کی زمینوں پر حکمرانی اور سیاست کر رہے ہیں۔ ان کے ہر قسم کے جرائم نے پاکستان کو اپنی لپیٹ میں لیا ہوا ہے۔ شوکت صدیقی منٹگمری میں تین سال آتے جاتے رہے تھے۔ جب انہوں نے یہ ناول لکھا انہوں نے پنجاب کے ان علاقوں کی معاشرت اور جرائم کو بڑی باریک بینی سے لکھا ہے۔ جب رحیم داد چوہدری نورالٰہی کا گلا دبا کر ہلاک کرتا ہے ساتھ ہی اس کی زمین کے کاغذات لے کر رفو چکر ہو جاتا ہے۔ حالانکہ چوہدری نورالٰہی کے بقول یہ کاغذات اصلی نہیں تھے۔ بغل میں دبا کر وہاں سے نکل کر تخت ہزارہ کی طرف نکل جاتا ہے۔ راستے میں اپنے پہلے مقتول حکیم چشتی کے کپڑے ایک کھیت میں دبا دیتا ہے۔ پھر وہاں سے دوسرے علاقے کی راہ لیتا ہے۔

vi۔ مزارع کی بیوی کا اغوا:

رحیم داد دھکے کھاتا ہوا دیپالپور کے علاقے میں چلا جاتا ہے وہاں اس کو ہر کوئی چوہدری کہتا ہے۔ ناول اب دوسرے باب میں داخل ہوتا ہے۔ یہاں پر انوکھے کردار ہیں جو شوکت صدیقی نے ڈالے ہیں۔ یہاں زمیندار کی بیوی جمیلہ اس کو بہت پسند آتی ہے جو کہ گاؤں کی ڈسپنسری اور ایک پرائیویٹ سکول چلا رہی ہے۔ ساتھ ساتھ زمینداری کے فرائض بھی خود ہی ادا کرتی ہے۔ رحیم داد اس لیے خوش ہے کہ وہ گاؤں کی فلاح کا کام کر رہی ہے۔ وہاں رحیم داد کے پاس ماجھا نام کا مزارع آیا اور کہنے لگا کہ چودھری جی مجھے آپ سے کام ہے۔ میں دور پنڈ سے آیا ہوں۔ چوہدری اللہ وسایا جس کا تو مہمان ہے بڑا اچھا آدمی ہے پر مجھے کام صرف آپ سے ہی ہے۔ رحیم داد کے پوچھنے پر وہ کام بتاتا ہے کہ علاقے کے زمین دار نے اس کی بیوی کو اٹھوا کر اپنے ڈیرے پر لے گیا ہے۔ زمیندار بڑا خطرناک آدمی ہے۔ اس کے مزارعے چوری کے مویشی چودھری کے حوالے کرتے ہیں۔ رحیم داد نے کہا کہ ہم تو اپنا بازو واپس لینے کے لیے پریشان ہیں۔ اس نے ہاں میں جواب دیا۔ ساتھ چودھری اللہ وسایا نے یہ کہا کہ چوہدری رحیم داد یہ زمیندار بڑا خطرناک آدمی ہے۔ پرائی عورتوں کو اغوا کر کے اپنی رکھیل بنا لیتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ اگر میں ایسا نہ کروں تو لوگوں پر میرا رعب نہیں جمے گا۔ لوگ میرے سامنے اکڑ کر چلیں گے۔ چودھری اللہ وسایا نے رحیم داد کو سمجھایا کہ چودھری تو ان چکروں میں نہ پڑ کیونکہ زمیندار بہت بڑا

جرائم پیشہ ہے۔ رحیم داد نے کہا کہ ماجھا بہت دکھیارا ہے۔ لہٰذا اس کی بیوی کو واپس اس کی قید سے رہائی دلانی چاہیے۔ ماجھے نے بتایا کہ پیر والا پنڈ کا زمیندار ہے، اس کا نام اس سید احسان شاہ ہے اور قوم کا سید ہے۔ ماجھے کو اس کا پورا نام بھی نہیں آتا تھا۔ وہ تو اللہ وسائے نے بتایا۔ مزید معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ شاہ جی نے کوٹھڑیاں بنائی ہوئی ہیں۔ جب وہ دورے پر نکلتا ہے جس زنانی پر بھی جی آتا ہے من کی پیاس بجھاتا ہے۔ اکثر نشہ کر کے آتا ہے۔ اس نے جوان رہنے کے لیے دلّی کے دو حکیم اپنے پاس ملازم رکھے ہیں جو اس کے لیے کشتے اور معجون وغیرہ تیار کرتے ہیں تاکہ شاہ جی اپنی موج میں لمبا وقت لگائیں۔ شاہ جی ہے زیادہ عمر کا لیکن سر پر خضاب لگا کر مونچھیں کالی کر کے گھوڑے پر بیٹھا جوان لگتا ہے۔ لیکن اندر سے کھوکھلا ہو چکا ہے۔ رحیم داد اس کو خط لکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن اللہ وسایا اس کو منع کرتا ہے کہ میری اس کے ساتھ لگتی ہے لہٰذا کوئی اور طریقہ اپناؤ۔ چودھری اللہ وسایا نے کہا کہ سارے پولیس افسر اور سرکار کے کارندے اس کے یار ہیں اور اس کی محل نما حویلی میں سخت مسلح لوگوں کا پہرا ہوتا ہے۔ شاہ جی سب پولیس والوں اور افسروں کو ولایتی شراب پلاتا ہے ساتھ سوہنی مٹیار لڑکی پیش کرتا ہے۔ ان لوگوں کے جرائم کی وجہ سے پورا علاقہ پریشان ہے لیکن لوگ زیادہ ڈر جاتے ہیں۔ ناول نگار نے یہاں جرائم کا سبب پولیس اور قانون نافذ کرنے والے اداروں کے اہلکار ہیں جو برابر کے شاہ جی کے جرائم میں حصّہ دار ہیں۔ اس مجرمانہ کلچر کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے:

> ''سارے ہی وڈے افسروں سے اس کی یاری دوستی ہے۔ ایم سی اے اور وزیر اس کی حویلی میں آکر ٹھہرتے ہیں۔ وہ انہیں ولایتی شرابیں پلاتا ہے۔ جوان اور سوہنی مٹیاریں پیش کرتا ہے۔ اللہ وسایا زیرلب مسکرایا۔ وہ شاہ جی کی مدد کرتے ہیں۔ شاہ جی وقت پڑنے پر ان کی مدد کرتا ہے۔ وہ اس کی سفارش پر کام کر دیتے ہیں۔ شاہ جی ان کے لیے اوپر تک سفارشیں پہنچاتا ہے۔ تبھی تو تھانیدار، تحصیلدار اور دوسرے افسر اس کی مرضی سے لگائے جاتے ہیں۔ ذرا اس کے خلاف کوئی کام کریں چھیتی ان کا تبادلہ کرا دیتا ہے''۔ [۱۲]

یہ تھی وہ داستان جو اپنے ناول میں شوکت صدیقی نے بیان کی ہے۔ شوکت صدیقی کی نفسیاتی حِس کمال کی ہے۔ کس طرح کہانی کو بنانے میں ہنرمندی کا ثبوت دیا ہے۔ پھر رحیم داد چودھری اللہ وسائے کو کہتا ہے کہ آج تک تو نے تو ایسا کام نہیں کیا۔ تم بھی تو زمینداری کرتے ہو۔ پھر دوسرے زمینداروں سے مختلف کیوں ہو۔ اس نے بتایا کہ میں ایسے کاموں کو حرام سمجھتا ہوں اس لیے بڑے زمیندار مجھ سے ناراض ہیں اور میری زمین ہتھیانے کے چکروں میں لگے رہتے ہیں۔ مجھے اپنی بیوی جمیلہ کی فکر لگی رہتی ہے۔ جتنی یہ سوہنی ہے اور اوپر سے

سمجھدار بھی کہ کوئی بڑا زمیندار اس کو بھی نہ اُٹھا کر لے جائے لیکن میں چھوٹا زمیندار ہوں اس لیے وہ یہ جرأت نہیں کرتے۔ زمینداروں کی عورتیں کام کاج نہیں کرتیں۔ ماجھے کی بیوی جیسی عورتیں اغوا کر کے ان سے کام کرواتے ہیں اور کھانے پینے کے لیے کم ہی دیتے ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی خوب صورت نکل آئے تو اِسے اٹھا کر لے جاتے ہیں جیسے شیر کٹا منہ میں دبا کر لے جاتا ہے۔ یہ ایسے لوگ ہیں جن کے جرائم نے اندھیر مچا رکھا ہے لیکن کوئی ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہے جو اس نظام کو درست کرے تا کہ غریب کے ساتھ زیادتی نہ ہو۔ حکمران خود چور ہیں جنھوں نے اس نظام کو خراب کیا ہے۔

vii۔ بلوچ قبائلی سرداروں کی نجی عدالتیں اور غیر قانونی فیصلے:

ناول کا ایک کردار سردار شہ زور خان مزاری ہے جو کہ ڈیرہ غازی خان کے علاقے کا سردار ہے۔ زنا، جوا، شراب اس کی پسندیدہ عادتیں ہیں۔ روزانہ چوڑے چکلے پلنگ پر بیٹھ کر اپنی کچہری لگاتا ہے اور لوگوں کے فیصلے کرتا ہے۔ کسی کو جرمانہ کر رہا ہے، کسی کو سزا دے رہا ہے تو کسی کو دریا میں چھلانگ لگوا کر مار دیتا ہے لیکن خود کو یہ سمجھتا ہے کہ اس کا انصاف بڑا اعلیٰ ہے۔ اس کے اپنے علاقے میں لوگ اس کی نجی عدالت میں مقدمے لے کر آتے ہیں دونوں فریقین کی بات کو سنتا ہے پھر قبائلی روایات جن کو قانون کا درجہ اس نے دے رکھا ہے اس کے مطابق فیصلے کرتا ہے۔ اس کی اپنی نجی جیلیں ہیں، اپنا پھانسی گھاٹ ہے جہاں لوگوں کو پھانسی دیتا ہے۔ عام طور پر وہ فریقین کے مابین صلح صفائی کروانے کی کوشش کرتا ہے۔ جرم سنگین ہو تو جرمانہ عائد کر دیتا ہے۔ اگر زیادہ سنگین ہو تو جرمانے کے ساتھ قید کی سزا بھی ہوتی ہے اور قید اس کی نجی جیل میں کاٹنا پڑتی ہے۔ سہراب اور مرجان کو اس نے اس لیے پھانسی دے دی تھی کہ وہ زناکار تھے۔ قبائلی زبان میں زانی اور زانیہ کو کالا اور کالی کہتے ہیں۔ لیکن سردار جس مرضی عورت کے ساتھ زنا کرے اسے مکمل استثنا حاصل ہے۔ وہ کالا نہیں ہوتا۔ کیونکہ وہ سردار ہے۔

ایک دن ماحول کی کچہری لگی ہے جس میں ایک بوڑھی عورت سردار مزاری کے ہاں اپنا مقدمہ پیش کرتی ہے کہ سائیں سرکار سدا خوش رہو۔ اللہ آپ کی سرداری کو ہمیشہ برقرار رکھے۔ سدا جیویں۔ سخی صحت ہوویں۔ میں لٹ گئی تباہ ہو گئی۔ میں بوڑھی ہوں اور بیوہ بھی ہوں۔ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے مجھے انصاف چاہیے۔ سردار مزاری کہتا ہے کہ آپ کے ساتھ پورا پورا انصاف ہو گا۔ پہلے بات تو بتا۔ پھر وہ اپنی داستان سناتی ہے کہ میری صرف ایک ہی بیٹی ہے جس کا نام ساوُنی ہے۔ اس کو چار روز سے اغوا کر لیا گیا ہے۔ اس کو بازیاب کرایا جائے۔ میں غریب عورت ہوں۔ سردار کے دریافت کرنے پر اغواکار کا نام بدھیل خان ہے اور یہ میرے گھر والے کا بھتیجا ہے۔ جب شہزور خان مزاری نے بدھیل کا نام سنا تو پریشان ہو گیا کہ یہ تو میرا وفادار ساتھی ہے

جو میری بات پر جان لڑا دیتا ہے۔ خیر بدھیل خان کو عدالت میں پیش کرنے کا حکم دیا گیا۔ دوسرے دن بدھیل خان بوڑھی عورت کے روبرو کچہری میں کھڑا تھا۔ سردار کے پوچھنے پر بتایا کہ ساونی کو اس نے اغوا نہیں کیا بلکہ وہ خود اس کے گھر آئی تھی۔ کیونکہ اس کی ماں دو ہزار روپے میں اس کو کسی بوڑھے سنار کے ہاتھ بیچنا چاہتی تھی اس لیے وہ میرے پاس آئی۔ میں نے اس کو اغوا نہیں کیا تھا۔ جبکہ بوڑھی عورت بار بار اپنے آنسو پونچھتی تھی ساتھ ساتھ یہ کہتی تھی کہ یہ رات کو اونٹ پر بیٹھ کر آیا تھا اور زور سے میری بیٹی ساونی کو اٹھا کر لے گیا۔ سردار نے کہا کہ اگر اس نے ساونی کو کالا کیا ہے تو دونوں کو پھانسی کی سزا ہو گی اور جرمانہ الگ سے ادا کرنا پڑے گا۔ دونوں طرف سے صفائیاں پیش ہونے لگیں۔ ساونی کو بھی پیش کیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں اپنی مرضی سے بدھیل خان کے گھر گئی تھی کیونکہ میری ماں مجھے بوڑھے زرگر کے ہاں فروخت کرنا چاہتی تھی۔ مجھے اس سے نفرت تھی۔ اب سردار روزانہ ساونی کے ساتھ زنا بھی کر رہا ہے۔ بدھیل خان کو رہا کر دیتا ہے۔ ساتھ جرمانہ یہ کرتا ہے کہ ساوئنی کی ماں کو اڑھائی سو روپے دے گا اور اڑھائی سو روپے عدالت میں جمع کرائے گا۔ اس کے علاوہ اس کو دو عدد سردار کو عورتیں بھی پیش کرنا پڑیں گی۔ جب تک بدھیل خان جرمانہ ادا نہیں کرے گا اس کی پندرہ سالہ بہن اور ماں سردار کی قید میں رہیں گی۔ ناول میں اس جرم زدہ فیصلے کی روداد اس طرح بیان کی گئی ہے:

> "بدھیل کو پانچ سو روپے جرمانہ ادا کرنا ہو گا۔ جرمانے کی رقم میں اڑھائی سو روپے ساونی کی ماں کو تاوان کے طور پر دیا جائے گا۔ چٹی کے قانون کی رو سے بدھیل کو ساونی کی طرح کی دو عدد جوان ننگر رن پیش کرنی ہو گی"۔(۱۳)

یہ ہے وہ غیر قانونی فیصلے جو جاگیر دار، سردار اپنے علاقوں میں کرتے ہیں۔ کسی کو سرکار کی عدالت میں جانے کی جرأت نہیں کہ وہ صحیح عدالت میں اپنا مقدمہ پیش کر سکے۔ زمیندار اگر کسی مزارع کو ادھار بھی دیتے ہیں تو اس کی زمین یا گائے بھینس اپنے پاس بطور ضمانت رکھ لیتے ہیں یا پھر نائی، موچی، ترکھان کو سالانہ گندم بھی مزارع کے حصّے سے دی جاتی ہے۔ ان پر طرح طرح کے ٹیکس لگائے جاتے ہیں جیسے ناول میں غیر قانونی ٹیکسوں کی تفصیل کچھ یوں ہے اور یہ ہمارے سماج کے جرائم ہیں۔

> "آدھا مالیہ یہ بھی راہک کو دینا پڑتا ہے۔ اس کے علاوہ طرح طرح کے ٹیکس ہیں جو زمیندار کو دینے ہوتے ہیں۔ در ٹیکس، کھڑ کی ٹیکس، ککڑ ٹیکس، حج ٹیکس، مونڈن ٹیکس، پرنا ٹیکس، مرن ٹیکس، کتنے ہی تو ٹیکس ہیں اور سارے ہی فصل کی واڈھی پر زمیندار کو ادا کیے جاتے ہیں"۔(۱۴)

viii۔چوہدری اللہ وسایا کا قتل:

رحیم داد کافی عرصہ سے چوہدری اللہ وسایا کا مہمان بنا ہوا تھا۔ پیر والہ میں اس کی بڑی زمینداری تھی۔ اس کے گھر والی جمیلہ بڑی خوبصورت تھی۔ وہ فلاحی کام جیسے گاؤں میں اسکول، ڈسپنسری بھی چلاتی تھی۔ زمیندارا کا سارا کنٹرول اس کے پاس تھا۔ رحیم داد نے مرحوم چودھری نورالٰہی کے کلیم کے کاغذات اسے دکھا کر وکیل کے ذریعے جعلی دستخط کر کے کئی مربعے اراضی کا مالک بن گیا تھا۔ ایک دن اس کا دوست دارا بھی آیا۔ اس نے رحیم داد کو پہچان کر ساری باتیں چودھری اللہ وسایا کو بتائیں کہ تیرا چودھری پہلے ہی جیل سے بھاگا ہوا ہے اور اس نے دو بندوں کو قتل بھی کیا ہوا ہے۔ کچھ دنوں سے چوہدری اللہ وسایا کی ہوا بھی بگڑی ہوئی تھی۔ اس بات کا ذکر رحیم داد نے اپنے جاگیر دار دوست احسان شاہ سے کیا تو احسان شاہ نے کہا کہ ہم منصوبہ اس طرح بناتے ہیں کہ پہلے دارا سے اللہ وساہا کو قتل کراتے ہیں پھر دارا کو بھی قتل کرا دیا جائے گا تا کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ رحیم داد نے بھی اس سے اتفاق کیا۔ ان کی اس منصوبہ سازی کو شوکت صدیقی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

> ”احسان شاہ رحیم داد کی جانب متوجہ ہوا۔ چودھری تو اس کی فکر نہ کر اللہ وسایا کو کس طرح صاف کیا جائے؟ کیسے اس کا قتل ہو گا؟“ یہ تو مجھ پر چھوڑ دے۔ وہ اپنی بات کہتے ٹھنکا“۔ (۱۵)

احسان شاہ نے رحیم داد کو کہا کہ اگر تو اس کو ٹھکانے نہیں لگائے گا تو ایک دن تو خود ٹھکانے لگ جائے گا کیونکہ وہ پہلے بلیک میل کر کے تیری زمین ہتھیائے گا پھر تجھے جیل بھجوائے گا۔ دارا نے پولیس سے بچنے کے لیے چودھری سے پانچ سو روپے مانگے تھے۔ رحیم داد نے اس کو اللہ وسایا کے قتل کے بدلے ایک ہزار روپے دینے کی پیشکش کی اور ساتھ یہ بھی کہا کہ قتل کے وقت وہ اکیلا نہیں ہو گا۔ اس کے ساتھ کچھ اور بندے بھی ہوں گے۔ دارا پہلے گھبرایا پھر اس نے حامی بھر لی۔ رحیم داد نے کہا کہ ہاشم، شیدا اور دینا بھی تیرے ساتھ ہوں گے۔ رحیم داد اندر سے خود بھی خوفزدہ تھا کہ اگر مجھے اللہ وسایا پناہ نہ دیتا تو میں آج بھی یہاں ہی جیل میں ہوتا۔ سیف اللہ، حکیم نذر محمد چشتی، چودھری نورالٰہی اور مولا داد کے قتل میں نے کیے ہیں۔ رحیم داد کے ذہن میں بڑے عجیب خیالات آ رہے تھے۔ لیکن چودھری اللہ وسایا کو قتل کا اصل منصوبہ ساز احسان شاہ تھا۔ یہاں قتل کا سبب ناول میں زمین اور ڈر دو چیزیں ہیں۔ ایک تو رحیم داد کو زمین کھو جانے کا ڈر ہے دوسرا اپنے پکڑے جانے کا خوف بھی ہے۔ جمیلہ کی محبت بھی برابر اس کو ستاتی تھی۔ بار بار یہ خیال آتا تھا کہ اگر اللہ وسایا قتل ہو گیا تو زمین تو میری ہوئی، ساتھ جمیلہ بھی میری ہو جائے گی۔ کبھی یہ خیال بھی آتا کہ راتوں رات کوٹلہ ہر کشن چھوڑ دے اور راتوں

رات اندھیرے میں کہیں اور چلا جائے۔ لیکن دس مربع اراضی کا مالک اب جاگیر داری سے دستبر داری کے لیے تیار نہ تھا بلکہ زمیندار بن کر قتل کرانے کا ارادہ کر چکا تھا۔ احسان شاہ ساتھ کے گاؤں کا زمیندار تھا وہ بھی اللہ وسایا سے خار کھاتا تھا اور کئی بار اس کو مارنے کے منصوبے بنا چکا تھا۔ اس پر قاتلانہ حملے بھی کرا چکا تھا۔ لیکن اللہ وسایا ہر بار بچ نکلتا۔ اس بار انہوں نے اس کی گھوڑی کو رسی سے گرایا۔ پھر اس پر دو فائر کر کے قتل کر دیا۔ اس کی گھوڑی احسان شاہ نے غائب کر دی۔ گاوں میں شور مچ گیا کہ چودھری کو قتل کر کے نہر میں پھینک دیا گیا ہے۔ گاؤں کا ہر بندہ پریشان تھا۔ پولیس نے پوسٹ مارٹم کے بعد لاش ورثہ کے حوالے کر دی۔ قتل کے بعد رحیم داد نے جمیلہ سے شادی کر لی اور زمین بھی ہتھیالی۔ جمیلہ ہندو عورت تھی۔ ایک دن رات کو اس کے بھائی آ کر اس کو انڈیا لے گئے۔ شوکت صدیقی اپنی کہانی بیان کرنے میں اپنا ثانی کم ہی رکھتے ہیں۔ قتل کی لرزہ خیز واردات کو اس طرح بیان کیا ہے:

> ”سات آٹھ آدمی نکلے اللہ وسایا کی طرف تیزی سے بڑھے۔ ان کے چہروں پر ڈھاٹے بندھے ہوئے تھے۔ وہ بندوقوں، کلہاڑیوں، گنڈاسوں اور دوسرے خطرناک اسلحہ سے لیس تھے۔ انہیں دیکھ کر اللہ وسایا تڑپ کر چیخا، چودھری مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ ڈھاٹے باندھے ہوئے افراد چاروں طرف سے جھپٹے اور اللہ وسایا کو دبوچ لیا۔ ایک بار وہ زور لگا کر ان کی گرفت سے نکل گیا۔ تیزی سے پلٹا اور دوڑ کر فرار ہونے کی کوشش کی مگر پیچھے سے کسی نے گنڈاسے کا ایسا بھرپور وار کیا کہ اس کا تیز پھل کئی انچ اللہ وسایا کے سر کے اندر اتر گیا۔ اللہ وسایا کے حلق سے ہائے کی دل دوز آواز نکلی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا۔ اس کا چہرہ خون سے لت پت ہو گیا تھا“۔[١٦]

یہ وہ قتل کی منظر نگاری ہے جو ناول نگار نے بڑی عمدگی سے کی ہے۔ شوکت صدیقی کو عام طور پر لوگ جرم کی داستانیں بیان کرنے والا ناول نگار قرار دیتے ہیں۔ جرم کی داستان کو بیان کرنا دراصل ناول نگار کے ہاں جرم کی حوصلہ شکنی ہوتی ہے نا کہ اس کی حوصلہ افزائی۔ اسی طرح ماریو پوزو نے اپنے ناول ”گارڈ فادر“ میں کیا ہے۔ کہانی کے ہیرو کو گولی مار کر سڑک پر پھینک دیا جاتا ہے اور اخبارات نے لتھڑے ہوئے خون کے ساتھ اس کی تصویر کو فرنٹ پیج پر لگایا ہے۔ ”ڈون کارلیون کو گولی مار دی گئی۔ مبینہ گینگ لیڈر شدید زخمی۔ پولیس کی بھاری نفری کی حفاظت میں ڈون کا آپریشن گینگ وار کا خدشہ۔[١٧]

ماریو پوزوں اور شوکت صدیقی کے فکشن میں کتنا ابلاغ پایا جاتا ہے۔ جیسے جُرم کا واقعہ بیان کرتے ہوئے بھی فکشن اپنی اصلیت کھوتا نہیں ہے۔ وہ حقیقت سے قریب ہو کر بھی ناول کا مزا دے رہا ہے۔ لیکن جرم کی داستان بھی ساتھ ساتھ بیاں ہو رہی ہے۔ کیونکہ ڈاؤن پر حملہ یا فائرنگ اس وقت ہوئی جب وہ شام کو گھر واپس آ رہا تھا۔ ادھر چودھری اللہ وسایا کا قتل اس وقت یعنی شام کو ہوا جب وہ ڈاکٹر کے پاس جا رہا تھا تو واپسی پر حملہ ہوا اور وہ مارا گیا۔ دونوں ناول نگاروں کا جرم بیان کرنے کا وقت ایک جیسا ہی ہے کیونکہ شام کو اندھیرا ہو جاتا ہے اور اندھیرے کو ظلم بھی کہا جاتا ہے جبکہ دونوں کے قتل کا سبب پیسہ تھا۔ ڈاؤن کو پانچ گولیاں جبکہ چودھری اللہ وسایا کو ایک گنڈاسا اور دو گولیاں لگی تھیں۔ گارڈ فادر میں بلڈنگ کی اوٹ سے دو آدمی نمودار ہوئے۔ وہ گہرے نیلے رنگ کے ہیٹ پہنے ہوئے تھے جبکہ اللہ وسایا کے قاتل ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے۔ قتل کے وقت دونوں دوڑے اور چیخے۔ تقابل بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جرم تو جرم ہے جگہ اور ثقافت کا انداز بھی علیحدہ علیحدہ پر تکلف ہے۔ یا گارڈ فادر میں براسی کے قتل کا واقع ڈاؤن کو گولیاں مارنے سے ایک دن پہلے اس کی وفادار ساتھی براسی کو سولوزو نے اغوا کرایا۔ پھر اس کی گردن پر باریک نائیلون کی تار کا پھندا ڈال دیا۔ یوں ہی پھندا تنگ ہوا براسی کی آنکھیں باہر آ گئیں۔ چہرے اور گردن کی رگیں بری طرح پھول گئیں۔ اس کا چہرہ نیلا پڑ گیا۔ سولوزو اس کو گرتے ہوئے یوں دیکھ رہا تھا جیسے لیبارٹری میں نو عمر طالب علم اپنے کئے ہوئے تجربے کے نتائج کا مشاہدہ کر رہے ہوں۔ بعد میں وہ براسی کی لاش کو اس کی کار میں چھوڑ کر چلے گئے۔ پھر پولیس نے سارے معاملات کو ہینڈل کیا۔ اسی طرح چودھری اللہ وسایا کی بندوق اس کی لاش پر پھینک دی گئی تاکہ جائے وقوعہ سے معلوم ہو کہ وہ دوران مزاحمت مارا گیا اور لاش نہر میں بہا دی گئی۔

ix۔ جمال دین کا اپنی بیوی اور اس کے آشنا کو قتل کرنا:

رحیم داد ٹرین میں سفر کر رہا تھا تو اچانک ایک اسٹیشن پر ٹرین رُکی اور چل پڑی۔ رحیم داد تھکا ہوا تھا۔ سو گیا اور اس نے بتی بند کر دی۔ وہ گہری نیند سو گیا۔ اتنے میں اچانک جمال دین اس کے کمرے میں داخل ہو کر اندھیرے میں ایک طرف بیٹھ گیا۔ جب رحیم داد کی آنکھ کھلی تو اس نے کمرے کے بلب کو آن کیا تو ساتھ ہی خوف زدہ ہو گیا کہ اس کے سامنے کمرے میں جمال دین کھڑا تھا۔ اس نے اس کو پہچان لیا۔ یہ جمال دین ہی تھا جس نے اس کے حق میں کلہاڑی اٹھائی تھی اور سیف اللہ اور اس کے بھائیوں سے مسلح تصادم کیا تھا۔ رحیم داد گھبرا رہا تھا کہ یہ مجھے پہچان نہ لے۔ رحیم داد کے پوچھنے پر اس نے کہا کہ میں اگلے اسٹیشن پر اُتر جاؤں گا۔ رحیم داد نے اس کو دھمکی دی کہ جلدی سے اُتر جاو ورنہ میں ٹرین کی زنجیر کھینچ دوں گا۔ جمال دین اس کے بچپن کا یار تھا

لیکن تھا واردا تیا۔ جمال دین نے فوراً چاقو نکال کر رحیم داد پر حملہ کر دیا۔ رحیم داد نے اپنا دفاع کرتے ہوئے اس سے چاقو چھین لیا اور ڈانٹ کر کہا کہ تو چور ہے یا کسی کا خون کر کے بھاگا ہے۔ لیکن اس نے کہا کہ مجھے معاف کر دے میں سب کچھ بتا دوں گا۔ رحیم داد نے چاقو کو ٹرین کی کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر گھنی جھاڑی میں پھینک دیا۔ اس پر جمال دین نے اطمینان کے ساتھ اسے کہا کہ میں کافی دنوں سے بھوکا ہوں۔ میں جھنگ میں سیدزادوں کے ہاں کام کرتا تھا۔ میرے گھر والی جس کا نام بلو تھا۔ میں اس کو بڑے چاؤ کے ساتھ بیاہ کر لایا تھا، وہ بھی میرے ساتھ کام کاج کرتی تھی۔ میں اکثر اسے زمینداروں کے ہاں چھوڑ کر شہر میں ان کے کام کے سلسلے میں کئی کئی دن کے بعد واپس جاتا تھا۔ میری عدم موجودگی میں ایک ملازم باری نے اس کے ساتھ یاری لگائی اور اس کو بھگا کر لے گیا۔ جب مجھے پتہ چلا تو میں نے اس کو بہت تلاش کیا۔ ایک دن مجھے ایک لاری والے نے بتایا کہ اس نے باری کو مجری گاؤں میں دیکھا ہے۔ میں وہاں پہنچ گیا تو میں نے باری کا گھر دیکھ کر اندھیرا ہونے کا انتظار کیا۔ پھر میں نے رات کو باری کے دروازے پر جا کر آواز لگائی۔ میرے سر پر خون چڑھا ہوا تھا۔ میں نے یوں ہی جب باری آنکھیں ملتا ہوا دروازے پر آیا تو میں نے چاقو کے وار کر کے اس کی انتڑیاں باہر نکال دیں۔ جب باری کا شور سن کر بلو آئی تو میں نے ادھر ہی اس کو پکڑ کر اس کا گلا کاٹ دیا۔ حالانکہ اس نے میری بڑی منت سماجت کی تھی۔ ادھر سے میں پولیس کے ڈر سے بھاگا ہوا یہاں آیا ہوں نا۔ لیکن میں نے تجھے پہچان لیا ہے۔ تو میرا دوست ہے بچپن کا رحیا لیکن رحیم داد نے کہا کہ میں تجھے بالکل نہیں جانتا، نہ ہی میرا نام رحیا ہے۔ تجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس واقعے کو جو قتل کی واردات ہے، شوکت صدیقی نے اپنے اس ناول میں کس طرح بیان کیا ہے:

> ”آدھی رات تک جھینگر میں چھپا رہا۔ جب ہر طرف سناٹا چھا گیا تو میں پنڈ میں داخل ہوا۔ باری کے گھر پر پہنچا۔ دروازے پر کھڑے ہو کر ہانک لگائی۔ وہ آنکھیں ملتا ہوا باہر آیا۔ میں نے دیکھتے ہی اس پر حملہ کیا۔ پورا چاقو اس کے پیٹ میں اتار دیا۔ وہ زمین پر گر پڑا۔ میں نے دوسرا وار کیا تو اس کی ساری انتڑیاں پیٹ سے نکل کر باہر آ گئیں۔ بلو کا کیا بنا؟ رحیم داد نے دلچسپی کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔ باری نے زخمی ہونے کے بعد شور مچایا تو وہ باہر آ گئی۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ لیا۔ اس نے بہت منت کی پر میں نے اِسے نہیں چھوڑا۔ زمین پر گرا کر اس کا گلا کاٹ ڈالا“۔ (۱۸)

ناول میں اس دوہرے قتل کے جُرم کو شوکت صدیقی نے بڑی مہارت سے سمویا ہے۔ اس کے پیچھے جو سبب ہے وہ جمال دین کی غیرت ہے۔ اس نے اپنی انا کا بدلہ لینے کے لیے دوسرا اس کی بیوی نے یہ جو باری کے ساتھ بھاگ کر آئی تھی اس کا بھی کام جوش انتقام میں تمام کیا۔ شوکت صدیقی جرم کو بیان کرنے میں اپنا ثانی

نہیں رکھتے۔ یہی اس ناول نگار کی شان ہے۔ جس طرح روسی ناول نگار میکسم گورکی اپنے ناول ماں میں ایسی ہی لرزہ خیز وارداتوں کو بیان کرنے کے ماہر ہیں۔

> "ایک پولیس والے نے اپنے موٹے سے ہاتھ سے گریبان پکڑ کر اسے جھٹکے دیئے۔ "خاموش" اس کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ ایک لمحے کے لیے اس کے دل پر خوف کا تند دھواں چھا گیا لیکن جرأت اور بے جگری کا شعلہ ایک بار پھر اس آب و تاب سے چمکا۔ اس نے دھوئیں کو نکال کر باہر کیا۔۔۔۔۔ یہ لوگ میری روح کو۔۔۔۔۔ میری زندہ روح کو قتل نہیں کر سکتے"۔ (۱۹)

ایک پولیس والا ایک بوڑھی عورت کو جو کہ ناول کی ہیروئن بھی ہے پکڑ کر اس کا سر زور سے جھٹکتا ہے اور خون جاری ہو جاتا ہے لیکن وہ انقلاب کی خاطر اپنی جان دینے کے لیے تیار ہے۔ خون جو اس کے جسم سے نکل رہا ہے وہ اس سے خوفزدہ نہیں ہے۔ بلو نے بھی خون میں لت پت جمال دین کے مقابلے میں بہت مزاحمت کی لیکن شہ رگ کٹنے سے اس کی مزاحمت دم توڑ گئی۔ میکسم گورکی نے بوڑھی عورت کو پیش کیا ہے جبکہ یہاں جوان عورت ہے لیکن مزاحمت برابر کی ہے اور واردات کا منظر بھی بڑا دردناک ہے۔

د۔ عبداللہ حسین کا ناول "قید" میں سماجی جرائم:

عبداللہ حسین نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ہی ناول "اداس نسلیں" لکھ کر کیا تھا۔ ان کے ناولوں میں جہاں رومانویت ملتی ہے وہاں عورت کے ساتھ مرد کا نامناسب رویہ استحصال اور سماجی ناانصافی کو بھی موضوع بحث لاتے ہیں۔ ان کے حق میں آواز بلند کرتے نظر آتے ہیں۔ مرد اگر مذہب، روایت، انا، رواج اور رسومات کی قید میں ہے تو عورت مرد کی قید میں۔ عبداللہ حسین ہر قسم کی قید کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے ناولٹ "قید" میں ایک عورت کے جرائم بڑی عجیب صورتحال اختیار کرتے ہیں۔ عورت اپنی محبت کو کھو دیتی ہے جس سے وہ بچے کو جنم دیتی ہے۔ وہ مر چکا ہوتا ہے۔ وہ ایک مولوی کا بیٹا ہے۔ اس کے علاوہ مولوی کی اور کوئی اولاد نہیں۔ کماد کے کھیت میں وہ بچے کو جنم دیتی ہے اور فجر کی نماز کے وقت مسجد میں مولوی کے پاس رکھتی ہے تاکہ وہ اپنے مرحوم بیٹے کی نشانی لے کر اسے پالے۔ لیکن مولوی ہے کہ ایک نمبر کا شیطان۔ اپنے تین ساتھیوں کو لے کر معصوم بچے کو پتھر مار مار کر مار دیتے ہیں۔ عورت جوش انتقام میں ان تینوں کو ایک ایک کر کے قتل کرتی ہے۔ بعد میں خود تھانے میں جا کر اپنے اوپر پرچہ کٹواتی ہے۔ اس کو پھانسی کی سزا ہوتی ہے لیکن وہ شروع سے لے کر آخر

تک اپنا منہ بند رکھتی ہے جبکہ جیل سپرنٹینڈنٹ اور اس کی بہن اس کو بولنے پر مجبور کرتے ہیں لیکن پھانسی کی آخری رات وہ جیل سپرنٹنڈنٹ کو کہتی ہے کہ وہ رکھوال گاؤں کے مولوی احمد شاہ صاحب کو ملنا چاہتی ہے۔

اس کی آخری خواہش پر شاہ صاحب کو بلایا جاتا ہے تو وہ اس مولوی کو اپنے بچے کے قتل کا مجرم ٹھہراتی ہے اور تینوں قتل جیسے جرم جو اس نے سرانجام دیے تھے ایک ایک کر کے سناتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ میں تو ازل سے پلید ہوں کیونکہ میں عورت ہوں۔ آپ پاک ہیں کیونکہ جرم کر کے بھی پاک ہے ہیں کیونکہ آپ مرد ہیں۔ کہانی کو وہ اس طرح سناتی ہے کہانی کی بنت سے ہی پتہ چلتا ہے کہ عبداللہ حسین ایک تجربہ کار ناول نگار ہیں۔ انھوں نے اپنے ناولوں میں جہاں اردو، پنجابی، انگریزی زبانوں کو استعمال کیا ہے وہاں وہ معاشرتی جرائم سے بھی پردہ اٹھاتے نظر آتے ہیں۔ ناول میں یہ بتایا گیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنا انتقام کسی سے لیتا ہے تو وہ اپنا انجام بھول جاتا ہے۔ جرائم کی دنیا ہی ایسی ہے جس میں معاشرتی اقدار مذہب اور درگزر کو ایک طرف رکھ دیا جاتا ہے۔ صرف اپنے شیطانی کام کی طرف توجہ دی جاتی ہے۔

i۔ پہلے قتل کی کہانی:

ناول کا ایک کردار پیر کرامت علی ہے جو عورتوں کے ساتھ استخارہ کے بہانے زنا جیسے جرم کرتا ہے۔ اکثر عورتوں کے ننگے جسم پر ہاتھ پھیرنا اس کا مشغلہ ہے۔ ایک دن ایک لڑکی نسرین کو برہنہ کر کے وہ اپنا جُرم کر رہا تھا تو اس کے بیٹے سلامت علی نے دیکھ لیا۔ باپ بیٹے کی طرف دیکھ کر شرم سے پانی پانی ہو جاتا ہے۔ وہ جہاں کھڑا ہوتا ہے وہیں پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنے بیٹے کو یہ کہتا ہے کہ بیٹا میں کوئی بُرا کام نہیں کرتا۔ یہ صرف استخارہ ہے۔ استخارہ۔ میں تو عورت کے قابل ہی نہی رہا۔ ایک عورت تھی رضیہ سلطانہ مجھے اس نے اس قابل نہیں چھوڑا۔ وہی میری مردانگی چھین کر لی گئی تھی۔ بیٹا باپ سے پوچھتا ہے وہ کون تھی؟ وہ کہتا ہے کہ وہ تو ایک قاتلہ تھی۔ بیٹا پھر حیرانی سے پوچھتا ہے، شاہ جی واقعی وہ ایک قاتلہ تھی؟ باپ کہتا ہے ہاں بیٹا اس کا بیٹا سلامت علی باپ سے کہتا ہے کہ مجھے اس کی حقیقت بیان کرو۔ آپ ہی کا سبق ہے کہ حقیقت کو معلوم کرنا چاہیے۔ یہاں عبداللہ حسین ناول میں کہانی کی تکنیک استعمال کرتے ہیں۔

کرامت علی اس کو یہ سناتا ہے کہ وہ کئی سال پہلے یعنی اٹھارہ برس قبل کی بات ہے ایک اسکول ٹیچر جو کہ ایک تعلیم یافتہ عورت تھی، نے جوشِ انتقام میں تین مردوں کو قتل کیا۔ قتل کا سن کر بیٹے کا کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔ وہ بڑے تجسس سے اس قصے کو سنتا ہے۔ قتل کے بعد وہ ملزمہ خود تھانے جا کر اپنے خلاف پرچہ کٹوا آتی ہے۔ پھر وہ گنگ بن جاتی ہے۔ ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالتی۔ اس کے علاوہ دوسروں کے پاس قتل کا کوئی

ثبوت نہیں۔ اسی دوران ایک اور عورت اپنے آشنا کو قتل کر کے عدم ثبوت کی بنا پر بَری ہو جاتی ہے لیکن رضیہ سلطانہ پھانسی کی سزا کی حقدار ٹھہرتی ہے۔ اس کا حال عبد اللہ حسین نے یوں بیان کیا ہے:

''سیشن کوٹ سے ملزمہ کو دوبار پھانسی سات سال قید بامشقت اور بیس ہزار روپے جرمانہ بصورت عدم ادائیگی چودہ ماہ اور دو ماہ مزید بامشقت کی سزا ہوئی''۔[۲۰]

یہ تھی وہ سزا جو ملزمہ کو سنائی گئی۔ جیل کا ہر شخص ہی پریشان تھا کہ اتنی پڑھی لکھی اور خوبصورت عورت آخر کیوں کر عدالت سے تعاون نہیں کر رہی۔ ایک روز اس کی بہن ملاقات میں اس کو یہ کہتی ہے کہ تم اپنے اوپر رحم کھاؤ۔ میرے ساتھ اور وکیل صفائی کے ساتھ کوئی بات کرو۔ تم میرے ماں باپ کی نشانی ہو۔ ہم دونوں بہنیں ایک دوسرے کے بال بچپن میں نوچتی تھیں۔ ایک دوسرے کے کپڑے اور بالیاں پہن لیتی تھیں۔ ایک دوسرے کے بالوں میں کنگھی کیا کرتی تھیں۔ جب وہ کچھ بولتی نہیں تو وکیل تین دن کی مہلت دیتا ہے۔ ساتھ اس کی بہن ممتاز سلطانہ کو کہتا ہے کہ اگر اس نے کوئی تعاون نہ کیا تو اس کو ہائی کورٹ سے بھی کوئی مدد نہیں مل سکتی۔ اس کی سیشن کورٹ کی سزا برقرار رہے گی۔ سو وہی ہوا۔ جیل میں لیڈی وارڈن ہیں جو اس کو نہلاتی اور کپڑے بدلتی ہیں۔ ایک دن اس نے کرامت علی شاہ جو اب پیر ہے ،اس وقت جیل وارڈن ہوتا تھا، سے کہا کہ تم فیروز شاہ کے دوست ہو۔ میں آپ کی پرانی ساتھی اور فیروز شاہ کی محبوبہ ہوں۔ جب کرامت علی شاہ اس کی یہ بات سنتا ہے تو مارے شرم کے اپنے دانت پیسنا شروع کر دیتا ہے اور اس کے منہ سے آواز نکلتی ہے ''رجو تم''؟ کرامت علی شاہ کی پریشانی رضیہ سلطانہ کی وجہ سے بہت بڑھ جاتی ہے کہ آخر یہ عورت کسی سے تعاون کیوں نہیں کر رہی۔ جُرم جو اس نے کیا ہے اخبارات پڑھ کر تو لگتا ہے جیسے یہ سلطانہ ڈاکو کی بیٹی ہے۔ یہ کرامت علی شاہ سے کہتی ہے کہ کل میری کوٹھڑی میں آخری رات ہے، میں اپنے بدن کا بوجھ ہلکا کرنا چاہتی ہوں۔ جاؤ اپنے گاؤں رکھوال کے احمد شاہ کو بلا کر لاؤ۔ وہ جا کر مولوی احمد شاہ جو کہ فیروز شاہ کا باپ تھا بلا کر لے آتا ہے اور ساتھ ہی قانونی کاروائی بھی مکمل ہو جاتی ہے۔ جب احمد شاہ پھانسی والی کوٹھڑی میں رضیہ سلطانہ کو ملنے آتا تو ہے وہ ادب سے بولتی ہے کہ شاہ جی میں نے آپ کو تکلیف دی۔ میں آپ کے سامنے اقبالِ جرم کرنا چاہ رہی ہوں۔

ناول کا یہ پہلو بڑا سنسنی خیز ہے اور بڑے بڑے ناول نگار جیسے دوستوفیسکی کا ''جرم و سزا'' اور برادرز کراما زوف ہے یا ماریو پوزو کا ''گارڈ فادر'' ہے یا مستنصر حسین تارڑ کا ''قلعہ جنگی'' ہے یا محمد الیاس کا ''برف'' ہے۔ ان تمام ناولوں میں قتل کی واردات کو بڑے ہی سلیقے اور سنسنی خیز انداز میں جرم کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ اسی طرح عبد اللہ حسین نے پہلے، دوسرے قتل کی فوٹو ایک تجسس آمیز انداز میں کی ہے۔ رضیہ سلطانہ کہانی کو اس طرح بیان کرتی ہے کہ شاہ جی آپ کو پتہ ہے کہ مراد ایک غریب کھیتوں میں کام کرنے والا مزدور تھا۔ جب کہ محمد علی گاؤں کا

ترکھان تھا دونوں کو قتل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ جب میں نے ان کے قتل کا ارادہ کیا تو ایک دیہاتی عورت کا روپ دھار کر تہمد باندھ کر کُرتا پہنا اور رکھوال گاؤں چلی گئی۔ مراد کو کھیتوں میں ایک دن کام کرتے ہوئے اکیلے دیکھ کر اس کے نزدیک جا کر درختوں میں چھپ گئی۔ وہ اس وقت ناشتہ کر کے درخت کے سائے میں لیٹ گیا تھا۔ اس کے لیٹے لیٹے میں نے ہلکا سا شور کیا۔ درختوں کے جھنڈ میں جب آواز پیدا ہوئی تو وہ دیکھنے کے لیے آگے آیا۔ ساتھ ساتھ وہ پنجابی ماہیے گا رہا تھا۔ پہلے مجھے خیال آیا کہ میں قتل کا ارادہ اگلے دن تک ملتوی کر دوں لیکن اب خون سر پر سوار تھا۔ مراد نے نزدیک آ کر میرے کھلے ہوئے تہمد سے میری گوری گوری ٹانگوں کو دیکھا تو اس نے اپنا تہمد بھی اتار دیا۔ ہم دونوں اس وقت بغیر تہمد کے تھے۔ اب مراد نے پوری مردانہ قوت سے مجھ پر جنسی حملہ کر دیا۔ میں نے پاس ہی اس کی پڑی ہوئی درانتی سے اس کے کچھ عضو خاص کاٹ دیے۔ پھر جب وہ گرا تو اس کی گردن درانتی سے کاٹ کر جدا کر دی۔ اپنا خون سے بھرا ہوا تہمد الٹا کر کے پہنا اور نہ ہی کسی نے مجھے یہ کام کرتے دیکھا۔ نہ میں نے کسی اور کو دیکھا۔ یہ تھا پہلا قتل جس کی منظر کشی عبداللہ حسین نے یوں کی ہے۔

> ”اس نے جو آخری چھلانگ لگا کر مجھے دبوچ لینا چاہا تو میں درانتی کا دندانے دار پھل اس کی ٹانگوں کے بیچ چڑھا دیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے دستے کو پکڑ کر جو اسے اوپر کھینچا تو آدھے پیٹ کو چیرتا ہوا چلا گیا۔ خون کا فوارہ پھوٹ پڑا۔ اس کے عضو کٹ کر ایک ایک نس سے لٹکنے لگے۔ اس کے منہ سے ایک چھوٹی سی ہولناک آواز نکلی اور اس نے دونوں ہاتھوں سے اپنے پیروں کو تھام لیا۔ اس وقت اس کے چہرے پر دکھ کی کوئی علامت نہیں تھی۔ صرف ایک حیرانگی کا تاثر تھا۔ جیسے ہی وہ زمین پر گرا میں نے درانتی اس کی گردن میں ڈال دی۔ درانتی اس کی گردن میں ایسی فٹ آئی جیسے بنی ہی اس مقصد کے لیے ہو۔ ایک ہی جھٹکے سے میں نے گلا کاٹ دیا“۔ [۲۱]

رضیہ سلطانہ کی باتیں سن کر مولوی احمد شاہ کانوں کو ہاتھ لگا کر کہتا ہے: لڑکی خدا کے حضور توبہ کر اور اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ رضیہ سلطانہ اس کی آواز کو تمیز کے ساتھ کاٹ کر کہتی ہے شاہ جی میں نے پہلے ہی عرض کی تھی آپ میرے جرم کی کہانی سنیں کیونکہ میں نے اقبال جرم نہ وکیل، نہ اپنی بہن، نہ جج صاحب کے سامنے کیا ہے۔ میں یہ اقبال آپ کے سامنے کر رہی ہوں تو آپ میری بات سنیں تاکہ میں اپنے گناہوں کو دھو سکوں۔ خدا کے لیے میری بات کو سنیں تاکہ میرے دل کو ابدی سکون ہو۔

ii۔ دوسرے قتل کی کہانی:

دوسرے قتل کی داستان یوں ہے کہ میں کافی عرصے سے ان بندوں کی ریکی کر رہی تھی۔ محمد علی ترکھان کی دکان پر بھی میرا اکثر جانا ہوتا۔ میں نے اسے بتایا کہ میں چک نمبر ۸۸ کی زمیندارنی ہوں۔ مجھے چار خوبصورت قسم کے پیڑے چاہئیں۔ میں نے آپ کے پٹیروں کی بڑی مشہوری سن رکھی ہے۔ ساتھ ساتھ میں اس کے اتنے قریب ہو جاتی کہ وہ دنیا کے ہر کام کو بھول کر توجہ صرف مجھ پر رکھتا۔ اس کا جسم مارے مردانگی کے تن جاتا۔ پیڑوں کے اوپر نقش و نگار بھی اس نے کر کے دینا تھا۔ رنگ و روغن کے پیسے میں نے سو روپے کی صورت میں اسے دیے تھے۔ اتنے پیسوں کو دیکھ کر اس کی آنکھیں پھول گئی تھیں۔ میں نے آنکھوں آنکھوں میں اس کو اپنا گرویدہ بنا لیا۔ اب اس کو پتہ چل گیا تھا کہ وہ ایک بڑی زمیندارنی ہے اور اس کا خاوند فوج میں لفٹیننٹ ہے۔ بڑی آسامی ہے۔ جب وہ میری چھاتی کی طرف دیکھتا تو دیکھتا ہی رہ جاتا۔ گویا کہ میرے عشق میں مبتلا ہو گیا ہے۔ دو چار دفعہ میں گھنٹوں گھنٹوں اس کے پاس بیٹھ کر باتیں تھی اور اس کے اوقات کار کو بغور دیکھتی رہتی۔ ایک دن میں نے دوپہر کو موقع پا کر اس کی دکان میں چلی گئی۔ علی محمد تہمد باندھے اوندھے منہ ہلکا سا سو رہا تھا۔ وہ پہلے ہی میری زلف کا اسیر تھا۔ چھے ماہ قبل اس کی شادی ہوئی تھی۔ اکثر دکان کے ساتھ ملحق اس کے مکان سے اس کی بیوی اور ماں کی آوازیں سننے کو ملتی تھیں۔ میری طرف دیکھ کر وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی چادر یہ کیا کر اتار دی کہ مجھے گرمی نے بے حال کر دیا ہے۔ مجھے ننگے سر اور کھلی ہوئی چھاتی کو دیکھ کر اس کا جسم تھر تھرانے لگا۔ اس کو اب اپنی خبر نہیں تھی کہ وہ کہاں ہے اور کیا کرنے جا رہا ہے۔ ظہر کی اذان میں ابھی دس منٹ باقی تھے۔ وہ میرے پیچھے ایسے بھاگا جیسے مرغا مرغی کے پیچھے بھاگتا ہے۔ میں نے اپنی ڈب سے چاقو نکالا اور تیزی سے اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ کیونکہ اب میں نڈر ہو چکی تھی۔ ایک قتل تو میں پہلے کر چکی تھی۔ علی محمد کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ وہ پیٹ پکڑ کر بیٹھ گیا۔ میں نے دوبارہ چاقو اس کی پسلیوں میں پھیر دیا۔ وہ اوندھے منہ گرا۔ اس کے منہ سے خون نکل رہا تھا۔ ناول نگار نے اس منظر کو یوں بیان کیا ہے:

> ”نظر بچا کر میں نے ڈب سے چاقو نکالا اور تیزی سے اس کے پیٹ میں گھونپ دیا۔ ایک تجربہ مجھے پہلے ہو چکا تھا۔ لہٰذا اس بار خون کے چھینٹے میں نے اپنے اوپر نہیں پڑنے دیے۔ دستے کو گرفت میں رکھے ہوئے میں پہلو بدل کر علی محمد کی پشت پر جا کھڑی ہوئی۔ علی محمد نے سر موڑ کر مجھے دیکھنے کی کوشش کی۔ اس وقت میں نے دیکھا کہ اس کی آنکھیں پھر گئیں ہیں۔ پیٹ کو پکڑے پکڑے وہ گھٹنوں کے بل زمین پر آ رہا تھا“۔[۲۲]

رضیہ بیگم نے مزید کہا کہ میں نے قتل کیا تو آرام سے باہر آ کر ترکھان علی محمد کے دروازے کو کنڈی لگائی اور شام ہونے سے پہلے رکھوال سے اپنے گاؤں پہنچ گئی قتل بھی ہو گیا اور کسی بشر کو کانوں کان خبر بھی نہ ہوئی۔ مولوی احمد شاہ بولا کہ تو نے کیسی بَک بَک لگا رکھی ہے۔ اپنی تو تو نے آخرت تباہ کر دی ہے۔ ساتھ میری بھی عاقبت تباہ کر رہی ہے۔ تو بتا ان جرائم کا سبب کیا تھا؟ پھر وہ بولتی ہے کہ ان کا سبب اور محرک میں بعد میں بتاؤں گی۔ پھر تیسرے قتل کی کہانی شروع کرتی ہے۔

iii۔ تیسرے قتل کی کہانی:

پھر رضیہ سلطانہ نے مولوی احمد شاہ سے کہا کہ اب تیسرے قتل کی کہانی سن۔ میں اس کو جلدی ختم کر دوں گی۔ میاں جی آپ کو جلدی ہے مجھے اس کا احساس ہے۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ صبر کی تلقین کرتا ہے۔ میں نے اس کال کوٹھڑی میں بہت صبر کیا۔ آپ تھوڑا صبر کریں۔ تیسرا بندہ جو میرے ہاتھوں قتل ہوا۔ اس کا نام چوہدری اکرم تھا۔ وہ بھی رکھوال گاؤں کا ہی تھا۔ اس کے پیچھے مجھے ڈھونڈنے میں بڑی مشکل پیش آئی لیکن وہ ان دونوں سے جو اس سے پہلے قتل کیے تھے آسانی سے قتل ہو گیا۔ چودھری اکرم جہلم کی ایک کپڑے کی مل میں کام کرتا تھا۔ اکثر وہ چھٹی پر گاؤں آتا اور پھر چھٹی گزار کر واپس مل میں کام پر چلا جاتا تھا۔ جہلم میں مجھے اس کا پتہ لگانے میں بڑی مشکل پیش آئی کیونکہ وہ اکثر رات کی شفٹ میں ڈیوٹی کرتا تھا اور اس کے ٹھکانے کا بھی مجھے علم نہیں تھا۔ ایک دن میں صبح کو ہی مل کے گیٹ کے سامنے ایک بیکری کے باہر بینچ پر بیٹھ کر شفٹ آؤٹ ہونے کا انتظار کرنے لگی۔ جب مجھے شفٹ تبدیلی کا ہوٹر بجا تو میں نے اور تیز نظروں سے باہر آتے لوگوں کو دیکھنا شروع کر دیا۔ آخر ایک ٹولے میں مجھے اکرم نظر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سٹیل کا موٹا ٹفن تھا۔ وہ نماز روزے کا پابند متقی آدمی تھا۔ جب وہ ایک اسٹاپ پر کھڑا ہوا تو میں نے وہاں جا کر رونا دھونا شروع کر دیا کہ میرا بیٹا جہلم دریا میں گر گیا ہے اور مجھے اس کو ڈھونڈنے میں مدد کریں۔ ساتھ ہی اکرم کے آگے جھولی پھیلا کر کہا کہ آپ میرے علاقے کے بھائی ہیں۔ میرے ساتھ چلیں وہ فوری تیار ہو گیا۔ ہم گاڑی پر بیٹھ کر جہلم پُل پر گئے تو میں نے اسے کہا کہ میں یہاں پر کھڑی تھی کہ میرا بیٹا پھسل کر دریا میں جا گرا تھا۔ پھر چودھری اکرم اس جگہ کا معائنہ کرنا شروع ہو گیا۔ چودھری اکرم مجھ سے بھی زیادہ فکر مند نظروں سے پانی کی گہرائی ناپنے لگا۔ اتنے میں نزدیک پڑے ہوئے ٹفن کو میں نے زور سے اس کے سر پر مارا تو وہ پہلے ہلکا سا چکرایا۔ میں نے دھکا دے کر گہرے پانی میں اسے پھینک دیا۔ ساتھ رونا شروع کر دیا کہ میرا بھائی پانی میں گر گیا ہے۔ لوگو! میں برباد ہو گئی۔ میری مدد کرو لوگ آئے لیکن گہرے پانی کی بے رحم موجوں نے اسے نگل لیا۔ جتنے بھی لوگ آئے انہوں نے

دیکھا۔ صرف اس نے ایک بار باہر سر نکالا پھر ہمیشہ کے لیے گم ہو گیا۔ پولیس آئی انہوں نے میرے بیان لے کر مجھے تانگے پر بٹھا دیا۔ میں ریل پر بیٹھ کر لاہور آ گئی۔ لو تیسرے قتل کی کہانی بھی ختم ہو گئی۔ اب مولوی صاحب سنیں رضیہ سلطانہ کے لہجے میں سختی آ گئی تھی۔ رضیہ نے کہا کہ اس قتل کی وجہ یا سبب مولوی تم ہو۔ مولوی احمد شاہ نے نہ میں سر ہلایا لیکن اس نے کہا کہ قتل کا سبب تم ہو۔ میں صرف محرک بنی ہوں۔ دیکھو تین نہیں چار قتل ہوئے ہیں۔ پہلا قتل جس کی وجہ سے یہ تینوں قتل ہوئے آپ کا پوتا تھا۔ فیروز شاہ کا بیٹا جس کو فجر کی نماز کے وقت آپ کے حکم پر ان تینوں آدمیوں نے اسے حرام کا بچہ سمجھ کر پتھر مار مار کر مار دیا تھا۔ یہ پچھلے سال نومبر کی ایک صبح تھی۔ بچہ میں نے مسجد کی سیڑھیوں پر رکھا تھا کہ تیرے مرحوم بیٹے کی نشانی ہے۔ میں پلید تھی اس لیے اس کے کان میں اذان نہیں دے سکی۔ اس معصوم کے قتل کے بدلے میں نے ان لوگوں کا قتل کیا ہے۔ احمد شاہ کی زبان بند ہو گئی۔ رضیہ نے مزید کہا کہ تم مولوی مسجد کے چوکیدار ہو اور اسی مسجد میں معصوم کو چار گھنٹے تک مسلسل پاش پاش کرتے رہے۔ عبد اللہ حسین نے اس واقعے کو یوں بیان کیا ہے۔ یہ سماجی جرم کی ایک لرزہ خیز داستان ہے۔

> ”رضیہ سلطانہ چلا کر بولی، چار گھنٹے کی معصوم جان خدا کے گھر کی بے حرمتی کرے گی؟ خدا کا گھر اتنا کچا ہے۔ سن، ہم غریب لوگ ہیں، مگر عالموں کے گھرانے کی اولاد ہوں۔ سن تیرا خدا کہتا ہے سورۃ بقرہ کو یاد کر۔ ”یُصَوِّرُکم فی الارحام“ میں ماؤں کے رحموں میں (بچے کی) تصویر بناتا ہوں۔ احمد شاہ تم اللہ کی بنائی ہوئی تصویر کو پتھروں سے پاش پاش کرتے ہو۔ اور پاک دامنی کے دعویدار بنتے ہو؟ یہ حق تجھے کس نے دیا؟ تم دوسروں کے گناہوں کا حساب چکاتے ہو؟ پھر سورۃ بقرہ کو یاد کرو۔ تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَا كَسَبْتُمْ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ، ”وہ ایک امت تھی جو گزر چکی، اُسے ملے گا جو اس نے کمایا۔ اور تمہیں ملے گا جو تم نے کمایا۔ اور تم سے نہ پوچھا جائے گا جو وہ کیا کرتے تھے“ احمد شاہ تم کسی شے کے ٹھیکیدار نہیں ہو۔ بے حرمت کی بات کرتے ہو۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث یاد کرو۔ فرماتے ہیں بچے کو چپت مت مارو۔ اور فرماتے ہیں غلاف کعبہ کی بے حرمتی سے زیادہ مجھے انسان کی بے حرمتی کا دکھ ہو گا۔ ہائے تم نے میرے ہاتھوں سے بے گناہوں کا خون کرایا۔ جب تیسرا پتھر میرے بچے پر گرا تو میں غش کھا گئی“۔ (۲۳)

قاتلہ کا بیان پڑھ کر معلوم ہوتا ہے کہ وہ بڑی پڑھی لکھی خاتون تھی۔ ساتھ ساتھ وہ احمد شاہ کو ہاتھ سے کہتی ہے کہ میں گنہگار ضرور ہوں میں اس سے انکاری بالکل نہیں۔ لیکن وہ تین لوگ ان پڑھ اور بے گناہ تھے۔ میں نے تو اپنے انتقام کی آگ میں ان کا خون کیا۔ احمد شاہ نے کہا کہ اس کا کوئی گواہ ہے تو رضیہ نے لمبا ہاتھ کر کے کہا یہ کرامت علی فیروز شاہ کا دوست۔ جب احمد شاہ نے کرامت علی کو دیکھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا اور یہ کہا کہ کسی نے پولیس کو اس واقعے کی اطلاع کی تھی لیکن ثبوتوں کو اس قدر صفائی سے مٹایا گیا تھا کہ پورا گاؤں ہی اس واردات میں ملوث تھا۔ پولیس نے اپنی کارروائی پوری کرنے کے لیے چند نشئی لوگوں کو گرفتار کیا۔ پھر چند دن بعد انہیں چھوڑ دیا۔ احمد شاہ پہلے مجھے اور بعد میں رضیہ سلطانہ کو مارنے کے لیے دوڑا لیکن رضیہ نے جلدی سے اپنی ٹانگوں سے ایک گڈھا نکال کر احمد شاہ کی داڑھی میں دے دیا۔ کہا یہ دیکھ تیرا پوتا ہے۔ میں اسے ہر وقت اپنی کوکھ میں لیے بھرتی ہوں۔ احمد شاہ کا سارا بدن کانپ رہا تھا۔ احمد شاہ پاگل ہو گیا اور مردود قیدی، مردود قیدی کے نعرے لگاتا ہوا رضیہ کو دھکا دے کر بھاگ گیا۔ بعد میں رضیہ نے مجھے بتایا کہ ہم عورتیں ہی غریب ہیں۔ مرد مالدار ہیں۔ عبداللہ حسین نے اپنے اس ناول میں جرائم کی داستان کے ساتھ یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ ہم قید میں ہیں۔ پورا معاشرہ قید میں ہے۔ خواہ یہ قید مذہب کی ہو، محبت کی ہو، روایات کی ہو یا سماجی رسوم یا برادری کی قید، انسان آزاد ہرگز نہیں ہے۔ صرف کہنے کو آزاد ہے۔ عبداللہ حسین عورت کو مرد کے برابر درجہ دیتے تھے۔ اُنھوں نے اپنے ایک مذاکرے میں جو ۱۹۸۷ء میں ہوا تھا عورت کے متعلق کہا تھا:

> ”میرے خیال میں عورتوں اور مردوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ کسی بھی لحاظ سے بلکہ میں عورتوں کو بہت سے مردوں کے مقابلے میں بہتر سمجھتا ہوں۔ مجموعی طور پر دیکھا جائے تو میرا خیال ہے کہ عورتیں اپنی جسمانیت کے لحاظ سے اپنی معاشرت کے لحاظ سے اور اپنی تحریک کے لحاظ سے مردوں سے بہت بہتر ہیں۔ میرا ایمان ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔ میرا مضبوط ایمان ہے کہ اگر عورتوں کو جو ان کا حق ہے انہیں طاقت دے دیں۔ ان کے اختیارات دے دیں تو ہماری بہت سی مشکلات کم ہو سکتی ہیں۔ ہماری معاشرت، تہذیب، ہمارا ملک اور ہماری سیاست بہت بہتر ہو سکتی ہے۔ اس لیے کہ عورتوں میں عجیب و غریب قسم کی قوت ہوتی ہے اور ان میں ہمہ گیریت ہوتی ہے۔ ہمارے ملک کی معاشرت کی اور ہماری اپنی جو مشکلات ہیں ان کے دو حل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ادیبوں کی بات سنی جائے اور ان کو اہمیت دی جائے اور دوسرا عورتوں کی بات سنی جائے۔ اہمیت سے میری مراد وہ عورتیں ہیں جو اس لائق ہیں“۔ (۲۴)

ڈاکٹر روبینہ الماس کا کہنا ہے کہ دراصل رضیہ سلطانہ قتل احمد شاہ کی وجہ سے کرتی ہے جو اصل میں اس کے نومولود بچے کا قاتل ہے۔اس کے بارے میں وہ رقمطراز ہیں:

"چنانچہ تین سادہ دیہاتی ان پڑھ امام کے ساتھ مل کر پتھروں سے بچے کو مار دیتے ہیں جس کا بدلہ رضیہ سلطانہ لیتی ہے۔وہ تینوں دیہاتیوں کو بے دردی سے قتل کر دیتی ہے۔"(۲۵)

اس ناول میں عورت کے ساتھ ظلم دکھایا گیا ہے پھر اس نے اپنے انتقام میں تین لوگوں کا قتل کیا۔خود پھانسی چڑھ گئی۔ ہمارے سماج میں ایسے جرائم روز کا معمول ہیں جن کی عکاسی عبد اللہ حسین نے کی ہے۔ یہ سارے جرائم ناول کی عمر کو بھی بڑھاتے ہیں اور معاشرے کی سچی تصویر بھی ہوتے ہیں۔ کیوں کہ ناول نگار معاشرے کا حصّہ ہوتا ہے۔ معاشرے کا عکس اس کی تحریر میں نظر آتا ہے۔ادیب معاشرے کے امن کا سوچتا ہے تاکہ تمام لوگ بھائی چارے سے مل جُل کر زندگی بسر کریں۔ناول کے ممتاز نقاد ڈاکٹر ممتاز احمد خان نے ناول "قید" پر تنقید کرتے ہوئے لکھا ہے ناول میں جرائم کی بڑی وجہ ضعیف الاعتقادی ہے۔وہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

"یہ لوگ اس ضعیف الاعتقادی کی بنا پر مال مال ہو جاتے ہیں اور گدی نشینی کا سلسلہ مستحکم ہو جاتا ہے۔عام طور پر یہ لوگ اسمبلیوں کے ممبران، فوجی لوگوں، بااثر جاگیرداروں اور جرائم پیشہ لوگوں کو اپنے اثر میں لے آتے ہیں اور خود بھی جرائم میں ملوث ہو جاتے ہیں۔"(۲۶)

جب ایک طبقہ مذہب اور اخلاقیات کے جملہ حقوق اپنے نام کرا لیتے ہیں۔ شریعت اور قرآن کے احکامات کی تفسیر و تعمیل بھی اپنے طبقے کے لیے وقف کر لیتے ہیں تو دوسرے طبقے میں مایوسی پھیلتی ہے۔ یہی مایوسی جرائم کا سبب بنتی ہے۔ انسان صرف محرک بنتا ہے۔

ر۔ناول غلام باغ میں سماجی جرائم:

مرزا اطہر بیگ ۱۹۵۳ء میں ساہیوال میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ کالج یونیورسٹی لاہور سے فلسفے کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائرڈ ہوئے۔ اپنے ادبی سفر کا آغاز انہوں نے ٹی وی ڈرامے لکھ کر کیا۔ ان کے مشہور ناول "غلام باغ"، "حسن کی صورت حال" اور "صفر سے ایک تک" ہیں۔ ان کا ناول "غلام باغ" ۲۰۰۶ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اردو ناول کی تاریخ میں "غلام باغ" ایک اجتہاد کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ ناول مختلف

موضوعات کے گرد گھومتا ہے۔ سماجی ناانصافی، نفس پرستی، ہوس زر، انسان دشمنی، حقارت، نفرت، انتقام، جعلی پیری مریدی، زن، زر، زمین، انا پرستی، جرم زدہ سیاست، زنا، قتل جیسے جرائم، جو معاشرے میں نفرت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں، شامل ہیں۔ یہ سب بنی آدم کی تذلیل کے قدیم و جدید طریقے ہیں۔ ''شاکیہ منی (مہاتما بدھ)'' نے انہیں انسانی دکھوں کی جڑ قرار دیا تھا۔ اس ناول کی نفسیاتی گرفت (ظ زغ ِ) فیودر دوستوو نفیسکی سے کافی مماثلت رکھتی ہے۔ اس ناول کا پلاٹ بھی کثیر الاضلاع ہے۔ ناول میں کہیں کہیں جے کے رولنگ، سر آر تھر کونن ڈائیل، گبریل گارشیا مارکیز اور کافکا کرسٹی کے اثرات کو آسانی سے محسوس کر سکتے ہیں۔ ناول میں ڈراما، رومانس، فینٹسی، المیہ، اسرار نویسی اور کرائم پر مشتمل ہے۔ ہر ناول نگار کی طرح اس نے جرائم کو بڑی باریک بینی سے پیش کیا ہے۔ جرائم پیشہ کردار اپنی مثال آپ ہیں۔ ناول کا اہم کردار یاور عطائی ہے جو عوام میں قوت باہ کی دوائی بنانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ ہر بندے کو عمر کے لحاظ سے اور پیسے کے حساب سے الگ الگ نسخے دیتا ہے۔ ہر جرم ناول میں اپنے کردار کے ساتھ جڑا نظر آتا ہے۔ یہی اس ناول کی کامیابی کا راز ہے۔

i۔ ارزل اور مانگر جاتی نسلوں کا نسلی امتیاز اور جرائم:

غلام باغ میں مانگر جاتیوں اور ارزلوں کا آپس میں نسلی امتیاز بھی ہے۔ ایک نسل اپنے آپ کو بڑی سمجھتی ہے جبکہ دوسری نسل اپنی اہمیت دکھانے کے لیے قتل جیسے جرم سے بھی گریز نہیں کرتی لیکن ناول میں سماج میں پائے جانے والے نسلی امتیاز یا برادری ازم جیسی لعنت جو کہ جرائم کا سبب بنتی ہے، کی عکاسی بڑے اچھے انداز سے کی ہے۔ ناول نگار کے ہاں جرم کا سبب نسلی برتری ہے جو کہ گناہ بھی ہے اور جرم بھی۔ معاشرے سے مساوات جیسی اقدار کی کمی ہو جاتی ہے اور وہ جرم صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ہم ان لوگوں سے افضل و برتر ہیں۔ ان کا عکس ناول نگار نے الفاظ میں کیا ہے:

> ''ایک تو ان میں حاکو نٹے والا ہو گزرا تھا۔ جب انگریز نے علاقے سے ریلوے لائن گزاری تو حاکو (حاکم دین) انعام گڑھ کے اسٹیشن پر کانٹے والا بھرتی ہو گیا۔ سرکاری نوکری ملنے پر وہ اپنی اصل بھول گیا اور کسی کو بھی خاطر میں نہ لاتا تھا۔ اسے اس کی اصل کی طرف واپس پہنچانے کے لیے چند بڑوں نے آسان طریقہ نکالا اور اسے ہاتھ پاؤں باندھ کر اسی ریل کی پٹڑی پر ڈال دیا۔ کہتے ہیں کہ انہوں نے اس کا منہ نہ باندھا اور آتی ریل کی آواز سن کر وہ پاگل ہو گیا۔ قہقہے لگاتا اور ایک ہی بات کہتا تھا۔ میں بھورا بادشاہ بن گیا ہوں۔ گڈی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی''۔ (۲۷)

پھر ان میں ایک بڑی پھوں پھاں والا ماسٹر کرم الٰہی پیدا ہو گیا۔ چودھری رحیم کا چھر نے پہلے تو اس کی اکڑ توڑنے کے لیے اسے بڑی بھاری تنخواہ پر اپنے پاس منشی رکھنے کی ترغیب دی۔ اسے ماسٹری سے استعفیٰ دلوایا، اپنے پاس منشی رکھا پھر جوتے مار کر نکال دیا۔ مانگر کو سبق سکھانے کا تجربہ رحیم کا چھر کو بڑا مہنگا پڑا۔ مستعفیٰ ماسٹر نے رحیم چودھری کو اس کے گھر کے سامنے چھریوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اسے پھانسی کی سزا ہوئی مگر اپیل پر بڑے انگریز جج نے جب ملزم سے انگریزی کے کچھ صحیح گرائمر کے فقرے سُنے تو خدا جانے اس کے جی میں کیا آئی، اس نے پھانسی کی سزا کو کالے پانی کی سزا سے بدل دیا۔ کہتے ہیں کہ وہ مانگر جاتی میں پیدا ہونے والا سب سے زیادہ پڑھا لکھا تھا"۔

یہاں ناول میں قتل کا سبب صرف ذات برادری ہے تاکہ کوئی چھوٹا بڑا نہ ہو جائے۔ مانگر جاتی نسل کی کہانی میں ناول نگار نے ارزل نسل کی برتری پھر ان لوگوں کے دوسروں پر جرائم کے نئے نئے انداز جس میں سبب صرف یہ کہ یہ مانگر جاتی ہمارے کامے ہیں اور ان میں اگر کوئی تعلیم حاصل کر جاتا ہے تو ارزلوں کو برا لگتا۔ مرزا اطہر بیگ نے اس میں ہمارے سماج کے اندر پائی جانے والی نسلی برتری کا مذاق اڑایا ہے۔ ہمارے سماج میں نسلی برتری اتنی عروج پر ہے کہ ہمارا مذہب پیچھے رہ جاتا ہے اور نسلی برتری آگے نکل جاتی ہے۔ ہمارے ہاں برادری ازم کی وجہ سے معاشرے میں بہت زیادہ جرائم ہوتے ہیں۔ ہمارے جمہوری نظام کی بنیاد صرف برادری پر ہے۔ ملک کی ۷۰ فیصد آبادی گاؤں میں رہتی ہے۔ الیکشن میں نمائندہ پارٹی ازم کی بنیاد پر کم جبکہ برادری ازم کی بنیاد پر زیادہ ووٹ حاصل کرتا ہے۔ چھوٹی برادری کے لوگ اچھوت بن کر رہ جاتے ہیں۔ یہی معاشرتی اونچ نیچ معاشرتی بگاڑ اور جرائم کا سبب بنتی ہے۔ ہمارے شہروں میں قدرے یہ نسلی امتیاز کم ہے۔ اس لیے شہری معاشرہ ترقی کر رہا ہے۔ جبکہ گاؤں کے ماحول میں برادری ازم بڑا مضبوط ہے۔ جو جرائم پیدا کرنے کا سبب بھی ہے۔ گاؤں کے بڑے چھوٹی برادری کے لوگوں کو اپنے پاس کام کاج کے علاوہ جرائم کروانے اور اپنے جرائم میں ہراول دستے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔

ii۔ مانگر جاتیوں پر ارزلوں کا تشدد:

ناول میں مانگر جاتی قوم کو ادلی اور نیچ دکھایا گیا ہے۔ ارزل پیسے اور تعلیم کے لحاظ سے بھی ان سے آگے ہیں۔ مانگر جاتی جو بھوک کی وجہ سے ہر جانور خواہ وہ حلال ہو یا حرام سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ ان کی ایک تصویر مرزا اطہر بیگ نے یوں اتاری ہے:

"مانگر بلی، سیہ، گوہ، کرلے اور سانپ کا گوشت ضرور کھالیتے تھے۔ اس نے خود دیکھا اب بھی دیکھ رہا تھا۔ جھیڈو مانگر بلی کا گوشت کھا رہا تھا اور بھاگاں کو بھی کھلا رہا تھا اور افضل کا چھرا اور سراج پگل نے انہیں پکڑ لیا اور بڑی بڑی ہاکیوں سے جھیڈو کو مار مار کر اس کی ہڈیاں توڑ دیں۔ اس کے منہ سے خون بہہ رہا تھا اور ساتھ ہی ادھ پکی بلی پڑی تھی"۔(۲۸)

یہ وہ جرائم ہیں جو گاؤں میں معمول کے مطابق ہوتے ہیں۔ لوگ ان کو کس طرح برداشت کرتے ہیں۔ حالانکہ زیادہ لوگ اس کا شکار ہیں طاقتور کا کوئی ہاتھ نہیں روکتا، جیسا کہ ادیب نے اس میں دکھایا ہے تو ملکی قانون کدھر تھا جس نے عوام کی جان و مال کا تحفظ کرنا تھا۔ یہ ہمارے دیہاتی ماحول کی ایک جھلک ہے جس کو سماج نے قبول کیا ہے کیونکہ دیہات میں یہ لوگ انتہائی طاقتور ہیں جبکہ غریب کا استحصال صدیوں سے رواں دواں ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے مار پیٹ اور زنا بالجبر کے جرم کو بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ادیب کے ہاں جرم دو چودھریوں کا نہیں ہے بلکہ جرم ان لوگوں کا ہے جو ہاتھ سے اس کو روک نہیں رہے۔ دیہی معاشرے میں زنا بالجبر اور غریب کے ساتھ زیادتی بڑوں کا کھیل ہے جبکہ پولیس خاموش تماشائی کا کردار ادا کرتی ہے جو کہ ایک جرم ہے اور مجرم کو تقویت دیتا ہے۔

iii۔عطائی ڈاکٹر یاور اور جرائم پیشہ امبر جان:

"غلام باغ" ناول کے کرداروں میں دو جرائم پیشہ کردار ایک یاور عطائی جو قوت باہ کی گولیاں بنابنا کر شہر کے پوش ایریا میں رہتا ہے اور ہر قسم کے لوگ، زانی، چور، ڈکیٹ، اسمگلر، بیوروکریٹ، تاجر، وکلا، پروفیسرز وغیرہ سے اس کا کمرہ مرجع خلائق تھا، تو ان جرائم پیشہ افراد کے مکالمے بھی جرائم زدہ ہی ہوتے ہیں اور اکثر ایک دوسرے کی تعریف میں کسر باقی نہیں رہنے دیتے۔ ملاحظہ ہو۔ امبر جان اسمگلر کے الفاظ:

"میں نے بہت دنیا دیکھی ہے لالہ اور جوانی بنانے کے بڑے شعبدے دیکھے ہیں۔ اسپنش فلائی، یوھمین، جنسینگ اور پتہ نہیں کیا کچھ مگر سب فریب جو جادو تمہاری گولیوں اور سفوفوں میں ہے اور کسی میں نہیں۔ ایک بات لکھ دیتا ہوں۔ عطائی تم اس وقت دنیا کے سب سے بڑے جوانی دینے والے ہو۔ میں جانتا ہوں۔ مجھے تمہاری سند کی ضرورت نہیں"۔ عطائی نے سنجیدگی سے کہا ہا۔۔۔۔۔ ہا۔۔۔۔۔ ہا امبر جان گھبرایا"۔ کبھی کبھی میں

سوچتا ہوں تم اگر اپنے ان معجزوں کو کوئی نام دے کر پیٹنٹ کروالو اور مارکیٹ میں لے آؤ تو دنیا ٹوٹ پڑے"۔(۲۹)

آگے چل کر امبر جان کہتا ہے کہ:

"میں بادشاہ۔۔۔۔۔یعنی میں۔۔۔۔۔ امبر جانکے قہقہوں میں اب پورا خلوص تھا۔ ہاں تم بادشاہ ہی تو ہو۔ اپنی دنیا کی جرم، سمگلنگ، نشہ بازی اور نشہ سازی کی دنیا کے بادشاہ"۔(۳۰)

جرائم کی دنیا کا یہ بادشاہ جو ہر قسم کی سمگلنگ اور منشیات کے کاروبار سے منسلک ہے دوبارہ عطائی سے کہتا ہے: کیونکہ اب یہ تھائی لینڈ جا رہا ہے اور عطائی کی دوائی کی اس کو سخت ضرورت ہے۔ امبر جان جو کہ ناول کا ولن بھی ہے جس کو ایک نڈر مجرم کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

"میں بس امبر جان رہنا چاہتا ہوں۔ دیکھو عطائی میں کل بنکاک جا رہا ہوں اور بنکاک میں فرصت کی گھڑیوں میں امبر جان کا بس ایک ہی مشغلہ ہوتا ہے۔ عورت کا گوشت۔۔۔۔۔۔ بے حیائی سے لدا امبر جان کا قہقہہ اس کے عام قہقہوں سے مختلف تھا اور کسی کتے کی غراہٹ سے مشابہ تھا"۔(۳۱)

اسی طرح ڈاکٹر یاور جو کہ عطائی ہے نے مردانہ طاقت بڑھانے کے نام پر پوش ایریا کے لوگوں کو خوب لوٹا ہے۔ یہ ناول تمام طبقوں کے چہروں سے نقاب اٹھاتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان یاور عطائی کے بارے میں لکھتے ہیں:

"لیکن شہر لاہور کے یاور عطائی کے ڈرائنگ روم میں امیر اور غریب اونچے اور نچلے طبقے، بیوروکریٹ اور کلرک ٹائپ، جرائم پیشہ، شریف غرض تمام ہی لاتعداد طبقات مل جل کر ارزل کلچر کا حصہ بن گئے تھے"۔(۳۲)

مرزا اطہر بیگ یہاں پر جرائم پیشہ افراد کی مثال دینے میں اپنی مثال آپ ہیں۔ یہ اسی طرح "ماریو پوزو" نے اپنے ناول "گاڈ فادر" میں بے شمار جگہ دی ہیں۔ جرائم پیشہ لوگوں کی دنیا الگ ہوتی ہے۔ یہ لوگ دنیا کو اپنی مرضی کے مطابق ڈالنا چاہتے ہیں۔ معاشرے میں انتشار ان کو خوشی جبکہ سکون ان کو بُرا لگتا ہے۔ بنکاک کی مثال انہوں نے اس لیے دی ہے۔ تھائی لینڈ کے اس دارالحکومت میں دنیا بھر کے جرائم پیشہ افراد صرف جنسی تسکین

حاصل کرنے کے لیے آتے ہیں۔ تھائی لینڈ نے عصمت فروشی کو اپنی انڈسٹری ڈکلئیر کیا ہوا ہے۔ یہاں آکر ناول نگار نے کامیابی سے کہانی میں استعمال کیا ہے۔

iv۔ کمزور ایمان اور جعلی پیری مریدی جیسے جرائم:

کمزور ایمان اور جعلی عامل ہمارے معاشرے میں جرائم کا مرکز ہیں۔ اطہر بیگ نے اپنے اس ناول میں ان لوگوں کی تصویر کشی کی ہے جو ان جرائم میں ملوث ہیں۔ ایک پاگل چٹا سائیں جو گاؤں کے قریب ایک حجرے میں ننگ دھڑنگ غلاظت پھیلاتا ہے۔ لیکن لوگ اس کی گالیاں سن کر بھی اس سے مرادیں مانگتے ہیں۔ ہر دربار کی طرح یہاں بھی لوہے کا ایک بڑا صندوقچہ رکھا ہوا ہے۔ لوگ یہاں پر نذرانے ڈال رہے ہیں۔ یہاں ہر قسم کا آدمی آپ کو قطار در قطار نظر آئے گا۔ یہاں پر ناول نگار نے جُرم صرف کمزور ایمان کو ٹھہرایا ہے:

> ”اب شریف صورت آدمی کی جگہ ایک بے تاثر چہرے والی دیہاتی عورت اور اس کے ساتھ اس کا بچہ جو کسی کریہہ المنظر جلدی مرض میں مبتلا تھا۔ منتظر کھڑے تھے پھر ایک سوٹڈ بوٹڈ شرمندہ شرمندہ سا شہری نوجوان آیا۔ پھر ایک برقعہ پوش عورت جس کا کچھ اندازہ نہ ہوتا تھا کہ کیا ہے۔ پھر ایک خوش شکل عورت جس کے چہرے پر غم اتنا گہرا تھا کہ جیسے ابھی مر جائے گی۔ پھر ایک لڑکھڑاتا ہوا بوڑھا جو ہر شے سے بیگانہ لگتا تھا، اس کے جوان ساتھی اسے دونوں طرف سے سہارا دے کر لائے تھے۔ پھر ایک بے حد احمق صورت مرد جس کی آنکھوں سے آنسو مسلسل بہہ رہے تھے۔ پھر ایک بے حد تیز طرار کاروباری جو چاروں طرف مشکوک نظروں سے دیکھتا تھا۔ پھر ایک کالج کا پروفیسر جو جانتا تھا کہ یہ سب کچھ بے کار ہے لیکن آگیا تھا۔ اس کا بیٹا کینسر کی آخری سٹیج پر تھا۔ ذلتوں، اذیتوں اور حسرتوں کی وہ قطار ہونی اور انہونی کے بیچ لٹکے پُل صراط پر رک کر آگے بڑھتی تھی“۔ (۳۳)

جعلی پیری مریدی ایسی بیماری ہے جس میں اطہر بیگ نے زندگی کے ہر مکتبۂ فکر کا ذکر کیا ہے۔ ملک میں آئے روز کہیں جعلی پیر سے قتل تو کہیں زنا جیسے جرائم ہوتے رہتے ہیں۔ کمزور ایمان نے ہمارے اصلی ایمان میں سوراخ کر دیئے ہیں۔ اللہ سبحانہ تعالیٰ سے مانگنے کی بجائے ہم جعلی پیروں سے مانگتے ہیں۔ یہاں مجرم وہ معاشرہ ہے یا اس کے افراد ہیں جو کمزور ایمان کی رو میں بہہ جاتے ہیں۔ جن کی ناول نگار نے نشاندہی کی ہے۔

ہمارے سماج کے اندر پائے جانے والے جرائم میں ان جرائم کو سافٹ کارنر حاصل ہے۔ لوگ ان جعلی پیروں کی باتوں میں آکر خاندانوں کے خاندان تباہ ہو جاتے ہیں۔ گزشتہ سال ملتان میں ایک جعلی پیر کے کہنے

پر ایک نوجوان نے اپنے مکان کی پچاس فٹ تک گہرائی کی۔ پیر کے کہنے کے مطابق نیچے سونا دبا ہوا ہے لیکن بندہ خود ملبے تلے دب کر مر گیا۔ سرگودھا میں ایک جعلی پیر نے ۲۷ افراد کو کلہاڑی سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور کہا کہ میں آپ کو زندہ کر لوں گا لیکن آج تک کوئی زندہ نہیں ہوا۔ پشاور میں جعلی پیر نے عورت کے سر میں کیل ٹھونک دی تاکہ اس کے ہاں لڑکی کی بجائے لڑکا پیدا ہو۔ آئے روز نئے نئے جرائم پیشہ افراد اس نام نہاد روحانی دھندے میں ملوث ہیں۔ کوئی چھری والا بابا، تو کوئی انڈے والا بابا۔ یہ سب جرائم کمزور ایمان کی وجہ سے سرزد ہوتے ہیں۔ اطہر بیگ نے اپنے اس ناول "غلام باغ" میں معاشرے کی سچی تصویر کشی کی ہے۔ بجائے خدا سے مانگنے کے انسانوں سے اُمید لگا لیتے ہیں جو کہ شرک ہے اور اسلام اسے سختی سے منع کرتا ہے۔ یہ لوگ اسلام کی خدمت نہیں بلکہ اپنی دکان چمکا رہے ہوتے ہیں جو کہ جرم ہے۔

v۔ سرقہ اور جعل سازی جیسے جرائم:

"غلام باغ" میں کبیر مہدی کا کردار بڑا اہم ہے۔ اطہر بیگ نے اس پر بڑی محنت کی ہے۔ وہ فری لانس ادیب اور صحافی ہے جو کہ بڑی تحریر کرنے کے خواب دیکھتا ہے۔ بہت زیادہ پڑھا لکھا روشن خیال مگر نڈر اور بے باک بھی ہے۔ لیکن شاطر اور بے حد باتونی بھی ہے۔ اس کا گھر ہے، نہ کوئی ٹھکانا، پرانی کتابوں والے نے اسے کتابوں کی چھانٹی کرنے کے لیے دکان کے اوپر رہنے کے لیے جگہ دے رکھی ہے۔ ناول نگار اطہر بیگ خود بھی ساری عمر تعلیم سے وابستہ رہے ہیں اور اب بھی وہ پڑھا رہے ہیں۔ انہوں نے سماجی جرائم میں ایک جرم کی نشاندہی جو کبیر مہدی کے کردار کے ذریعے کی ہے کہ ہمارا نظام تعلیم بھی زاغوں کا نشیمن بن کر رہ گیا ہے۔ جعل سازوں نے اس میں شامل ہو کر اس کے تقدس و عظمت کو برباد کر دیا ہے۔

علم منڈی کی چیز بن گیا ہے۔ اس میں دوسرے شعبہ ہائے زندگی کی طرح کرپشن اور کمینگی کا زہر نفوذ کر چکا ہے۔ تعلیم کا کاروبار جعل ساز اور ٹھگوں کے ہاتھ چڑھ گیا ہے۔ یہ بدکار لوگ کھلے عام ڈگریاں بیچتے ہیں۔ بولی لگتی ہے۔ ناول نگار نے کبیر مہدی کے نیلے رجسٹر کی یاداشتوں میں ان جعل ساز جرائم پیشہ ننگ دیں، ننگ وطن پروفیسروں کو بے نقاب کیا ہے جو ایم فل اور پی ایچ ڈی کے تھیسس پیسے دے کر تحریر کراتے ہیں اور اضافی تنخواہ اور ترقیوں کے حق دار بن جاتے ہیں۔ یہی ٹھگ اور جرائم پیشہ افراد اعلیٰ عہدوں پر جا کر دین، ایمان اور قانون تک کو برائے فروخت سمجھتے ہیں۔ ان تکلیف دہ مناظر کو اطہر بیگ نے اپنے ناول کے باب نمبر ۱۶ میں اس طرح بے نقاب کیا ہے:

"پہلے تو میں کتاب مارکیٹ گیا اور کچھ درسی کتابوں کے خلاصے تیار کرنے کے آرڈرز لیے پھر میں نے ایک پرانے پروفیسر دوست کے گھر کا رُخ کیا۔ ایک زمانے میں مَیں نے ان کا پی ایچ ڈی کا تھیسس "تحقیق اور تحریر" کیا تھا جس کے معاوضے کے طور پر اس نے ایک سال تک مجھے خورد و نوش اور رہائش کی فکر سے آزاد کیے رکھا تھا۔ بعد میں وہ لیکچرار ہو گیا تو اس نے بتایا کہ مناسب فیس پر تھیسز بنا دینے والوں کی انتہائی ڈیمانڈ ہے اور بندہ ملتا نہیں۔ اگر تم چاہو تو تمہارے لیے کام کی لائن لگا سکتا ہوں"۔(۳۴)

اس سے بڑھ کر علمی جرم اور کیا ہو سکتا ہے۔ وہ اپنے نیلے رجسٹر میں لکھتا ہے کہ آج پروفیسر نذیر کا فون آیا تھا اور اس نے خوشخبری سنائی ہے کہ دو ایم فل کے اور دو پی ایچ ڈی کے تھیسز لکھوانے کے گاہک مل گئے ہیں۔ کمر کس لو۔ یہاں پر استعمال ہونے والے الفاظ انسان کی تہذیبی حِس کو ششدر کر دینے کے لیے کافی ہیں۔ معاشرے میں پڑھا لکھا طبقہ ایسا سوچ بھی نہیں سکتا کہ سرقہ جیسے جرائم کریں۔ پھر اس کے آگے وہ ایک عورت کے پاس پہنچتے ہیں جو کہ اپنا پی ایچ ڈی کا تھیسز لکھوانا چاہتی ہے۔ وہ بیوہ بھی ہے لیکن نوکری میں ترقی کے لیے اس کا پی ایچ ڈی کرنا لازمی ہے تا کہ مستقبل میں اچھا گریڈ مل سکے جس کی خواہش ہر ملازم کو ہوتی ہے۔

اس کی تصویر ناول نگار نے اس طرح کھینچی ہے، جو کہ تحقیق کرنے والوں کے لیے لمحۂ فکریہ ہے:

"پروفیسر یہ ـــــ پروفیسر تو نہیں ہیں مگر ریسرچ کا بہت تجربہ ہے۔ میں نے اپنی پی ایچ ڈی کے دوران ان سے مدد لی تھی۔ آپ کو بتایا تھا نا"۔ "عورت جی بھائی ـــــ (آہ بھر کر) میرا مسئلہ صرف مدد کا نہیں ہے جناب۔ میرا تو سارا کام ہی انہیں کرنا پڑے گا ـــــ ٹا ـــــ پک کا انتخاب تھیسز لکھنا۔ مجھے پھر انٹرویو کی تیاری کرانا"۔(۳۵)

یہاں پر ناول نگار کے ہاں مجرم تھیسز لکھنے والا نہیں ہے بلکہ لکھوانے والے ہیں۔ لکھنے والا صرف جُرم کا محرک بنا ہے جو کہ لکھ کر اپنے پاپی پیٹ کی آگ بجھانا چاہتا ہے۔ ہم روزانہ ایسے پی ایچ ڈی ڈاکٹر حضرات کو دیکھتے ہیں جو ہر روز طلبہ کو تحقیق کے بغیر پڑھا رہے ہوتے ہیں۔ واقعہ کسی سن کا ہے اور وہ بتا کوئی اور سن رہے ہوتے ہیں۔ آگے چل کر پھر کبیر اور پروفیسر نذیر کا مکالمہ ہے:

"پروفیسر عجیب عجیب طریقے کی باتیں کرتے رہے وہاں ـــــ بھئی میں نے تمہارے لیے ریسرچ کا گاہک ڈھونڈھا ہے تم اسے بتاؤ ـــــ کتنے پیسے ـــــ کے پھر تھیسز بھی لکھوانا ہے تو کتنے پیسے ـــــ انٹرویو کی تیاری کے کتنے پیسے ـــــ جیسے تم نے مجھے بتایا تھا"۔(۳۶)

ناول نگار نے دو نمبر کام کرنے والوں کو مجرم قرار دیا جو کہ سچ ہے۔

ناول میں اگلا بڑا مجرم امبر جان جو کہ کہانی کا ولن بھی ہے اپنے کمزور حریف کبیر خان کو آگ لگانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ یاور عطائی کی بیٹی زہرہ سے شادی کرنا چاہتا ہے اور کبیر کو اپنا دشمن سمجھتا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ جب کبیر مہدی سوئے گا تو اس کو آگ لگانا آسان ہو گا کیونکہ زندہ آدمی دوڑ کر اپنی جان بچا سکتا ہے۔ آگ لگانے والے کرائے کے قاتل کا کبیر کے سونے کا انتظار کرتے ہیں۔ اس مجرمانہ منظر کو ناول نگار نے ایک کرمنالوجی کے ماہر کی طرح پیش کیا ہے کیونکہ اطہر بیگ فلسفے کا پروفیسر بھی تو ہے۔ فلسفہ دان ہر چیز کی جڑ کو دیکھتا ہے۔

"باقی دونوں آگ لگانے والے خوب تیار ہو کر آئے تھے۔ پٹرول کا کنستر، ایک فالتو ڈھکن جس میں نصب دو ربڑ کی نالیاں ایسی کہ ڈھکن کنستر میں لگا کر ایک میں پھونک مارو دوسری سے بہتی آگ کی دھار پھوٹ کر نکلے۔ نئے آنے والوں میں ایک جس کا نام بھولا تھا اور کام ستھرا اور پکا کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ باقی دونوں کو اپنے خونی منطق کا قائل کرنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ ستھرا اور پکا کام کرنا ہے تو پہلے دروازے پر ہلکا سا ٹہوکا دو باہر نکلے گا منہ پر ہاتھ رکھ کر اندر گرا دو اور گلے پر چھرا پھیر دو پھر آرام سے پٹرول چھڑک کر آگ لگا دو"۔ (۳۷)

کمرے کو آگ لگ گئی۔ اتنے میں زہرہ نے آکر اس کو کمرے سے نکالا۔ وہ بری طرح زخمی ہو گیا لیکن بچ گیا کیونکہ ۳۰ فی صد سے زیادہ جلا ہوا آدمی مشکل سے جانبر ہوتا ہے۔ بعد میں وہ کافی دیر تک لنگڑاتا رہا۔ امبر جان کی یہ کوششیں بیکار گئی۔ امبر جان زہرہ سے زبردستی شادی کرنا چاہتا ہے اور وہ زہرہ پر جنسی حملے جیسا جرم کر چکا ہے۔ امبر جان نے یہ قاتلانہ حملہ صرف اپنی مذموم خواہش کو پورا کرنے کے لیے کرایا تھا تاکہ کبیر مر جائے اور میں زہرہ سے شادی کر سکوں۔

vi۔ نواب ثریا جاہ نادر جنگ کا مدد علی پر تشدد:

جیسے ہم اپنے سماج میں روز یہ منظر دیکھتے ہیں مالک یا امیر آدمی غریبوں پر سرِعام تشدد کرتے ہیں اور اس کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ کہ قانون کی نظر میں وہ اپنے اس فعل کو جائز اور اپنے آپ کو جرم و سزا سے مستثنٰی خیال کرتے ہیں۔ یہی صورتِ حال اس ناول میں اطہر بیگ نے دکھائی ہے کہ گونگا مدد علی کھنڈرات سے صرف چھری لے کر آیا جو اس نے بڑی گدائی کے بعد حاصل کی تھی لیکن نواب کو جیسے دیکھتے ہی مدد کے منہ سے کسی جانور

جیسی آواز نکلی۔ نواب ثریا یار جنگ نے چمڑے کا کوڑا ہوا میں لہرایا اور مد د علی کی ننگی کمر پر گرا دیا۔ ایک غیر انسانی چیخ اس کے حلق سے نکلی:

> ''ہاف میں وحشت زدہ ہو کر اس طرف بھاگا۔ یہ تم کیا کر رہے ہو؟ کیا تم پاگل ہو گئے ہو؟ یہ کیا جہنمی حرکت ہے تمہاری۔ وہ نواب پر چیخا۔ نواب نے جواباً زمین سے ایک زنگ آلود چھری اٹھائی ہاف مین کے مشاہدے کے لیے اس کی طرف بڑھائی / یہ دیکھو اتنی دیر میں ہماری اتنی مصیبت کے بعد یہ اس نے تلاش کیا میرے لیے، اس کے بعد اس نے پھر کوڑا لہرایا۔ مد د علی کی چیخ پھر گیلے کھنڈروں میں گونج گئی''۔(۳۸)

نواب کو اس بات کا رنج بھی تھا کہ مد د نے سونے کی اینٹ یا قیمتی نوادرات کیوں نہیں نکالے۔ کیونکہ نواب صاحب نوادرات کو سمگل کر کے بھاری روپیہ کماتا ہے اور غلام باغ کا جنم کھنڈر اس کے لیے ایک مدفن خزانہ ہے۔ ہر قیمتی اشیاء وہ مد د علی کی محنت سے نکال کر بیچتا ہے۔ کوئی بھی نوادرات یا خزانہ ہو وہ حکومت وقت کی ملکیت ہوتا ہے۔ نوادرات کی سمگلنگ ایک جرم ہے جس کی سزا تین سال قید ہے۔ سماج میں ایسے لوگ عزت سے پھرتے ہیں، قانون ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ عطر بیگ نے ان جرائم پیشہ افراد کو ناول میں جگہ دے کر سماجی جرائم کی نشاندہی کی ہے۔ اگر حکومت سختی کرے تو کوئی بھی نوادرات کی سمگلنگ نہیں کر سکتا۔ ہمارے ایئر پورٹس پر اکثر نوادرات پکڑے جاتے ہیں اور سمگلر غائب ہو جاتے ہیں۔

vii۔ ڈاکٹر ناصر کا زہرہ کی عفت پر حملہ:

ناول میں ایک کردار ڈاکٹر ناصر کا ہے جو سائکیٹری وارڈ میں ڈیوٹی کرتا ہے۔ زہرہ جب اپنے باپ یاور عطائی کو ہسپتال میں لے کر آتی ہے تو ڈاکٹر ناصر اس میں دلچسپی لینا شروع کر دیتا ہے۔ یاور عطائی نے کوئی دیسی دوائی کھالی ہے جس سے اس کو پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔ وہ بار بار ایک ہی گردان پڑھ رہا ہے: ''زمین گر رہی ہے''، ''زمین گر رہی ہے''۔ ڈاکٹر ناصر کی ریسرچ صرف اس کام میں ہے کہ اس کے پیچھے راز کیا ہے؟ آہستہ آہستہ وہ زہرہ کے قریب ہونا شروع کر دیتا ہے۔ یاور عطائی چند دن بیمار رہنے کے بعد مر جاتا ہے۔ اسی دوران جب یاور ہسپتال میں تھا۔ ڈاکٹر ناصر ایک پیرانائیڈ مریضہ پر جنسی تشدد کرتا ہے۔ وہ ملاحظہ ہو ناول نگار کے الفاظ میں:

> ''جس روز کبیر بیت القفنس میں منتقل ہوا اسی روز بڑے شہر کے ایک ہسپتال کے سائکیٹری وارڈ میں ایک جونیئر ڈاکٹر۔ ڈاکٹر ناصر نے اپنی ایک پیرانائیڈ مریضہ پر جنسی تشدد کیا۔ سرخی لگاؤ ذہنی مریضہ پر ڈاکٹر کا جنسی تشدد۔ متن جماؤ۔ بڑا شہر (وقائع نگار) خصوصی

مقامی ہسپتال کی شعبہ امراض دماغی میں زیر علاج ایک مریضہ ہسپتال کے ایک ڈاکٹر کی ہوس کا نشانہ بن گئی"۔ (۳۹)

ہمارے سماج میں ایسے جرائم اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ اسلام آباد میں پاکستان انسٹیٹیوٹ آف میڈیکل کمپلیکس(PIMS) میں وارڈ بوائے کے ہاتھوں ایک فی میل مریض کی عصمت دری ہوئی تھی۔ ہولی فیملی ہسپتال میں ڈاکٹر اور میل نرس کے سیاہ کارنامے سامنے آئے تھے۔ لاہور، کراچی، ملتان اور پشاور کے اکثر ہسپتالوں میں ایسی وارداتیں ہوتی رہی ہیں۔ صرف دو فیصد لوگ رپورٹ کراتے ہیں۔ بعد میں جیسا کہ ہمارا عدالتی نظام ہے جو پیسے والے کے لیے انصاف فراہم کرتا ہے، غریب کے لیے نہیں۔ نرس مختار بیگم جس نے ڈاکٹر ناصر کو رنگے ہاتھوں پکڑا تھا، پاگل قرار دے کر ڈاکٹر ناصر کو بری کر دیا گیا۔ یہ اس سے بڑا جرم ہے کہ اصل مجرم کو چھوڑ کر ثبوت کو مٹا دیا گیا۔ یہ ہمارے سماج میں انصاف کے معیار کا مذاق بھی ہے جس کو مرزا اطہر بیگ نے بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ ناول نگار کے ہاں مجرم نرس بیگم مختار ہے جس نے اسے رنگے ہاتھوں پکڑا تھا، نہ کہ ڈاکٹر ناصر۔ ناول میں اس کا اظہار خود مرزا اطہر بیگ نے کیا ہے۔

"جرم کی حقیقت فردِ جرم سے ہے۔ جرم کی حقیقت کچھ بھی ہو فرد جرم برقرار رہتی ہے۔ ناصر نے کہا اور کبیر نے اور زہرہ نے دیکھا کہ اس کی آواز میں کوئی غصہ، کوئی انتقام، کوئی نفرت کوئی احتجاج نہیں ہے۔ وہ کسی نامعلوم شانتی کے ایسے خطے میں ہے جو ان کے لیے بالکل اجنبی ہے۔ یہ وہ ناصر نہیں ہے جو فرد جرم سے پہلے کا ناصر تھا۔ یہ ناصر اسی ناصر میں کہیں تھا مگر ہم اسے دیکھنا نہیں چاہتے تھے سننا نہیں چاہتے تھے"۔ (۴۰)

اگلی پیشی پر مقدمہ خارج ہو جاتا ہے۔ اس میں بیرسٹر صاحب نے اپنا کمال دکھایا تھا۔ کیونکہ وہ مقدمے کو ایسے رنگ دیتا ہے کہ اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے کیس کا رخ ہی تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ بھی ہمارے معاشرے میں جرم پایا جاتا ہے کہ اصل کو نقل میں بدل دیتے ہیں۔ سزا دینے کی بجائے نرس کو پاگل قرار دیا جاتا ہے۔ ہم ایسے لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لیتے ہیں۔ ہمارے ہاں ایسے وکلاء کی بھی کمی نہیں جن کا ذکر مرزا اطہر بیگ نے کیا ہے۔ اصل میں سماج میں یہی لوگ جرم کا سبب ہوتے ہیں:

"ایک ہی پیشی میں ۔۔۔۔۔۔ اگلی پیشی میں۔ پرسوں یہ مقدمہ خارج ہو جائے گا۔ ڈاکٹروں کے نمائندوں نے یہی بیان دینا کہ آج کی ذہنی مریضہ کے سابقہ بیانات میں بھی قطعاً ناقابل اعتبار ہیں۔ میں آپ کو باعزت رہائی پر پیشگی مبارکباد دیتا ہوں۔ اصل مبارک

باد کے مستحق تو آپ ہیں۔ بیرسٹر صاحب آپ کے ہاتھوں میں حقائق اور واقعات ایسے شکل بدلتے ہیں جیسے کوزہ گر کے ہاتھوں میں مٹی "۔(۴۱)

یہ مکالمہ تھا رہائی سے پہلے ملزم اور وکیل صاحب کا کہ کیسے اس نے ایک زناکار کو رہائی دلوائی۔ ناول کا اختتام بھی جرم سے اٹا پڑا ہے۔ سمنیال کی پہاڑی کھوہ میں چٹے سائیں کا انتقال ہو گیا ہے۔ ناصر، زہرہ، کبیر تینوں سمنیال گاؤں جاتے ہیں۔ ساتھ اپنے مدد علی جو غلام باغ کا کھوجی بھی ہے۔ اس کا دماغ مکمل طور پر خراب ہو گیا ہے۔ لوگ اس کو اب گونگا سائیں کہتے ہیں۔ چٹے سائیں کا جانشین مقرر کر دیا جاتا ہے۔ گدی نشینی کی تقریب میں زہرہ بھی گاؤں والوں کے ساتھ دھمال ڈالتی ہے۔ لوگ بھی اسے دیکھ کر خوش ہوتے ہیں لیکن اصل سوال یہ ہے کہ ایک پاگل کا دوسرے پاگل کو مجذوب بنا کر گدی پر بٹھانا کتنا بڑا جرم ہے کہ نفسیاتی مریض کا علاج کرانے کی بجائے اپنی روزی، روٹی کا بندوبست کیا ہے۔ ناقص عقیدہ لوگوں کا ایمان پہلے ہی کمزور ہوتا ہے اوپر سے ایسے لوگ جو بات بھی نہیں کر سکتے پیر بنا دیے جاتے ہیں۔

viii۔ کبیر مہدی کا قتل اور امبر جان کی خودکشی:

آخر میں امبر جان ان کا پیچھا کرتا ہوا پیچھے آ جاتا ہے۔ اس نے ایک بلڈوزر والے کو ہائیر کیا ہے، جو کبیر مہدی اور زہرا کی گاڑی پر پہاڑی کو گرا کر دفن کر دے گا۔ اس منظر کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے۔ جرم کرنے کا انداز بڑا خوفناک ہے ملاحظہ ہو:

"بلڈوزر کے آپریٹر نے امبر جان کو بتایا کہ بلڈوزر کا منہ جس جگہ لگا ہے وہاں سے اسے فل پاور سے آگے دھکیلنے سے مٹی کا ایک تودہ آگے کو اکھڑ کر گرے گا اور دوسری طرف جو بھی کھڈا شڈا بنا ہو گا سب دفن دفان ہو جائے گا۔ بس اس ہینڈل کو آگے کر کے لیور دبانے کی ضرورت ہے امبر جان نے گہرا سانس لیا اور ویسا ہی کیا"۔(۴۲)

زہرہ اور کبیر مہدی چھٹتے ہوئے ابھی چند قدم آگے بڑھے تھے تو ان کو محسوس ہو چکا تھا کہ مٹی کا ایک اور بڑا پہاڑ ان کے چند قدم پیچھے ہے۔ پھر ہر طرف مٹی کا ایک بادل چھا گیا۔ پھر انہوں نے گاڑی زور سے دوڑائی اور بچ نکلے۔ لیکن اگلے ہی لمحے امبر جان بڑے بڑے پتھروں کے نیچے لیٹ کر ایسا محسوس کرتا ہے کہ یہ ایک اہم مورچہ ہے۔ بس میں ضرور آج گولی چلاؤں گا۔ امبر جان بالکل بے جان ہو کر اپنے شکار کا انتظار کرنے لگا۔ یونہی کبیر چٹان کے قریب پہنچا امبر جان نے کبیر کی بائیں کنپٹی پر فائر کیا اور گولی آر پار ہو گئی۔ خون سے کبیر کا چہرہ بھر گیا ساتھ ہی امبر جان نے خودکشی کر لی۔ اس ناول کا خاتمہ ہو جاتا ہے لیکن ناول کا خاتمہ بھی جُرم سے ہوتا

ہے۔ آخر میں علاقے کا تھانے دار راجہ گل شیر آلہ قتل ضبط کر کے اس کیس کو داخل دفتر کر دیتا ہے۔ کیونکہ قاتل اور مقتول دونوں ختم ہو چکے ہوتے ہیں۔ غلام باغ ایک نفسیاتی ناول بھی ہے جس میں پلاٹ مضبوطی کی حد کو پار نہیں کرتا لیکن کہانی کی بنت نے اس میں انوکھا پن پیدا کیا۔ ناول میں جرائم نے اس میں دلچسپی کا عنصر شامل کیا۔ ناول کا ولن، امبر جان کا کردار بہت مضبوط ہے لیکن اس کے مقابلے میں کہانی کا ہیرو کبیر مہدی نہایت کمزور ہے۔ جبکہ ہیروئن زہرہ خوبصورت اور سلجھا ہوا کردار ہے۔ کرائم کے کرداروں میں امبر جان جیسے کردار ہمارے معاشرے میں ہر طرح کے بگاڑ کا ذمہ دار ہوتے ہیں جو اپنی خواہش کی تکمیل کے لیے کسی بھی حد کو چھونے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ زیادہ تر خواہش اس کی جنسی تسکین کی تکمیل کے لیے ہیں۔ ناول میں جرائم کا سبب اس کی خواہش ہیں جو ہر لمحہ اس جرم کروا رہی ہیں لیکن گنجینہ نشاط بنانے والے یاور عطائی نے تو ہر عمر ہر مکتبہ فکر اور ہر جرائم پیشہ افراد کے گردے خراب کیے ہیں۔ ماہر امراض گردہ والوں کا یہ کہنا ہے کہ گردہ انسانی جسم کا اکاؤنٹنٹ ہوتا ہے۔ اگر یہ کام کرنا چھوڑ دے تو انسان مر جاتا ہے اور ایسے افراد جو قوت باہ کی گولیاں بناتے ہیں ان پر قتل کی دفعہ لگتی ہے کیوں کہ انہوں نے قتل جیسا جرم ہی کیا ہوتا ہے۔ اگر ہم ان لوگوں کے اشتہار دیکھیں تو ہر جگہ لکھا ہوتا ہے کہ انسان کبھی بوڑھا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ سب جرائم پیشہ افراد انسان کے قاتل ہوتے ہیں۔ انہیں جرائم کا ذکر مرزا اطہر بیگ نے اپنے ناول ''غلام باغ'' میں کیا ہے لیکن میرے نزدیک یعنی مقالہ نگار کی رائے میں جرائم پیشہ وہ لوگ ہیں جو خودکشی کرتے ہیں۔

ہر وہ آدمی جو اپنے آپ کو جنسی طور پر مضبوط کرنے کے لیے ایسی ادویات کا سہارا لیتا ہے، مجرم ہے جتنی قدرت نے طاقت دی ہے اس پر بھروسہ کیا جائے کہ اس نے مجھے انسان یا مرد بنایا ہے تو اس میں تخلیقی قوت بھی رکھی ہے۔ کیا ضرورت ہے کہ اس قوت میں چار گنا اضافہ کرنے کی۔ اکثریت حکیموں کی افیون اور سفوفوں میں تانبا یا کاپر کو جلا کر دوائی ڈالتے ہیں جس سے دوائی کی طاقت میں اضافہ ہوتا ہے لیکن کاپر اگر ٹھیک طور پر نہ جلے تو وہ انسان کے گردوں میں سوراخ کر دیتا ہے۔ نفرالوجسٹ (ماہر امراض گردہ) والوں کا یہ کہنا ہے کہ زیادہ تر ہمارے پاس جو کیس آتے ہیں وہ ان لوگوں کے ہوتے ہیں جو زیادہ ادویات کھاتے ہیں یا ان کا بلڈ پریشر کسی وجہ سے کنٹرول نہیں ہو رہا ہوتا۔ شوگر کی وجہ سے گردوں کو نقصان آہستہ آہستہ ہوتا ہے لیکن ان طاقت آور گولیوں کی وجہ سے مریض کی موت یقینی ہو جاتی ہے۔ یا وہ ڈائیلائسز پر چلے جاتے ہیں۔ میری نظر میں جرائم میں گاہک اور دکاندار دونوں برابر کے شریک ہیں۔ اطہر بیگ نے اپنے ہیرو کو جو کردار دیا ہے وہ معاشرے میں اپنی پہچان ہی ان ادویات سے بناتا ہے۔ جبکہ ولن جو ہے وہ جنسی ہوس کا مارا ہوا ہے اور اس کی ہوس سے اور

یاور عطائی کی بیٹی زہرہ جو کہ ایک پڑھی لکھی خاتون ہے، بھی محفوظ نہیں ہے پہلے اس سے دست درازی کرتا ہے پھر اپنے کمزور حریف کبیر مہدی کو گولی مار کر ہلاک کر دیتا ہے۔ ہمارے معاشرے میں وارداتیں روز مرہ کا معمول ہیں۔ انہی چیزوں کی عکاسی اطہر بیگ نے کی ہے۔

پہلے بھی لکھا ہے کہ اس ناول میں نفسیاتی کشمکش کے علاوہ معاشرتی جرائم جیسے ہم روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ کہانی کا انتہائی خطرناک ولن امبر جان ہے۔ سمگلر اور بلیک کا مکروہ دھندہ کرنے والا قاتل، زوال آدم خاکی شیطان صفت بدترین درندہ مثال۔ امبر جان جنسی ہوس، زنا، حسد، غرور، تکبر اور جرم و انتقام کی آگ میں بھرا ہوا جہنمی انسان جائز وناجائز دولت کمانے کے علاوہ عورتوں کے گوشت کا شیدائی۔ جنسی تسکین میں وقت کی بڑھوتری جیسے شوق نے اسے یاور عطائی جیسے گنجینہ نشاط کے ماہر کا دوست بنا دیا تھا اور وہ یاور عطائی تو لالہ جی اور زندگی دینے والا کمال ماہر جیسے القاب دیتا ہے۔ کبھی یہ کہتا ہے کہ میں نے جوانی لٹانے والے بڑے شعبدے دیکھے ہیں۔ جو جادو تمہاری گولیوں اور سفوفوں میں ہے وہ پوری دنیا میں نہیں ہے۔ یاور عطائی تم دنیا کے سب سے بڑے جوانی دینے والے ہو۔ اندر سے یاور عطائی بھی یہ کہتا ہے کہ میں نے ایک درندہ صفت، جنگلی خونخوار کتے کو اپنے پاؤں چاٹنے پر لگا لیا ہے۔ ہر جرائم پیشہ کی طرح وہ بھی کمینہ دوست اور دشمن چھوٹے بڑے کی تمیز سے نابلد ہے۔ اس کی بہترین مثال پنجابی کے مشہور شاعر میاں محمد بخش نے دی ہے۔

نیچاں دی اشنائی وچوں نہیں کسے پھل پایا
کِکرتے انگور چڑھایا ہر گچھا زخمایا(۴۳)

اس نے اپنے دوست یاور کی بیٹی پر جنسی حملہ کیا۔ زہرہ اس سے نفرت کرتی ہے لیکن اس کے بھائی پیسے کے لالچ میں آکر امبر جان سے اس کا رشتہ طے کرتے ہیں۔ امبر جان زہرہ کے جسم کو فتح کرنے کے لیے کبیر مہدی جیسے انتہائی کمزور حریف کو گولی مار دیتا ہے جبکہ وہ اس بدنما بیل کو دیکھ کر نفرت کرتی ہے اور تھوک دیتی ہے۔ ڈاکٹر اقبال آفاقی نے شؔ غلام باغ شِ کے بارے میں لکھا ہے کہ اطہر بیگ نے ہمارے معاشرے کے چہرے سے جرائم زدہ پردے کو بے نقاب کیا ہے۔ اس بارے میں وہ لکھتے ہیں:

> ”اس نے اس طرح پاکستانی انسان کا وہ چہرہ بے نقاب کیا ہے جو آفاقی اور لازمانی اقدار کی پاسبانی کا دعویدار ہے لیکن جب ذاتی مفاد کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو وہ اسفل ترین سطح پر اُتر آتا ہے۔ حق وانصاف، درست اور نہ درست کے سارے قواعد وضوابط کو پس پشت ڈال کر سفاک قسم کا ڈکیت بن جاتا ہے“۔(۴۴)

میری رائے میں ڈاکٹر اقبال آفاقی کا تبصرہ جائز ہے لیکن یہ سب جرائم جن کا ذکر ناول میں ہے طبقاتی کشمکش کا نتیجہ ہے جس کی بڑی وجہ غربت اور ناخواندگی ہے۔

اطہر بیگ نے ہمیں یہ بتایا ہے کہ پاکستان کو بنے ہوئے ستر سال سے زیادہ ہوگئے ہیں لیکن اس کی انسانیت اب بھی جرائم پیشہ کا چھرو، پگلوں، مخدوموں، چودھریوں، ملکوں، مزاریوں، خانوں، کھوکھروں، لغاریوں، پیرزادوں، ڈبہ پیروں، جعلی مولویوں کے محاصرے میں ہے اور یہ محاصرہ دن بدن تنگ ہو رہا ہے۔ کسی جگہ سے دیوار کمزور ہوتی ہے تو انسانیت پر حملہ کر دیتے ہیں حالانکہ آزادی کے بعد یہ تمام چور بازاری ختم ہو جانی چاہیے تھی۔ مثبت اقدار کو فروغ دینا چاہیے تھا۔ لبرل ازم، خود مختاریت اور سب کا زندگی کے وسائل پر یکساں حق ہے لیکن جمہوریت اور سماجی مساوات وانصاف کے دعوؤں کے باوجود صدیوں کی گندی ذہنیت کا مداوا نہیں ہو سکا۔ نفرت انگیزی، توہم پرستی، خود غرضی اور جرائم کو حوصلہ ملا ہے۔ جبکہ ہمارے دیہی معاشرے کی حالت شہروں سے بھی ابتر ہے۔ وہاں تیتر تیتر رہا ہے نہ بٹیر بٹیر۔ نئے معاشی ڈھانچے، سماجی تعصبات اور مذہبی انتہا پسندی نے ہر چیز کا توازن الٹ دیا ہے۔ گاؤں میں اگر زمیندار ہے تو شہروں میں کاروباری لوگ بادشاہ بنے ہوئے ہیں۔ دیہی معاشرے میں لوگ زمینداروں کے رویوں سے تنگ آکر شہروں کا رخ کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے شہر دن بدن پھیلتے جا رہے ہیں۔ جہاں مسائل کے علاوہ جرائم میں بھی بے پناہ اضافہ ہوا ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے ناول میں جس حقیقت کو بیان کیا جن جرائم سے پردہ ہٹایا ہے وہ ہماری زندگی کی سچی تصویر ہے۔ ہمارے مجرمانہ رویے اور کلچر کی منظر کشی کی ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے اپنے ایک مکالمے میں کہا ہے کہ یورپی ادب کی طرح حقیقت کو لکھتا ہوں۔ حقیقت وہ ہے جو اصل میں ایک ادیب دیکھتا ہے وہ نہیں ہے جو دوسرے دیکھتے ہیں یعنی کسی چیز کے اسباب و محرکات جیسے میں بیان کرتا ہوں۔ اسی کے تحت ہی دنیا کا ادب لکھا جاتا ہے۔

یعنی دنیا جو سامنے دکھائی دیتی ہے۔ اس کی بجائے اصل میں دنیا تو وہ ہے جیسے میں اسے دیکھتا ہوں۔ کیا آپ اس حقیقت کو جھٹلا سکتے ہیں۔ وہ جو سادہ حقیقت ہے۔ اس کی حدود تو بہت جلد ختم ہو جاتی ہیں۔ جب آپ اس کے آگے بڑھیں گے تو ایک نیا ٹیکسٹ سامنے آئے گا۔ نیا بیانیہ، حقیقت کا نیا وژن سامنے آئے گا۔ وہاں کتنی ہی تحریکیں پیدا ہوئیں حقیقت کی نئی تفہیم کی ضرورت کے تحت۔ حتیٰ کہ صحافی سے بھی آپ توقع کرتے ہیں کہ وہ اصل حقائق تک پہنچنے کی کوشش کرے جو دکھائی نہیں دیتے اور واقعہ کی تہہ میں موجود ہوتے ہیں۔ فکشن نگار تو اس سے بھی آگے تک جانے اور اترنے کا پابند ہوتا ہے تاکہ انسان کے اندر کا معمہ جان سکے۔

حوالہ جات

۱۔ جے ایس میکنزی، سماجی فلسفے کا خاکہ، (مترجمہ) سعید احمد صدیقی، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء، ص۱۴تا۱۵

۲۔ ایضاً، ص۱۶

۳۔ شوکت صدیقی، (انٹرویو نگار) از اظہر جاوید، اخبار جہاں، ۳۰ اگست تا ۵ ستمبر ۱۹۹۹ء

۴۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، (حصّہ اوّل)، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۹ء، ص ۲۳

۵۔ ایضاً، ص۹۹

۶۔ ایضاً، ص۱۷۴

۷۔ ایضاً، ص۲۲۹تا۲۳۰

۸۔ ایضاً، ص۳۲۴

۹۔ ایضاً، ص۵۴۰

۱۰۔ دوستوئیفسکی، جرم وسزا، (مترجم)، ظ-انصاری، ڈاکٹر، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۵ء، ص۹۵،

۱۱۔ شوکت صدیقی جانگلوس، (حصّہ دوم)، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۴ء، ص ۲۴

۱۲۔ ایضاً، ص۳۰۵

۱۳۔ ایضاً، ص۳۳۶

۱۴۔ ایضاً، ص۳۳۵

۱۵۔ ایضاً، ص۳۳۷

۱۶۔ ایضاً، ص۶۳۸

۱۷۔ ماریو پوزو، گارڈ فادر، (مترجم) رؤف کلاسرا، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء، ص

۱۸۔ شوکت صدیقی، جانگلوس، (جلد سوم)، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۹ء، ص ۴۰۳

۱۹۔ ماں، میکسم گورکی، (مترجم)، ظ۔ انصاری، ڈاکٹر، دارالاشاعت ترقی، ماسکو، ص ۴۸۸

۲۰۔ عبداللہ حسین، قید سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۱۹۸۹ء، ص۷۵

۲۱۔ ایضاً، ص۸۵تا۸۶

۲۲۔ ایضاً، ص۸۹

۲۳۔ سورۃ بقرہ، آیت نمبر ۱۴۱، فتح الحمید، (مترجم)، فتح محمد خان جالندھری، گنج بخش روڈ، قدرت اللہ کمپنی، لاہور

۲۴۔ ادبیات سہ ماہی، مضمون نگار، امجد طفیل (اردو ناول قصہ ڈیڑھ صدی کا)، (حصّہ اوّل)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، ص ۳۰۵
۲۵۔ روبینہ الماس، ڈاکٹر، اردو ناول میں طبقاتی شعور، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۸ء، ص ۲۵۷
۲۶۔ ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، ہیئت، اسالیب اور رجحانات، (۱۹۴۷ء تا ۲۰۰۷ء)، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۲۰۱۶ء، ص ۱۶۳
۲۷۔ اطہر بیگ، مرزا، غلام باغ، الحمد پبلی کیشنز، پرانی انارکلی، لاہور، ۲۰۲۱ء، ص ۶۶
۲۸۔ ایضاً، ص ۶۹
۲۹۔ ایضاً، ص ۸۷ تا ۸۸
۳۰۔ ایضاً، ص ۱۳۰ تا ۱۳۱
۳۱۔ ایضاً، ص ۱۳۱
۳۲۔ ایضاً، ص ۱۳۲
۳۳۔ ایضاً، ص ۱۸۱
۳۴۔ ایضاً، ص ۲۰۰
۳۵۔ ایضاً، ص ۵۰۲
۳۶۔ ایضاً، ص ۵۰۶ تا ۵۰۷
۳۷۔ ایضاً، ص ۵۴۶
۳۸۔ ایضاً، ص ۶۳۰ تا ۶۳۱
۳۹۔ ایضاً، ص ۶۷۲ تا ۶۷۳
۴۰۔ ایضاً، ص ۶۷۴
۴۱۔ ایضاً، ص ۸۱۱
۴۲۔ ایضاً، ص ۸۱۴
۴۳۔ میاں محمد بخش، سیف الملوک بدیع الجمال، حمید بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۳ء، ص ۲۹۰
۴۴۔ اقبال آفاقی، ڈاکٹر، اردو ناول: نئی توجیہات و تعبیرات، صریر پبلی کیشن، لاہور، ۲۰۲۰ء، ص ۱۷۲

باب سوم:

منتخب اردو ناولوں میں معاشی جرائم کی پیش کش

معاشی جرائم کی مختصر تاریخ:

انسان کے زمین پر قدم رکھتے ہی معاش کے مسائل نے سر اُٹھانا شروع کر دیا کیونکہ انسانی بقا کے لیے روٹی کو بنیادی انسانی ضرورت کا درجہ حاصل ہے۔ تمام مکاتب فکر اس بات پر متفق ہیں کہ معاشی جرائم کا آغاز چوری سے ہوا۔ جب سے انسان کی پیدائش ہوئی ہے معاش کے ساتھ اس کا رشتہ ازل سے ہے کیونکہ خوراک حاصل کرنا اس کا فطری عمل ہے اس کے بغیر زندہ رہنا مشکل ہے۔ معاشی جرائم کی ابتدا چوری سے ہوئی، اس پر تمام مکاتب فکر متفق ہیں۔ ابتدائی دور میں جس میں کھیتی باڑی سے لے کر تجارتی کاروبار میں لوگ ایک دوسرے سے ملتے اور اشیاخوردونوش کے بدلے اپنی ضروریات کی اشیاحاصل کرتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ انسان نے ترقی کی۔ جاگیر دارانہ نظام یا سرمایہ دارانہ نظام بعد کی پیدائش ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام جس کی ابتدا مغربی یورپ خصوصی طور پر انگلستان کا مظہر ہے۔ ۷۰۰ء تا ۱۲۰۰ء تک گھریلو خاندانی نظام رائج تھا۔ ۱۲۰۰ء تا ۱۵۰۰ء تک یورپ میں احیاء العلوم کا دور ہے۔ ۱۴۹۰ء کے بعد یورپ ممالک نے اپنی حدود سے نکل کر بحری راستوں سے امریکہ اور دوسرے براعظموں کو دریافت کیا۔ ۱۷۰۰ء تک آتے آتے یورپی اقوام نے دنیا کی دولت کو اکٹھا کرنا شروع کر دیا۔

ان کے دولت اکٹھی کرنے کے تین ذرائع تھے۔ غلاموں کی تجارت، قذاقی اور لاطینی امریکہ کی کانوں کا سونا اکٹھا کرنا۔ اس دولت سے مغربی یورپ اور انگلستان میں گلڈ سسٹم کی جگہ برآمدی نظام آگیا۔ پرانی تجارت نے دم توڑ دیا اس کی جگہ نئی تجارت نے لے لی۔ ۱۷۰۰ء تا ۱۸۰۰ء تک سرمایہ دارانہ نظام نے دنیا کو جکڑنا شروع کر دیا۔ یورپ میں فیکٹریاں اور خام مال سے اشیا کی وسیع پیمانے پر تیاری شروع ہوئی، ایشیا اور افریقہ کے ممالک ان کی منڈیاں ٹھہرے۔ یورپیوں نے دوسرے ممالک کی صنعت کو تباہ کر دیا۔ ۱۸۲۰ء میں بھاپ کے انجن نے گویا انقلاب ہی برپا کر دیا۔ ایک کاریگر سارے دن میں جو دو یا تین چیزیں بنا کر روزی کماتا تھا اب پچاس سے ساٹھ چیزیں بنانا شروع ہو گیا۔ یہاں سے سرمایہ دارانہ نظام کی بنیاد پڑی۔ جب یورپی حملہ آوروں نے افریقہ اور ایشیائی ممالک کا رخ کیا تو وہاں مقامی صنعتوں کو تباہ کر دیا گیا۔ ۱۸۱۳ء تک ہندوستان ایک برآمدی ملک تھا جبکہ ۱۸۳۳ء تک درآمدی ملک بن گیا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی اس لوٹ گھسوٹ کی ذمہ دار تھی۔ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی

کے بعد مغل دور سے چھینی گئی بیس ہزار جاگیروں کو اپنے من پسند لوگوں میں تقسیم کر دیا جن کے ساتھ مل کر ۱۹۴۷ء تک لوگوں کو غلام بنائے رکھا۔ جاگیر دار اپنے علاقے کے بادشاہ ٹھہرے اور یہ استحصال آج بھی جاری ہے۔ ۱۹۰۰ء کے بعد سرمایہ دارانہ نظام نے اپنی مالی گرفت مضبوط کی اور جاگیر دار کا بازو بن گئے۔ ۱۹۴۷ء آزادی کے بعد حکمران بن کر ملکی وسائل پر قابض ہیں اور عوام کے معاشی استحصال میں بھی ان کا بنیادی کردار ہے۔

الف۔ معاشی جرائم اور الا العاصفہ (طوفانی ہوا) حسن منظر:

معاشی لفظ معاش سے ہے۔ معاش عربی زبان کا مؤنث لفظ ہے۔ اس کے معنی رزق، روزی، روزگار کے ہیں۔[1] انگریزی میں لفظ "Economics" ہے جس کے معنی ہیں نافع، کفایتی، معاشیاتی، معاشی پیسہ۔[2] دو یونانی الفاظ کا مجموعہ ہے۔ "ECO" بمعنی گھر اور "Nomos" بمعنی اکاؤنٹس کے ہیں۔ اس کے اصل معنی ہوئے گھر کے مالی اخراجات۔ مشہور ماہر معاشیات آدم سمتھ نے اپنی کتاب "دولت اقوام" میں اکنامکس کو دولت کا علم قرار دیا ہے جس میں اس کی پیدائش تقسیم اور تبادلہ شامل ہے لیکن اکنامکس کی جامع تعریف لائنل روبنز نے کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "Economics is the science which studies human behavior as a relationship between end and scarce means which have alternative use."

> ترجمہ:
> "معاشیات ایک سائنس ہے جو انسانی رویے کا مطالعہ کرتی ہے جس کا مقصد قلیل وسائل کو اس طرح مختص کرنا ہے کہ صارف ان کے اطمینان کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرے۔"[3]

روزی کمانے کے ایسے ذرائع جن سے زندگی کا تسلسل برقرار رہے معاش کہلاتا ہے۔ انسانی زندگی کے آغاز سے ہی انسان کی کاوش کا محور خوراک کا حصول رہا ہے تاکہ جسم اور زندگی کا رشتہ برقرار رہے۔ پیٹ بھرنے کے لیے انسان نے ہزاروں جتن کیے۔ معاش انسان سے جڑا ہوا ہے۔ دنیا میں زیادہ تر قتل و غارت اور جنگیں معاش کی وجہ سے لڑی گئی۔ انسان نے ابتدا میں جھونپڑی بنائی پھر بستی، قصبہ اور شہر بسائے۔ سرمایہ، محنت اور اجرت کے اوقات مقرر کیے۔ کارل مارکس نے اپنی کتاب "سرمایہ" میں معاش کے متعلق لکھا ہے:

"سرمایہ دنیا میں سر تاپا انسانیت کے لیے ایک ایک عضو خاک اور خون میں لتھڑا کر آیا ہے"۔[4]

اسی سرمائے کے زور پر کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے حقوق پر ڈاکہ معاشی قتل یا سنگین جرم کہلاتا ہے۔ جب سے ناول وجود میں آیا ہے اس نے باقی چیزوں کے علاوہ معاش کو بھی موضوع بحث بنایا ہے۔

اردو ناول نگاروں نے اپنے کرداروں کے ذریعے معاشی ناانصافی، کسان اور مزدور کا استحصال پر بہت لکھا ہے۔ ممتاز مفتی، مستنصر حسین تارڑ، عبداللہ حسین، حسن منظر اور قرۃ العین حیدر نے اپنے ناولوں میں معاشی مساوات، کسان اور مزدور کے حقوق پر زور دیا ہے۔ میرے موضوع صرف تین ناول شامل ہیں جن کے خصوصی مطالعے میں معاشی جرائم پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے کہ ان ناولوں میں حسن منظر کے ''العاصفہ''، ''دھنی بخش کے بیٹے'' اور طاہرہ اقبال کا ناول ''نیلی بار'' ہے۔

i۔ حسن منظر کے ناول ''العاصفہ'' (طوفانی ہوا) میں معاشی جرائم:

حسن منظر کا پورا نام سید منظر حسن ہے۔ پیشے کے لحاظ سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے زندگی کا زیادہ حصّہ عرب ممالک میں گزارا ہے۔ ۱۹۸۲ء میں ان کے افسانوں پہلا مجموعہ ''رہائی'' شائع ہوا اس کے بعد پانچ مزید مجموعے آئے۔ بعد میں ان کے ناولٹ ''روکنگ چیئر''، ''ماں بیٹی'' منظر عام پر آئے۔ پھر یکے بعد دیگرے ناول ''العاصفہ''، ''دھنی بخش کے بیٹے''، ''وبا''، ''انسان اے انسان'' اور ''حبس'' شائع ہوئے۔ زیادہ عرصہ بیرون ملک رہنے کی وجہ سے مقامی سطح پر کم جبکہ بین الاقوامی زیادہ لکھا ہے۔ جتنی انہوں نے دنیا میں سیر و سیاحت کی وہ تمام تجربات ان کے تخلیقی عمل کا حصّہ ہیں۔ ان کا ناول ''العاصفہ'' یعنی ریت کا طوفان جس میں عرب بدوؤں کی زندگی، مالی استحصال، تہذیب، معاشرت کے ساتھ ساتھ وہ کن مالی مشکلات کا شکار ہیں، ان کا ذکر بڑی عمدگی سے کیا گیا ہے۔ میرے مقالے میں ''العاصفہ'' کے اندر پائے جانے والے معاشی جرائم کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینا ہے کہ کس طرح سعودی بھائی اپنی تیل جیسی دولت کو انگریزوں کو کوڑیوں کے داموں فروخت کر رہے ہیں۔ اس سے صرف اوپر والا طبقہ مستفید ہوتا ہے جبکہ مزدور اور نچلا طبقہ پس رہا ہے۔ عرب نوجوان اپنی راہ سے ہٹا ہوا ہے اور ہر وقت دو دو تین تین بیویاں رکھنے کی خواہش دل میں لے کر جوان ہوتا ہے۔ ''العاصفہ'' میں تمام حقیقتوں کو فنکارانہ ٹریمنٹ کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔ ''العاصفہ'' میں زید اور اس کے باپ ابن سعید کی کہانی ہے۔ بدو معاشرہ کیسا ہے؟ تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ زید کو اپنے باپ اور عرب شیخوں سے نفرت ہے کہ آخر یہ لوگ خلفائے راشدین کی طرح زندگی کیوں بسر نہیں کرتے۔ خلفائے راشدین کے کپڑوں میں پیوند لگے دیکھے گئے تھے جبکہ یہ حکمران سمندر کنارے خیمہ بستیاں بنا کر نوجوان لڑکیوں سے

تمتع کرتے ہیں اور قومی دولت تیل کو یہودیوں کے ہاتھوں سستے داموں فروخت کر دیتے ہیں۔ ناول کا ہیرو زید بدو نسل سے تعلق رکھتا ہے۔ وہ کئی زبانیں جانتا ہے اور اکثر انگریزی، عربی زبانوں کا ملغوبہ بنا کر بات کرتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ عربی، فارسی، اردو اور ہندی کے اخبارات کو با آسانی انٹرویو دے سکتا ہے لیکن اس کا ایک مسئلہ یہ ہے کہ لہجہ خالص عربی ہونے کے ناتے گیراج کو جیراج، مینگو کو مینجو، مسجد کو مسگد، پنسلین کو بنسلین اور پ کو ب پڑھتا ہے۔ مسٹر وارین اس کا انگریز دوست ہے جو اس کے ساتھ آئل کمپنی میں کام کرتا ہے۔ اس ملک سعودی عرب میں شراب پر پابندی ہے جس رات وارن کو اچھی شراب پینی ہوتی تھی وہ پہلے کمپنی کے ڈاکٹر سے فون پر بات کرتا۔ جو خفیہ قسم کی ہوتی تھی۔ پھر مجھے مطب یعنی میڈیکل سنٹر جانے کا حکم ہوتا تھا۔ ڈاکٹر مجھے سر سے پاؤں تک دیکھتا پھر مجھے ایک یوم کی میڈیکل لکھ دیتا۔ وہ مجھے کپڑے میں چھپا کر کوئی چیز دیتا تو میں اس کی گاڑی میں لے کر بندر گاہ تک جاتا وہاں ایک کانے شیخ کی حکومت تھی۔ کھلے عام شراب پینے اور بیچنے پر پابندی ہے لیکن وہاں بندر گاہ پر حکم انگریز کا چلتا ہے۔ اس لیے ہفتہ وار کوٹہ کے تحت شراب ملتی ہے چھپ کر پینا جائز سمجھا جاتا ہے۔ ہماری اپنی کھجور کی کچی شراب پی کر لوگ چیختے ہیں اور عدالت میں پہنچ جاتے۔ قاضی ان کو سزا تجویز کرتا ہے۔ وہ ان گھناونے جرائم کی تصویر اس طرح کھینچتا ہے:

> ”ک میں انگریز افسر اپنا فالتو کوتا (Quota) اور شراب کے منکر (Teetotalers) پورے کا پورا عربوں کے ہاتھ بیچ ڈالتے ہیں۔ اس طرح لوگ پیتے بھی ہیں اور ملک کی پارسائی کا بھرم بھی قائم رہتا ہے۔ ان انگریزوں میں سے یا اس کے کسی بھی مقامی ایجنٹ سے اگر واقفیت ہو جائے تو شراب ہمارے ملک میں بھی لائی جا سکتی ہے۔ اس وجہ سے وارین مجھے اپنے لیے ضروری سمجھتا تھا۔ ہفتے کے ہفتے اس کے یہاں ان دنوں بال (Ball-ناچ) ہوتا تھا اور مجھے ک جانا پڑتا تھا۔ میری وہاں ایک سے نہیں کئی انگریز افسروں سے شناسائی ہو گئی تھی جو مجھ پر وارین ہی کی طرح بھروسہ کر سکتے تھے“۔[۵]

ناول میں وارین انگریز کے لیے اس لیے شراب لا رہا تھا اس نے مجھے دفتر میں پکی نوکری کا وعدہ کیا تھا اور دفتر سے ایک ایتھوپیا کا کلرک استعفیٰ دے کر اپنے ملک واپس جا رہا تھا۔ مجھے بھی پورا یقین تھا کہ کام بن جائے گا۔ دوسری طرف میں نے غور سے دیکھا تو میرا باپ مزدوروں کے ساتھ آرہا تھا۔ میں سائیکل کے پیڈل مار کر آگے چلا گیا۔ میں والد کے پاس اس لیے نہیں رکا کہ وہ ہر بار یہی کہتا تھا کہ تم بائیس سال کے ہو گئے ہو شادی

کیوں نہیں کی۔ جب میں آپ کو دنیا میں لایا تھا تو اس وقت میری عمر بارہ سال تھی۔ بار بار ایسی باتیں سن کر مجھے غصّہ آتا تھا کہ خود تو شراب پی پی کر اس نے اپنابُرا حال کر لیا ہے لیکن اب بھی عیاشی کرنے سے باز نہیں آتا۔ یہ سب ہمارے شیخوں کی طرح دیکھ کر کرتے ہیں۔ انگریز ہمیں عیاشی پر لگا کر خود ہماری دولت کو دونوں ہاتھوں سے لوٹ رہے ہیں لیکن اس میں انگریزوں کا قصور بالکل نہیں ہے بلکہ ہمارے بڑوں کا ہے جو ہمارا معاشی استحصال کر رہے ہیں۔ یہ مجرم ہیں کیونکہ ہمیں نوکری کرنے کے لیے انگریزوں کی چاکری کرنا پڑتی ہے۔ زمین تو سب رہنے والوں کی ہے پھر یہ معاشی طور پر ہمیں کیوں غلام بنا رہے ہیں۔ میں دس سال سے محنت کر رہا ہوں لیکن ابھی تک مزدور کا مزدور ہی ہوں۔ یہ ایک عام عربی کی سوچ ہے جو سعودی باشندہ ہے۔

ii۔ آئل کمپنیوں کے مالی جرائم:

حسن منظر نے "العاصفہ" کا ناولٹ لکھ کر ہمیں ایک تواردو دان طبقہ کو عرب دنیا کی تہذیب و تمدن، مالی پریشانیاں، ثقافت، رہن سہن گھریلو حالات، غیر ملکی آئل کمپنیوں کی مالی اجارہ داری پھر اس میں بدو نچلا طبقہ جن کی زندگی خوشحال ممالک میں بھی جانوروں جیسی ہے۔ عورتیں عام طور پر عصمت فروشی کرتی ہیں اور بچے، جوان اور بوڑھے شراب اور عورتوں کے رسیا ہیں۔ ان کو یہ فکر نہیں کہ ہمارے ملک کی دولت امریکی لوٹ لوٹ کر لے جا رہے ہیں۔ ایک دن ایسا آئے گا کہ زمین بھی ان کو جواب دے دے گی۔ یعنی تیل کے کنویں سوکھ جائیں گے۔ زید کی تنخواہ ۳۰ دینار ہے اور وہ اپنا خرچہ کر کے اپنے تیرہ بہن بھائیوں کو بھی پال رہا ہے۔ انڈین اور امریکی فلمیں بھی انہیں پیسوں میں دیکھ لیتا ہے۔ کپڑے اور کھانے کی اشیاء بھی اسی تنخواہ سے پورے کرتا ہے۔ گھر والے اس کو خط لکھ رہے ہیں کہ آپ کی اور آپ کی بہن کی شادی کرنی ہے پیسے بھیجو۔ باپ کو اگر میں الگ سے پیسے بھیجوں تو وہ شراب میں اڑا دیتا ہے۔ پھر کہتا ہے کہ گھر کی چھت بوسیدہ ہو چکی ہے مزید پیسے بھیجو۔ والدین کو کیوں سمجھ نہیں آتی کہ سارا پیسا تو گورے کھا جاتے ہیں ہمیں تنخواہ خاک ملے گی، ہمارا تیل اور ہم بھی ان کے نوکر، شراب وہ ہمیں لا کر دیتے ہیں۔ جرائم پیشہ وہ ہیں کہ ہم، ہم نے صرف دو چار چیزیں دیکھی ہیں۔ عورتیں، گاڑیاں، اچھے مکانات بس اور کچھ نہیں، جہاں ستر سالہ ملک کسی اٹھارہ سالہ لڑکی سے شادی کرتا ہے، وہ خودکشی کر لیتی ہے تو بولتے ہیں کہ کلہ واحد جنگ کا خطرہ ہوتا ہے۔ تیاری بالکل نہیں کی کلہ واحد لڑکی پیدا ہوئی،

لڑکے کی امید تھی، کلہ واحد شادی کی بچہ پیدا نہیں ہو۔ دوسری شادی کر لی، تیسری کر لی۔ کلہ واحد، اگر ہماری دولت غیر لوٹ کر فرار ہو رہے ہیں، کلہ واحد میں غریب سائیکل پر گھوم رہا ہوں، بڑا شیخ لیموزین پر گھوم رہا ہے۔ کلہ واحد، محمد بادوغیش اور عبدالرحمٰن زید کے دوست ہیں۔ تینوں آپس میں باتیں کر رہے ہیں۔ عبدالرحمٰن کہہ رہا کہ میں نے یورپ بلکہ پوری دنیا دیکھی ہے۔ دنیا بہت آگے ہے۔ ہم خلیج والے بدو ہی رہیں گے۔ عربوں کو اب جاگنا ہو گا۔ ہمیں دو گھوڑا بوسکی نسل اور پٹرول کے علاوہ بھی سوچنا ہو گا۔ یہاں تیل کی صورت میں سونا نکلتا ہے لیکن ذہنی پیاس کو بجھانے کے لیے جاسوسی نالوں اور الف لیلہ جیسی کہانیوں کے عربی ترجمے والی کتابیں بیروت سے چھپ کر آتی ہیں۔ ہم عربوں نے اپنے ساتھ خود ظلم کیا ہے۔ ہم نے مہنگے داموں فلسطین میں اپنی زمین یہودیوں کو فروخت کیں پھر اسرائیل بن گیا۔ اب امریکہ اس کی مدد کرتا ہے۔ تھوڑے بہت طیارے اور مہنگے داموں میں ہمیں بھی بیچ دیتا ہے۔ بتاؤ مجرم اسرائیل یا ہم۔ آئل کمپناں ہمارا آئل باہر لے کر جاتی ہیں خود اس کی قیمت مقرر کرتی ہیں۔ بس ہمارے رئیسوں کے باہر کے ملکوں میں اربوں ڈالر پڑے ہیں۔ اگر وہ نہ دیں تو آخر وہ سرمایہ تو ہمارا ہی ہوا نا۔ مالی جرائم ہمارے ساتھ ہوتے ہیں جو آئل کمپنیوں اور شیخ حضرات ہمارے ساتھ کرتے ہیں۔ اس گفتگو کے منظر کو ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے کہ اسرائیل جو کہ مستقل میں فلسطنیوں کا اجتماعی فون کرنے والا ہے اور گذشتہ پچاس سال سے کرایا ہے، ایک پیش گوئی ہے:

> ”ہم اسرائیل کا ذکر لے بیٹھے۔ یہ وہ لفظ ہے جس پر کوئی عرب خاموش نہیں رہ سکتا اور بحث میں اس نام کے آتے ہی سب متفق ہو جاتے ہیں۔ میں نے باپ سے پوچھا اگر ایک یہودی تم سے یہ مکان کرائے پر مانگے تو دے دو گے؟ اس نے جوش سے کہا کبھی نہیں۔ اگر خالی پڑا ہو اور وہ تمہیں اوروں سے زیادہ منافع دے تب؟ تب بھی نہیں۔ لیکن تم دے چکے ہو۔ کیسے؟ اس نے تعجب سے پوچھا۔ میں نے کہا اگر میں تم سے کہوں انگریز ہم پر حملہ کرنے والے ہیں تو میرا یقین کرو گے؟ اس نے کہا لازم۔ میں نے پوچھا کیوں؟ اس لیے کہ تم جھوٹ نہیں بولتے۔ پھر سنو میں نے کہا ہماری اور کمپنیاں جو کروڑوں ڈالر کما کر باہر بھیجتی ہیں۔ وہ یہودیوں کی جیب میں جاتے ہیں۔ میرا باپ ہنسنے لگا اور اس نے مجھے اس نگاہ سے

دیکھا جو بچوں پر ڈالی جاتی ہے۔ میں نے اسے سمجھانا چاہا کہ جن پٹرول کمپنیوں نے مل کر ہمارے تیل کی کھدائی کی تھی ان کے حصّہ دار زیادہ تر یہودی ہیں"۔(۲)

یہ ان عرب نوجوانوں کی سوچ ہے جو بالکل نچلے درجے کے ہیں اوپر والے تو ناشتہ بھی انگریزوں کی بنی ہوئی بریڈ سے کرتے ہیں۔ یہ اپنے ملک کے ساتھ مالی زیادتی کر رہے ہیں۔ ۹۰ سال سے ملک سے تیل نکل رہا ہے مجال ہے اگر ایک ریگ بھی تیار کی ہو۔ یہ شعور ہمیں وہ حکمران دیں گے جنہوں نے خود اپنا روپیہ باہر رکھا ہوا ہے۔ یہ تھی زید کی سوچ جس کو حسن منظر نے بڑے خوبصورت پیرائے میں ان آئل کمپنیوں کے مالی جرائم کا احاطہ کیا ہے۔ یورپی آئل کمپنیوں میں جہاں ان کی رہائش گاہیں ہیں، شراب حلال ہے جبکہ دوسری جگہ شرطے پکڑ کر قاضی صاحب کے پاس لے جاتے ہیں اور کوڑوں کی سزا ہوتی ہے۔ اگر کوئی غریب چوری کرے تو ہاتھ کٹتا ہے لیکن اربوں ڈالروں کی روزانہ آئل کی صورت میں چوری ہو رہے ہیں جو عیاش حکمران طبقہ کو نظر نہیں آتی۔ یہاں زید کرنے کے بعد پھر اپنے اندرونی حالات کی طرف پلٹ جاتا ہے وہ اپنی بہن لوٹو اور حیا کو دیکھتا ہے جو بیمار ہیں اور رنگت بھی خراب ہو رہی ہے۔ کبھی میں اپنی ماں کو دیکھتا ہوں جس نے بچے پیدا کر کر کے کنبے کو خاصا بڑا کر لیا تھا۔ باپ ہے تو وہ ہمیشہ میری کمائی کو حریصانہ نظروں سے دیکھتا تھا یہ تعداد اس کی وجہ سے تھی۔ کبھی کبھار میرا دوست عبدالرحمٰن بن سے گپیں لگانے آجاتا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ دوسرے ملکوں کی طرح فوج سے بغاوت اٹھے گی۔ ایک وقت میں کئی سوالات میرے ذہن میں گھومتے ہیں۔ جس طرح چمگادڑیں کمرے میں گھومتی ہیں۔ ہمارے گھر میں کون آرہا ہے اور کون جا رہا ہے۔ رات کے وقت بن بلائے مہمان کہاں سے آتے ہیں۔ ان میں سے کوئی بھی میرے باپ کا رشتہ دار نہیں۔ جس گھر میں ہم رہتے ہیں اس کی چھت بوسیدہ ہو کر گر رہی ہے اور آدھے سے زیادہ حصہ ناقابل رہائش ہے۔

کھجور کے تنوں سے بنا ہوا یہ چھت جس میں جگہ جگہ چیزیں پھسل جاتی ہیں اور ہمارے گھر کے باہر آنے والی گاڑیوں سے ہمیں کیا نسبت، کبھی ہمارے گھر میں محمد فاعور آرہا ہے اور آزادی سے ہمارے صحن میں گھوم رہا ہے جیسے ہمارا رشتہ دار ہو، کبھی محمد خمیس آرہا ہے۔ دونوں پکے شرابی ہیں اور مرد مار عورتوں کی طرح لگتے۔ ہیں یہاں آکر حسن منظر بدوؤں کے گھر کا اندرونی منظر بیان کر رہا ہے کہ پیسے نہ ہونے سے گھر ایک رنڈی خانہ کا منظر پیش کر رہا ہے۔ غریبوں کی عزت کی نیلامی صرف معاشی طاقت نہ ہونے کی وجہ سے ہو رہی ہے۔ اس معاشی بے انصافی اور جرم کا کون ذمہ دار ہے۔ ہم یا ہمارے حکمران۔ اس معاشی بے انصافی کو روکنے کے لیے نوجوانوں کو جاگنا چاہیے تاکہ حکومت تعلیم کو سب کے لیے یکساں مواقع دے اور وہ یہ سوچیں کہ ملک کا ہر شہری ایک جیسے

حقوق رکھتا ہے۔ نوجوانوں سے تین تین چار چار شادیاں کرنے کی خواہش کمزور پڑے اور وہ اپنے نفع اور نقصان کا خود فیصلہ کریں۔ ہمارے شاہی خاندان کے لوگ یورپ جا کر انگریز بن جاتے ہیں۔ لڑکیاں برقعے اور لڑکے پینٹ کوٹ پہن کر گھومنا اور اپنے شکار کی تلاش کرنا نہیں بھولتے اور لڑکیاں جیسے انگریز عورتیں اسکرٹ پہنتی ہیں اور اتنی باریک ٹانگوں تک جرابیں وہ بھی سیاہ رنگ کی تاکہ گوری ٹانگیں نمایاں نظر آئیں۔ اردن، مصر، لبنان کی پڑھی لکھی عورتیں بھی اب کپڑوں سے آزادی حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ ان الفاظ کو حسن منظر نے یوں بیان کیا ہے:

> "شاہی خاندان کی عورتیں اور جوان لڑکیاں ہماری یہ عورتیں جب برقع اتارتی ہیں تو دھکا سا لگتا ہے۔ اس میں ایک ماڈرن مغربی عورت نکلتی ہے۔ اس کی تعلیم کی کمی کو مغربی لباس پورا کر رہا ہوتا ہے"۔(۷)

یہ وہ چیزیں ہیں جو سچ ہیں۔ عرب میں تو پردہ ہے پر جب یہ عورتیں یورپ جاتی ہیں تو ان کا نخرہ ہی الگ ہوتا ہے۔ ادھر قید ہے جبکہ اُدھر آزادی ہے۔ لباس سے عزت سے دوسروں سے پردہ کرنے سے پھر یہی عورتیں دو تین ماہ یورپ میں گزار کر واپس آ جاتی ہیں جیسے با پردہ پارسا عورتیں سختیاں سب غریبوں کے لیے ہیں۔ شاہی لوگوں کے لیے عیاشیاں ہی عیاشیاں ہیں خواہ وہ یورپ میں رہیں یا خلیج میں رہیں۔ ان کے محل، ان کی گاڑیاں، ان کے نوکر چاکر پولیس یعنی شرطے سب ان کا بے حد خیال رکھتے ہیں۔ اگر بربادی ہے تو بیچارے ہم غریبوں پر جو غیر ملکی کمپنیوں میں دھکے کھا رہے ہیں۔ وہ بھی اپنے ملک میں ہم ایک دوسرے کا معاشی قتل کر رہے ہیں یا انگریز لوگ جو ہماری زمین نیچے سے خالی کر کے ہی جائیں گے۔ حسن منظر نے اپنے فنکارانہ انداز سے ان مالی جرائم کی گرہ کشائی کی ہے۔ اس میں لوکیل کے تجربات، جغرافیہ، تہذیب، سیاق و سباق، سماجی اقدار واضح نظر آتی ہیں اور اس میں عربی معاشرت، عربی الفاظ جابجا استعمال کیے ہیں جیسے ساعۃ (گھڑی) سجارۃ (سگریٹ) کراہلاً (کیا حال ہے) گف (اسٹاپ) واللہ ما ادری (واللہ میں نہیں جانتا) - لبن (دہی) باخرہ (چھوٹا جہاز) فول (بڑے بیج) ناول میں ایک انوکھی چیز یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ زبان کے سٹرکچر کو توڑے تو حسن منظر اردو ناول میں عربی کا استعمال کر کے اس کے سٹرکچر کو توڑا ہے۔

ایک کردار اس میں حسن منظر نے منیرہ کا ڈالا ہے اس ناول کا ہیرو زید بھی دلچسپی لیتا ہے اور وہ اس سے اکثر ملاقات کرنے کے لیے اس کے اپارٹمنٹ میں جاتا ہے۔ مجھے اس سے محبت ہے لیکن میں اظہار کرنے سے

ڈرتا ہوں۔ لڑکیاں تو ویسے بھی اظہار محبت سے شرماتی ہیں۔ زید نے اس سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا۔ نہ وہ یہ بات سن کر چیخی نہ چلائی تم اس لئے مجھے میلونیا کے گھر بلاتے ہو اس نے کہا اور میرے لیے بھی لاتے ہو۔ اس نے اپنا برقعہ پکڑا اور چلی گئی۔ میں دور تک اس کو دیکھتا رہا۔ میری یہ محبت بھی میرے باپ کی وجہ سے جاتی رہی۔ وجہ یہ تھی کہ میں نے جو اس کو سونے کا ہار بھیجا تھا باپ نے اصلی بیچ دیا اور نقلی اس کو دیا تھا۔ یہ جرم باپ کا تھا جس کی سزا مجھے ملی۔

iii۔ عربی شیخوں کی عیاشیاں اور آئل کمپنیوں کی من مانیاں:

ناول کے ہیرو زید اس کا دوست بادوغیش اور عبد الرحمن اکثر اپنے ملک کی صورتحال کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اور یہ باتیں ان کے دلوں کو اچھی لگتیں۔ محمد بادوغیش روزانہ نئی سے نئی خبر لاتا۔ کبھی وہ یہ کہتا کہ فلاں شیخ نے نئی لینسیا (Lanecia) خریدی ہے جو اٹلی کی رولس رائس ہے دیکھنے میں بھی خوبصورت چلنے میں بھی باکمال سنا ہے کہ وہ اتنی مہنگی ہے کہ ہم غریبوں کے لیے دس، پندرہ گھر بن سکتے تھے۔ وہ بھی عالیشان، فلاں تاجر اپنی بیوی کو چھے مہینے کے لیے لبنان بیروت بھیج رہا ہے تا کہ تازہ فضا میں وہ نکھر جائے جیسے کوئی فیکٹری سے نئی گاڑی ہوتی ہے۔ شاہی خاندان میں سے اس سال گرمیاں منانے کے لیے کون کون سوئٹزر لینڈ جا رہا ہے۔ بعض شہزادوں نے تو وہاں سفید شیر بھی رکھے ہوئے ہیں۔ ان کے لیے یہاں بھی ایر کنڈیشنڈ کمرے بنے ہیں۔ شیروں اور ہرنوں کے لیے نایاب قسم کے ہرن تو پاکستان سے لائے جاتے ہیں۔ یہاں پر بڑے شہروں سے شکرے لیے شکاری ہرن اور پرندوں کا شکار بھی کرتے ہیں۔ پہلے ہمارے صحراؤں میں بھی ہرن نظر آتے تھے لیکن ان شیخوں کی وجہ سے یہ خوبصورتی بھی جاتی رہی کیوں کہ ہمارے شیخ بڑے ظالم ہیں انسانوں کا احترام نہیں کرتے۔ جانوران کے سامنے کیا چیز ہیں۔ ہمارے شہزادے اور شیوخ ہیلی کاپٹر اور نیچی اڑان والے جہاز لے کر ہرنوں کا شکار کرتے تھے۔ یہ ان کی عادتیں پکی ہو چکی ہیں۔ انسانوں کو بھی یہ جانور ہی سمجھتے ہیں۔ عبد الرحمٰن اور بادوغیش کی یہ باتیں دل کو بھلی لگتیں کیوں کہ وہ سچ بول رہے ہوتے ہیں۔ ناول نگار نے سچ کا پرچار کیا ہے۔ حکمران کسی ملک کے بھی عیاشی کریں عوام تو باتیں کرتے ہیں جیسے ہمارے سابقہ حکمرانوں کی کرپشن کی باتیں ہماری عوام کا دلچسپ موضوع ہوتی ہیں۔ جب ہم نجی یا کسی بھی محفل میں بیٹھے ہوتے ہیں۔ حسن منظر نے اس منظر کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

> "ایسی نہیں کہ فلاں شیخ نے تیسری لینسیا (Lancia) خریدی ہے جو اطالیہ کی رولس رائس ہے۔ فلاں تاجر اپنی بیوی کو چھ مہینے کے لیے بیروت بھیج رہا ہے تا کہ وہاں کی نرم فضا

میں ایک بار پھر اس کا موتی سا رنگ نکھر آئے۔ جیسی اس نے لی تھی اور ایسی ہو کر لوٹے جیسے فیکٹری سے نکلنے والی کار شاہی خاندان سے کون کون اس سال گرمیوں گزارنے سوئٹزرلینڈ جا رہا ہے اور کس شہزادہ نے سفید نمبر کا جوڑا منگوایا ہے اور اس کے لیے ایئر کنڈیشنڈ قفس بنوا رہا ہے۔ اتنا بڑا کہ اس میں چھوڑے ہوئے ہرن شکار کر سکیں جو پاکستان سے لائے جائیں گے"۔(۸)

یہ وہ سچ ہے جو عام عربی کر رہے ہیں کہ ہر بڑا آدمی اپنے اپنے چکر میں ہے۔ اپنی خواہش کو پورا کرنے کے لیے شیروں کے میلوں لمبے پنجرے بنا رہا ہے تو کوئی نئی نئی کروڑوں ریال کی گاڑیاں خرید رہا ہے۔ کوئی اپنی بیوی کو خوبصورت بنانے کے لیے آب و ہوا تبدیل کرا رہا ہے، بڑے شہروں مالدار شیخ حضرات ان شکار گاہوں میں شکروں کے ساتھ خوبصورت پرندوں کا شکار کرتے ہیں۔ حالانکہ یہ قدرت کی خوبصورتی کو ختم کر رہے ہوتے ہیں۔ ان کی شکار نگاہیں شکار کی طرح خوبصورت عورتوں کی تلاش میں بھی رہتی ہیں۔ عوام کا غصّہ اور غلیظ و غضب یہ ہے کہ دولت کی منصفانہ تقسیم چاہتے ہیں۔ بقول کارل مارکس: "اگر تین چار سو گھر آپس میں تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ ایک جیسے نظر آ رہے ہیں تو معاشرے کو کوئی فرق نہیں لیکن اگر کوئی آ کر بہت بڑا محل تعمیر کر دے تو یہی معاشی جرم ہے کہ اس نے معاشرے میں بگاڑ پیدا کر دیا"۔

معاشرے میں بے جا اسراف ہی بگاڑ کا سبب بنتا ہے۔ دوسرے انسان کی ہوس تمام معاشی جرائم کی جڑ ہے۔ اس لیے تو علامہ اقبال نے فرمایا تھا:

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوع انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا(۹)

مارکس کے نظریات کے مطابق معاشی ناہمواری ہی جرم ہے۔ معاشرے میں معاشی مدد کا تعین ہونا چاہیے ورنہ معاشرے کا ردعمل ہوگا۔ وہ جرم کی شدت کی شکل اختیار کرے گا۔ مارکس کے نظریے کے مطابق جو نظام سرمائے کی طاقت کے بل بوتے پر قائم ہے وہ فی نفسہ ایک جرم ہے کیونکہ اس کو اخلاقی قدروں کی حمایت حاصل نہیں ہوتی وہی معاشرے میں بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ حسن منظر نے اپنے اس ناول میں عربی معاشرت کو اردو میں بیان کر کے اردو دان طبقہ کے لیے کمزور عربی طبقے کی معاشی مشکلات کو سمجھنے کے لیے آسانی پیدا کر دی ہے۔ بڑے طبقے کو کبھی شکرے کی آنکھوں والا تو کبھی عورتوں کا رسیا کہہ کر ان پر تنقید کی گئی ہے۔

میر تقی میر نے کارل مارکس سے بھی پہلے اپنے شعروں میں معاشی بے انصافی کے خلاف اپنا ردعمل دیا تھا۔ میر نے اپنی فکر کے ساتھ ف ڈگ چ "اور ف ق ط ض ڈگ چ "کا تصور واضح کیا کہ کچھ لوگ دوسروں کی محنت کا پھل ذاتی محنت کے بغیر لے جاتے ہیں ان کی ترجمانی یہ ان کا یہ شعر کرتا ہے:

امیر زادوں سے دلی کے مت ملا کر میر

کہ ہم غریب ہوئے ہیں انہی کی دولت سے (۱۰)

دو مصروں میں میر نے پوری بات کہہ دی کہ ہمارے حصّے کی دولت اور ہماری محنت کا پھل بڑے اور امیر کھاتے ہیں۔ ناول میں اسی لیے عربی شیخوں کی معاشی بے انصافی جو وہ اپنی عیاشی کے لیے اپنے لوگوں سے کرتے ہیں بیان کی گئی ہے۔

محمد بادوغیش کے گھر جمعے کے روز تیسرے پہر اکثر آئل کمپنی کے ملازم تشریف لاتے۔ عبدالرحمٰن بھی ہمارے ساتھ ہی ہوتا۔ زید ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا۔ اکثر وہ اسی موضوع پر گفتگو کرتے کہ خشکی اور ساحل سے ذرا تھوڑا ساہٹ کر ہمارے حصّے میں بڑی کمپنیاں جو تیل کی کھوج لگاتی ہیں، یہ ہماری حکومت کے ساتھ دھوکہ بازی کرتی ہیں۔ حقیقت میں تو ہمارے ارباب اختیار بھی سادہ ہیں لیکن ہم ان کے خلاف منہ نہیں کھول سکتے۔ یہی امریکی اور یورپی کمپنیاں ہماری حکومت کی آڑ میں اپنی حکومت چلا رہی ہیں۔ کمپنی میں باہر کے ملک سے جو اخبارات یا کتب ورسائل آتے تھے پہلے تیل کمپنی ان کو سنسر کرتی ہیں تاکہ یہاں کے لوگوں کو باہر کی حقیقت کا پتہ نہ چل سکے۔ کچھ رسائل اور اخبارات میں سیاہی پھیر کر لائنوں کو مٹایا ہوتا جیسے تقدیر کا لکھا ہو۔ بعض کتب اور بعض صفحے بھی غائب ہوتے کیوں کہ کمپنی کو پسند جو نہ ہوتے۔ جو لوگ ان کتب ورسائل کے پیسے دیتے۔ وہ تو سر پیٹ کر رہ جاتے۔ کیونکہ جن ممالک سے یہ کتب آتی ہیں وہ بھی ایسے جرائم کو پسند نہیں کرتے۔ کبھی کبھی لوگ شرطے یعنی پولیس کو بلا لیتے۔ لیکن ان علاقوں میں کمپنی کی اپنی حکومت ہے الٹا پولیس کو دھمکیاں سننا پڑتیں کیونکہ یہ کمپناں چور ہیں۔ ہمارا معمولی دکاندار بھی ایک نہ ایک دن پکڑے جانے کے ڈر سے بے ایمانی نہیں کرتا۔ یہ کمپنیاں زمین سے زیادہ سے زیادہ تیل نکالتی ہیں اور کم سے کم دکھاتی ہیں۔ سب لوگ جانتے ہیں کہ سفید تاجر ملک کو لوٹ رہے ہیں لیکن مجرم گورے نہیں بلکہ ہمارے حکمران ہیں جنہوں نے آنکھیں بند کی ہوئی ہیں۔ ان کے معاشی جرائم کا نقشہ جسن منظر نے اپنے الفاظ میں ناول میں بیان کیا ہے۔

"ان تیل کمپنی کے تاجروں کا لین دین ایسا تھا جو ہمارے یہاں کے ایک معمولی دکاندار کو بھی شرماتا۔ ایک معمولی دکاندار ایک نہ ایک دن پکڑے جانے کے خیال سے ڈرتا ہے۔ یہ برلیونر، ترلیونئر تیل کمپنیاں زمین سے زیادہ سے زیادہ تیل نچوڑ کر کم سے کم دکھاتی ہیں اور

سدا رونا روتی ہیں کہ تیل کے ذخائر کم ہوتے جا رہے ہیں اور ان کا دھندا گھاٹے میں جا رہا ہے۔ جبکہ تیل کی کم بولی لگانے والے ان کے پسند کے ملک اور اس کی کمپنی کے ہاتھ بکتا ہے۔ سب جانتے ہیں کہ سفید تاجر ملک کو لوٹ رہے ہیں لیکن ملک تک میں ہمت نہیں ہے کہ انہیں ملک سے نکل جانے کو کہے۔ ایسا زور بس اپنے ملک والوں پر چلتا ہے یا ان کام کرنے والوں پر جو گرے پڑے ملکوں سے یہاں آتے ہیں۔ سب جانتے ہیں کمپنی والے سارق ہیں لیکن کس میں ہمت تھی ان سفید فام کمپنی والوں کے ہاتھ کاٹتا یا دے کھ دے کر انہیں ملک سے نکال باہر کرتا۔ یا شراب سازی پر ان میں سے کسی ایک کو تو کبھی کوڑے پڑتے اور یہ تیل دھوکا دھڑی کا کام تو جب ہی ختم ہو گا جب ہماری زمین اور ہمارے سمندر کی تہہ سے تیل کا آخری قطرہ تک کھینچ کر نکال نہیں لیا جاتا"۔ (۱۱)

ناول نگار نے یہ تمام معاشی جرائم کی ان لوگوں کی زبانی بیان کی ہے جن کے ممالک میں یہ جرائم ہوتے ہیں۔ پوری دنیا میں انرجی سورسز یا طاقت کے جو وسائل جن میں تیل اور گیس اہم ہیں، مسلمان ممالک دنیا کے ستر فیصد دولت کے مالک ہیں۔ جبکہ ۳۰ فیصد رقبہ دنیا کا ان کے پاس ہے لیکن افسوس کا مقام یہ ہے کہ تیل نکالنے والی ڈرل مشین جسے ریگ (رزا) کہتے ہیں ابھی تک کسی ایک ملک نے نہیں بنائی۔ افسوس کا یہی مقام ہے کہ مسلمان اتنا آرام طلب کیوں ہے؟ اگر ایک ظالم ہے تو دوسرا مظلوم۔ اگر مظلوم مزاحمت پر آجائے تو ایک نہ ایک دن وہ ظالم کا مقابلہ دلیری سے کرے گا۔ دنیا کی دس بڑی کمپنیوں میں سعودی عرب کی سعودیہ آئل کمپنی یعنی (Arimco) سالانہ تین سو بلین ڈالر سے بھی زیادہ کماتی ہے لیکن زیادہ ان کے شیئرز ہولڈر امریکی یہودی ہیں جو ان کو اعداد و شمار دیے جاتے ہیں آڈٹ بھی امریکی خود کرتے ہیں تو ان کو پکڑے گا کون؟ تیل زیادہ سعودی عرب سے نکالتے ہیں اور ریٹ ان کا برٹش پٹرولیم اور امریکی مقرر کرتے ہیں۔

دنیا کی دس بڑی آئل کمپنیوں کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔ سائنوپیک، چائنا پٹرولیم اینڈ کیمیکل کارپوریشن

1. Sinopec (China Petroleum $ camical corporation $ 233 bn. 2020

۲۔ پٹرولیم چائنا سالانہ آمدنی ۲۳۳ ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

2. Petroleum China $ 296bn. 2020

۳۔ سعودی آئل کمپنی آرامکو سالانہ آمدنی ۲۳۰ ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

3. Saudia Oil Company $ 230 bn. 2020

۴۔ رائل ڈچ شیل سالانہ آمدنی ۱۸۱ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

4. Royal Dutch Shells $ 181 bn. 2020

۵۔ برٹش پٹرولیم سالانہ آمدنی ۱۸۰ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

5. B P $ 180 bn. 2020

۶۔ ایکسن موبائل سالانہ آمدنی ۱۷۹ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

6. Exxon Mobile $ 179 bn. 2020

۷۔ ٹوٹل انرجیز سالانہ آمدنی ۱۲۰ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

7. Total Energies $ 120 bn. 2020

۸۔ سیوران سالانہ آمدنی ۹۴ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

8. Chevren $ 94 bn. 2020

۹۔ گیزپروم سالانہ آمدنی ۸۵ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

9. Gazprom $ 85 bn. 2020

۱۰۔ میراتھن سالانہ آمدنی ۷۰ارب ڈالر برائے سال ۲۰۲۰ء

10. Marathon $ 70 bn. 2020 (۱۲)

یہ وہ اعداد و شمار ہیں جو انکم کے ساتھ دنیا کی ۱۰ بڑی کمپنیوں کے ہاں ہیں۔ ان میں سب سے بڑی آرامکو ہے جو کہ سعودیہ کی ملکیت ہے۔ صرف ۲۰۲۰ء میں اس کے اثاثے کرونا بیماری کی وجہ سے اس کی پیداوار کم ہوئی تھی لیکن پھر بھی یہ تیسرے نمبر پر رہی تھی۔ آئندہ سالوں میں یہ پھر پہلے نمبر پر ہو گی۔ لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اس کا زیادہ سے زیادہ سرمایہ یہودی استعمال کرتے ہیں۔ یہی معاشی جرم ہے جو ارباب اختیار کی سمجھ میں نہیں آرہا۔ یہی وہ غفلت یا جرم ہے جس سے ان کے اپنے لوگوں کو کم جبکہ انگریزوں کو زیادہ فائدہ ہو رہا ہے۔ ان

اعداد و شمار سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ ناول نگار حسن منظر ادیب ہی نہیں بلکہ حقیقت نگار بھی ہیں جس نے امریکی معاشی غنڈہ گردی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

iv۔ آئل کمپنی کے مزدوروں کی حالت زار اور معاشی قتل:

امریکی آئل کمپنی جو سعودی عرب میں تیل نکالتی ہے اس کے مزدوروں میں پاکستانی اور ہندوستانیوں کی تعداد زیادہ ہے۔ ناول میں ان کی حالت زار پر گفتگو کی گئی ہے۔ ناول کے ہیرو زید بھی اسی کمپنی کا ملازم ہے۔ وہ اکثر ان پاکستانیوں کے گھروں میں چٹ پٹے کھانے کھانے کے لیے جاتا رہتا ہے۔ اس کے بقول اگر پاکستانی عربی کم جانتے ہیں لیکن خوش خوراک اور ہندوستانیوں سے زیادہ دلیر ہیں۔ اپنا حق لینا جانتے ہیں ان میں اکثر کو کبوتر اور تیتر بٹیرے پالنے کا شوق بھی ہے۔ ان کی رہائش میں کم کم ہی ائیر کنڈیشن دیکھے ہیں۔ جب کہ ان سے نچلے درجے کا امریکی ان سے اچھی تنخواہ لے کر شان سے رہتے ہیں۔ پاکستانی بہت زیادہ محنتی ہیں جبکہ ان کے مقابلے میں مصری اور سوڈانی صرف عربی بولنے کی وجہ سے زیادہ تنخواہ لیتے ہیں۔ کام کے معاملے میں صفر ہیں۔ مزدوروں کو اپنے مطالبات کو پیش کرنے کے لیے عربی دانوں کا یا انگریزی بولنے والوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ وہ اپنے جائز مطالبات لے کر انگریز کمپنی کو کھلا خط دینا چاہتے تھے۔ پہلے تو کمپنی کے انگریز افسر نے ان کو وقت نہیں دیا پھر انہوں نے انگریزی درخواست رکھ لی جب کہ مزدوروں نے ایک درخواست عربی زبان میں لکھ کر حکومت کے حوالے کی کہ وہ دن رات مزدوری کرتے ہیں لیکن ان کا اوور ٹائم اور مزدوری پوری نہیں دی جاتی یہ ان کا معاشی قتل ہے۔ میں زید ایک عربی اور مسلمانوں ہونے کے ناطے ان کے مطالبات کمپنی کی میٹنگ میں لے کر گیا کہ نسلی تعصب کی وجہ سے ان مزدوروں کے ساتھ انصاف کرو۔ ان کی مزدوری پوری دو لیکن انہوں نے الٹا ان کو ملک بدر کرا دیا کہ یہ لوگ فساد کرنا چاہ رہے ہیں اور عربی مالکان نے بھی انگریز کی بات ہی مانی اگر انصاف کرتے تو ان لوگوں کا جائز حق مل سکتا تھا۔ اس سارے واقعے کا حال ناول میں اس طرح لکھا ہے:

> ”پھر سننے میں آیا کہ میٹنگ کے چند دن بعد انہیں ملک بدر کر دیا گیا۔ ان میں سے ایک کمپنی سے ملا ہوا تھا۔ اسے بھی دکھانے کے لیے ٹھوکر ماری گئی اور وعدہ تھا واپس بلا لیں گے۔ لیکن اس کے خط کا جواب دیتے تب نا۔ ان لوگوں کو پاکستان پہنچنے تک پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کون تھا۔ جہاز پر بیٹھنے سے پہلے ان کے جواز السفر (پاسپورٹ) جہاز کے عملے کو دے دیے گئے تھے۔ وہ کوئی مسافر لانے لے جانے والا جہاز نہیں تھا۔ راستے بھر ان قسمت کے ماروں کو نہ کچھ کھانے کو ملا، نہ پینے کو سادہ پانی تک نہیں۔ کل تیس آدمی تھے“۔ [۱۳]

یہ حالات زید بیان کر رہا ہے۔ ان بد قسمت پاکستانی ورکروں کا جو اپنا معاشی حق مانگ رہے تھے لیکن پیسے کے پجاری اور مالی جرائم پیشہ گوروں نے ان کی ایک نہ سنی۔ اور سب سے بڑا مجرم تو عربی ہے جس کے ملک میں گوروں نے اپنی حکومت بنائی ہوئی ہے۔ الٹا ایک دن زید کو پولیس اسٹیشن بلا کر سرزنش کی گئی کہ تم ان غیر ملکیوں کی حمایت سے باز آجاؤ ورنہ انجام نوکری سے ہاتھ دھونا ہوگا۔ آگے چل کر مزید ناول میں عربی لوگوں کا حال لکھا ہے۔ یہ الفاظ حسن منظر کے ذاتی تجربے کا نچوڑ ہیں۔

"بے چارے کسی طرح دوبارہ اس ملک میں آنا چاہتے تھے۔ عرب کے کینے سے بڑھ کر اس کے اونٹ کا کینہ ہوتا ہے اونٹ کے کینے سے بڑھ کر امریکی کا۔ اگر فرنگی کا یہ نکتہ میرے پاکستانی دوستوں کو معلوم ہوتا تو وہ کبھی احتجاج پر آمادہ نہ ہوتے"۔(۱۴)

زید اور اس کے دوست یہ کہتے ہیں کہ یہاں سعودی عرب کے ٹرائیل مضحکہ خیز ہوتے ہیں۔ سر نہ کاٹنے یا رشوت نہ کرنے میں ایک فائدہ ہے۔ وہ یہ کہ اگر دنجن میں اتارنے کے دو چار، دس دن بعد یہ ثابت ہو جائے کہ مجرم نے حقیقت میں بغاوت نہیں کی تو پھر سزا صرف باغیوں کو دی جاتی ہے۔ یعنی رسی کے ذریعے اوپر چڑھنے کو کہا جاتا ہے۔ اگر اسی رسی ٹوٹ جائے تو جان گئی یا ہڈی پسلی ٹوٹ گئی۔ شوٹ کیے جانے کا سر کٹوانے کے بعد مجرم گیا تو بس گیا۔ زید کا دوست عبدالرحمٰن کا کہنا تھا کہ اگر دولت ایک فرد کا دماغ خراب کر سکتی ہے تو زیادہ دولت مند ہونا ایک قوم یا پورے ملک کا دماغ خراب کر دیتا ہے۔ ایک فرد کو جب وہ خود نہ چاہے، تمیز اور تہذیب نہیں سکھائی جا سکتی تو ایک قوم کو کیسے سکھائی جا سکتی ہے۔

v۔ سعودی عدالتوں کی عجیب سزائیں:

"العاصفہ" ناول سعودی لوکیل اور معاشرت و معیشت، تہذیب و تمدن پر لکھا گیا ہے۔ معیشت کی ناہمواری موضوع کا محور و مرکز ہے۔ میرا موضوع بھی معیشت کے اندر پائی جانے والی بے انصافی اور مزدوروں کا استحصال ہے۔ ناول کے اندر زید جو اس ناول کا مرکزی کردار ہے اس کے مطابق اس ملک میں عام انصاف تو نظر آتا ہے لیکن اس میں بھی غریب اور مالدار کے لیے انصاف کا پیمانہ الگ الگ ہے۔ غیر ملکیوں اور امریکیوں کے لیے انصاف کا ترازو الگ ہے۔ بات عدالتوں کی سزاؤں پر ہو رہی ہے۔ مثال کے طور پر سڑک پر حادثہ ہو جاتا ہے تو غلط لائن میں آنے والے کو تو سزا ملنی ہی ہے لیکن درست لائن میں آنے والے کو بھی سزا ملتی ہے کہ کیا تم نے کوئی نشہ کیا تھا کہ غلط طرف سے آنے والی گاڑی کو نہیں دیکھا۔ قاضی یعنی جج صاحب اگر چاہیں تو دو دو ماہ بعد فیصلے سنانے کا کہیں گے۔ انہیں چیزوں کو ناول نگار نے اپنے الفاظ میں بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو:

"اس ملک کے عجیب قانون ہیں، عجیب سزائیں، سڑک پر حادثہ ہو جائے تو جس کا قصور نہ بھی ہو اسے بھی تھوڑی سی سزا ضرور دی جاتی ہے۔ جیسے سڑک کا دو آٹو موبیل کا تصادم

جس میں جو غلط لا لین میں تھا اسے بڑی سزا ملی، تھوڑی سی اسے جو درست لین میں تھا کہ وہ پئیے ہوئے تھا جو اس نے نہیں دیکھا کہ کوئی سامنے سے غلط لائن میں آرہا ہے۔ بچ کیوں نہیں گیا۔ یہ ترائل وحشیانہ بھی ہوں تو مضحکہ خیز ضرور ہوتے ہیں۔ میرا ایک دوست کار کے حادثے میں ماخوذ ہوا اور سزا محبس کی ہوئی جہاں وہ دوستوں کے ساتھ رات کو جاتا تھا۔ سب رات گئے تک جیل میں تاش کھیلتے تھے کبھی ہوا سے پتے اڑتے بھی ہوں گے صبح وہ اپنے دفتر جا کر کام کرتا تھا"۔(۱۶)

اگر یہی کام کوئی امریکی کرتا تو وہ یہ بہانہ بنا دیتا کہ میں آئل کمپنی کا ملازم ہوں۔ جلدی میں مجھ سے حادثہ رونما ہوا ہے لیکن قاضی اسے یہ کہہ کر معاف کر دیتا ہے کہ جلدی سے انسان سے بھول بھی ہو سکتی ہے لیکن اگر یہی کام کوئی پاکستانی یا غیر عرب کرتا تو جرمانہ الگ اور سخت دو مہینے جیل کاٹنے کی سزا بھی ملتی۔ یہ عربی بڑے ظالم اور تعصب رکھتے ہیں۔ اس کو اپنی اعلیٰ نسلی سمجھتے ہیں۔

vi۔ العاصفہ:

العاصفہ کے بارے میں ڈاکٹر امجد طفیل رقمطراز ہیں کہ:

"حسن منظر نے انسان کی بے بسی اور لاچاری کے لیے "العاصفہ "بطور استعارہ استعمال کیا ہے۔ سعودی عرب کے جامد ماحول میں جہاں مذہب کے نام پر قبائلی روایات کو لوگوں پر مسلط کیا جاتا ہے اور خاص طور پر عورتوں کا ماحول اور رسومات کے جبر کا شکار بنایا جاتا ہے۔(۱۷)

سعودی عرب میں یہ گورے لوگ ریت کا طوفان ہیں۔ ایک دن ہم سب کو اڑا کر لے جائیں گے کیونکہ تیل آہستہ آہستہ ہر جگہ سے ختم ہو رہا ہے۔ زیر زمین پوشیدہ تیل کا ذخیرہ خشک ہو رہا ہے۔ ہم سمندر میں ایسے کھڑے ہیں جیسے اوندھی بستیاں۔ غیر ملکی آئل کمپنیاں چلانے والے اتوار بازار کی طرح اپنا سامان لپیٹ کر جا رہے ہیں۔ وہ تیل اب ختم ہو رہا ہے جس کی وجہ سے ہم دوسروں پر معاشی ظلم کرتے تھے اہلِ ہنر اور پیشہ ور عورتیں بھی اپنے اپنے ملک کو جا چکی ہیں۔ یہاں پر چند امریکی تھے۔ ادویات کمپنیاں شراب، لڑکیاں مرد کو جوان کرنے والی دوائیاں اب تو لگتا ہے طیور بھی انہیں کی اجازت سے اُڑتے تھے۔ مصری، پاکستانی اور لبنانی ڈاکٹر بھی اپنے اپنے ملک جا چکے ہیں۔ ایک ہم ہی بے کار رہ گئے ہیں۔ آج سے ساٹھ سال قبل جب تیل کے ذخائر دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اہل ہنر یعنی فرنیچر بنانے والے، سنار، درزی، عمارتیں بنانے والے سب اپنے تھے۔ نئے آنے والوں نے تیل کو من سلویٰ سمجھ کر کچھ نہیں سیکھا سوائے عیاشی کے۔ آگے چل کر حسن منظر آخر میں ایک مثال ایک عرب بیمار لڑکی کی دیتا ہے جو بیمار ہے جس کی بچہ دانی بالکل ختم ہو گئی ہے۔ اس کی نالی لگی ہوئی

ہے۔ جو بستر مرگ پر ہے۔ نالی سے خون رس رہا اس کا خاوند جو کہ شاہی خاندان کا فرد ہے۔ بیکار سمجھ کر ہسپتال میں داخل کروا کر چلا گیا ہے۔

ب۔ ناول دھنی بخش کے بیٹے میں معاشی جرائم:

دھنی بخش کے بیٹے حسن منظر کا ناول ہے جو ۲۰۰۸ء میں منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں صوبہ سندھ کے اندر جاگیرداری نظام اور اس سے پیدا ہونے والے معاشی جرائم کی عکاسی بڑے اچھے انداز میں کی گئی ہے۔ جاگیرداری نظام انگریزوں نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لیے رائج کیا تھا۔ ان لوگوں کو جاگیریں عطا کی تھیں جو مقامی حکومت کے خلاف انگریز کی مدد کرتے تھے۔ بعد میں ان نو دولتیوں اور ان کی اولادوں نے قوم کو اپنی رعایا سمجھنا شروع کر دیا۔ یہ زمین تو ان کے باسیوں کی تھی۔ کوئی برطانیہ کی زمین تو نہیں تھی نا۔ زمین تو طاقت ہوتی ہے۔ دولت ہوتی ہے۔ اختیار اور بڑائی کی علامت ہوتی ہے تکبر کی نشانی ہوتی ہے کیونکہ جتنا بڑا زمیندار ہو گا اس میں اتنا ہی بڑا رعب و دبدبہ اور تکبر ہو گا۔ زمین اور وسائل پر قبضہ کرنے کے لیے ایک ملک دوسرے ملک پر حملہ کرتا ہے۔ ماضی کی تاریخ ان ممالک اور حملوں سے بھری پڑی ہے۔ حسن منظر پیشے کے لحاظ سے میڈیکل ڈاکٹر ہیں۔ خلیجی ممالک اندرون سندھ ان کی پریکٹس رہی ہے۔ انہوں نے جو اپنی آنکھوں سے دیکھا اسے فکشن کی صورت میں پیش کر دیا۔ ایک جاگیردار دھنی بخش ہے جس کے بیٹے خدا بخش، احمد بخش، علی بخش اور بیٹی عائشہ ہیں۔ اولاد میں سب بُرے نہیں ہوتے اور نہ ہی سب اچھے ہوتے ہیں۔ حسن منظر نے دو کردار یعنی احمد بخش اور علی بخش کی صورت میں سندھ کی پسماندگی اور ترقی یافتہ دنیا کا تقابل پیش کرتا ہے۔ اپنی اس پیشکش میں وہ سارے سندھ کا احوال جاگیرداروں کے غریب ہاریوں پر ظلم اور ان کا معاشی استحصال دکھایا ہے کیوں کہ سندھ میں سروس کے دوران ان کو اپنے مریضوں کے توسط سے حقائق جاننے سے آگاہی ہوئی۔

انھوں نے اپنے اس مشاہدے میں ان جرائم پر سے پردہ اٹھایا ہے جو جاگیردار زمین، سیاست، مذہب اور پیسے کی آڑ میں کرتے ہیں۔ حسن منظر نے اس ناول کو لکھنے کے لیے سندھ کی خاک کو چھانا تب جا کر ایک اچھا ناول دھنی بخش کے بیٹے وجود میں آیا۔ علی بخش اپنی جاگیر کے گمنڈ میں مبتلا ہے اور جرائم کرنا غریبوں کا مالی و جانی استحصال کرنا اس کی ایک صفت ہے۔ علی بخش ایک دفعہ طیش میں آیا تو اس نے ریوالور پر نکال کر بے وفا کنجری کو وفا سکھانے کے لیے اس کے کوٹھے پر جا پہنچا تھا اور گھر کے بڑے اس کو دوسرے دن تھانے سے چھڑا کر لائے تھے۔ اس کے گھر کی عورتوں نے اس کی رہائی پر منت مانی تھی۔ جب وہ تھانے سے رہا ہو کر واپس آیا تو پورے گاؤں والوں کو خیرات دی گئی۔ ایک بوڑھے اندھے شخص نے خیرات کا کھانا کھاتے ہوئے دوسرے سے پوچھا

کہ یہ خیرات کس چیز کی ہے۔ دوسرے نے کہا کہ خیرات پہلے کھاؤ پھر میں بتاؤں گا کہ کس چیز کا کھانا ہے۔ اگر میں نے تم کو پہلے بتادیا تو تم کھا نہیں سکو گے۔ دراصل بات یہ ہے کہ یہ رنڈی کے کوٹھے پر پکڑا گیا تھا۔ حوالات سے چھوٹنے پر گھر آیا ہے۔ یہ خیرات اس کی رہائی کی ہے۔ بوڑھے نے کہا کہ وہاں پکڑا جانا کون سا گناہ ہے۔ وہاں مرد ہی پکڑے جاتے ہیں کبھی ہیجڑے بھی پکڑے گئے ہیں۔ لوگ علی بخش کی کوٹھی کو حوالات سمجھتے ہیں کیونکہ اس نے ایک کسان کے لڑکے کو جو بے پوچھے بنگلے میں آگیا دو گھنٹے الٹا ٹانگ کر رکھا تھا۔ ایک دفعہ اسے شکار کے دوران کوئی شکار نہ ملا تو مارے غصے کے اس نے کوے، چیل، الو، کتے، مرغیوں، بلیوں تک کو بندوق کا نشانہ بنایا تھا جس سے لوگوں میں خوف وہراس پھیل گیا تھا۔ جبکہ اس کا بھائی احمد بخش کتابیں پڑھنے والا اور سمجھ دار آدمی ہے۔ علی بخش کے کمرے میں برہنہ عورتوں کی بڑی بڑی تصویریں احمد بخش نے ہی ہٹائی تھیں۔ اب لوگوں میں احمد بخش کی دلیری اور علی بخش کے جرائم عیاں ہوگئے تھے۔ دھنی بخش کی وفات کے بعد اس کے بڑے بیٹے خدا بخش نے زمین اور لوگوں میں اپنا نام بنایا تھا جبکہ علی بخش اصل جاگیر دار کے روپ میں نظر آرہا ہے۔

خدا بخش اپنے ہاریوں سے پوچھتا تھا کہ اب فلاں جاگیر دار نے کونسی کھاد ڈالی ہے جو اس کی فصل ہم سے بہتر ہوئی ہے۔ ان کے بتانے پر وہ کھاد ڈالتا جس سے فصل اچھی ہوتی۔ وہ ہاریوں کے گھر دکھ سکھ میں جاتا تھا۔ جبکہ علی بخش کسی کو اپنے گھر آنے پر سزا دیتا ہے۔ شراب اور غریبوں کو پوری مزدوری بھی نہیں دیتا جبکہ یہ کہتا ہے کہ اگلی فصل پر دوں گا۔ اگلی فصل آنے پر پھر اگلی فصل کا کہہ دیتا ہے۔ غریب کسانوں کی بہو بیٹیاں روئی چننے کے موسم میں دن رات کھیتوں میں کام کرتی ہیں تاکہ فصل کی مزدوری آنے پر ان کی شادی ہو سکے۔ لیکن علی بخش کو وہ عورتیں اچھی لگتیں جن کے شوہر نشہ کرتے تھے جو بیویوں کے ساتھ کھیت میں نہیں آتے تھے کیونکہ ان کے ساتھ وہ اپنے منشیوں کے ذریعے عیاشی کرتا تھا۔ جوا کھیلتا ہے۔ سب سے بڑھ کر غریب کا حق کھاتا ہے جو کہ سراسر جرم اور گناہ ہے۔ اس کی پھوپھی رضیہ بھی ابھی تک کنواری تھی اس کے چہرے کی جھریاں اتنی گہری تھیں اور بچّے ان جھریوں میں انگلیاں دوڑاتے تھے کہتے تھے۔ یہ دادی امّاں کی طرح کی ہیں۔ جاگیر دار اپنی لڑکیوں کی شادی کم ہی کرتے ہیں۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ زمین کا حصّہ جائیداد میں دینا پڑ جائے گا۔ رضیہ بھی حقہ پیتی اور تسبیح پھیرتی رہتی تھی۔ علی بخش نے جو حکومت نے ان کو ٹریکٹر کے لیے بینک سے سود پر پیسے دیے تھے اس کی کار خرید لایا۔ تیسرے دن ہی اس کے گیارہ سالہ بھتیجے نے کار دوڑائی اور ایک غریب آدمی کو مار دیا۔ ساتھ کار بھی درخت کے ساتھ ٹکرا دی۔ لیکن پولیس بھی ان لوگوں کو گرفتار نہیں کرتی کیونکہ جاگیر دار ہیں۔ اس منظر کو حسن منظر نے یوں بیان کیا ہے:

"اگلی صبح پولیس والے آئے اور علی بخش اور اس کے گھرانے کے بڑے لوگ ان سے اولاق میں ملے۔ پولیس افسر نے کہا: سائیں کیس کی کچھ پرواہ نہیں کریں۔ کچھ مسلا (مسئلہ) نہیں ہے۔ مرنے والا معمولی آدمی تھا۔ اپنے بیٹوں کی جاتے ہوئے کچھ آمدنی ہی کرا گیا۔ جیتا رہتا تو ان کے لیے اس سے بڑھ کر اور کیا کرتا"۔(۱۸)

یہ تھے وہ پولیس کے جرائم جو اپنا فرض چھوڑ کر وہ پیسے والوں کی خدمت کرنا شروع کر دیتی ہے۔ حالانکہ چاہیے تو یہ تھا کہ اناڑی گاڑی ڈرائیور خواہ وہ کمسن ہی تھا مقدمہ بناتی تا کہ آنے والوں کے لیے عبرت ہوتی ہے اور مقتول کے ورثہ کو بھی تسلی ہوتی کہ ان کے ساتھ انصاف ہوا ہے لیکن ملکی قانون پر عملدرآمد کرانے والی پولیس، پولیس بننے کی بجائے ظالم کا ساتھ دیتی ہے جس سے اس پولیس کا مورال پورے ملک میں بہت کم رہ گیا ہے۔ اس ناول میں اگلا جرم بے جا پروٹوکول کا ہے جو ہمارے حکمران استعمال کرتے ہیں۔ کہیں دورے پر جائیں تو چالیس پچاس گاڑیاں پروٹوکول کی ہوتی ہیں جس میں مقامی رہنما اور عہدے دار بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ عوام کو دھوپ میں گھنٹوں ٹریفک کے کھلنے کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ کئی دفعہ ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ وزیر اعظم کے لیے ٹریفک روکی گئی تھی جس میں ایک ایمبولینس کو راستہ نہ دیا گیا جس سے مریض کی موت ہو گئی کہ وہ بروقت اسپتال نہ پہنچ سکا۔ ایسا واقعہ لاہور میں شوکت عزیز سابق وزیر اعظم کے پروٹوکول میں بھی ہوا تھا۔ عوام کی جان و مال کا تحفظ حکومت کی ذمہ داری ہے نہ کہ ان کو تنگی دینا۔ حسن منظر یہاں پر ایک منجھے ہوئے ناول نگار ثابت ہوئے ہیں جو ہر بُرائی خواہ وہ حکومت کی طرف سے ہو یا عوام کی طرف سے، پردہ اٹھاتے ہیں کہ ہم کدھر جا رہے ہیں۔ خدارا ان فضول رسموں سے پیچھا چھڑائیں۔ اس منظر کی مصوری ناول نگار نے اس انداز سے کی ہے:

"چارپائی والے رک گئے۔ لگتا ہے کوئی لمحہ جاتا ہے کہ ڈھانچہ پھسل کر پائنتی چلا جائے گا اور زمین پر گر پڑے گا۔ ان لوگوں کے ساتھیوں میں سے ایک نے اوپر آ کر انسپکٹر کے پیر پکڑتے ہوئے کہا صاحب میری ماں ہے۔ تھوڑی امید ہے کہ اگر ابھی ہسپتال پہنچ گئی تو شائد بچ جائے۔ انسپکٹر نے اس سے دور ہوتے ہوئے ایک سپاہی سے کہا۔ بھگاؤ اسے یہاں سے اگر جلوس ابھی یہاں آ گیا اور ان بھکاریوں پر وزیر اعظم کی نظر پڑ گئی تو سمجھیں گے ہم نے انہیں یہاں مظاہرہ کرنے کے لیے جمع کیا ہے۔ انہیں پتہ چلنا چاہیے کہ ایک بے بس مرتی ہوئی عورت گھنٹہ بھر سے یہاں دھوپ میں پڑی ہے"۔(۱۹)

آخر میں بوڑھی عورت مر جاتی ہے اور وزیر اعظم کا قافلہ گزر جاتا ہے جس میں ایمبولینس ہسپتال بھی تھا۔ لیکن غریب عوام کے حصّے میں صبر اور موت آتی ہے۔ حسن منظر نے ناول میں نااہل حکمرانوں اور کمزور عوام کی تصویر اتار کر حکمرانوں کی کارستانیوں کا مذاق اڑایا ہے جبکہ سمجھدار اور ترقی یافتہ ممالک میں ایسا

ہر گز نہیں ہے۔ وہاں عوام کے جان ومال کا تحفظ اولین ترجیح ہوتی ہے لیکن یہاں مجرمانہ رویے نے مجرمانہ کلچر کو فروغ دیا ہے۔

i۔ علی بخش کے مالی جرائم:

احمد بخش گاؤں کی گھٹن سے تنگ آکر شہر میں فلیٹ کرائے پر لے کر اپنی پڑھائی شروع کر دیتا ہے کیونکہ گاؤں سے شہر آنے میں اسے آدھا دن موٹر سائیکل پر لگ جاتا تھا تو اس کی ماں نے ایک عدد نوکر محرم کو بھی ساتھ خدمت گزاری کے لیے بھیج دیا تاکہ پڑھائی میں اس کو مشکلات کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ بڑا بھائی علی بخش اپنے جرائم پیشہ کاموں سے باز نہیں آرہا تھا جس سے تنگ آکر احمد بخش شہر میں آگیا تھا۔ سو ہوا یہ کہ ایک دن ان کا منشی شہر میں آیا۔ اس نے احمد بخش کو بتایا کہ آپ کے بھائی علی بخش چند دن آپ کے فلیٹ میں ٹھہریں گے۔ احمد بخش کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ اس کے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے۔ احمد بخش نے کہا کہ اب کی بار کوئی بڑی واردات کر دی ہے اس نے؟ منشی نے کہا کہ سائیں آپ پر بات نہیں آئے گی۔ بات دراصل یہ ہے کہ بڑے سائیں نے کسی کی لڑکی اٹھائی ہے۔ بات سن کر احمد بخش کو جیسے کرنٹ لگا ہو۔ منشی نے مزید کہا کہ پولیس کو پیسے دے کر بات کو دبا دیا ہے۔ کھیت مزدور کو اتنا مارا کہ وہ مر گیا۔ اس کے گھر والوں کو پیسے دے کر خاموش کروا دیا ہے۔ زمینداری کی یہی ٹھاٹ اور مزے ہیں۔ احمد بخش ناراض ہو کر مجھ سے کہتا ہے کہ غریب مزدور کو مزدوری دینے کی بجائے قتل کر دیا ہے اور کسی غریب کو عزت دینے کی بجائے اس کی لڑکی کو اغوا کر لیا ہے۔ اب کوئی کسر رہ گئی ہے جو یہاں میرے فلیٹ میں آکر پوری کرے گا۔ یہاں پر دراصل حسن منظر نے اچھائی اور برائی کا تقابل بھی کیا ہے۔ ساتھ ساتھ جاگیرداروں کے مالی جرائم پر بھی کھل کر لکھا ہے۔ اب اگلا اس کا جو مالی جرم ہے وہ ہمارے تمام جاگیردار کرتے ہیں ہر سال اربوں روپے زمین کی ہمواری اور بیج کھاد کے لیے آسان زرعی ترقیاتی بینک سے لیتے ہیں لیکن زمین پر خرچے کی بجائے سیاست اور اپنے اللوں تللوں پر خرچ کرتے ہیں ان کے ناجائز طریقہ واردات کو حسن منظر نے یوں بیان کیا ہے:

> ''کچھ نہیں میرے سائیں اسکریپر (Scrapper) کا معاملہ ہے۔ سب ہی زمیندار ایسا کرتے ہیں جو پیسہ لینڈ ڈیویلپمنٹ کے لیے ملتا ہے کچھ اپنے کام میں آجاتا ہے۔ کچھ افسر کو دے دیا جاتا ہے کہ جا کر عیاشی کر لے۔ کہہ دے زمین لیول ہوگئی ہے۔ ''ہوں'' احمد بخش کے منہ سے نکلا۔ اس دفعہ بات ذرا بڑھ گئی۔ زراعت کا محکمہ ہے۔ کوئی کسی کی پکڑ نہیں کرتا ہے۔ اوپر کے افسر اور بڑے سائیں میں معاہدہ ہوا ہے کہ ہزار، دو ہزار میں کس کا بھلا ہوتا ہے۔ اسکریپر ہی کو بیچ دیا جائے۔ اس کے آٹھ دس ہزار مل جائیں گے۔ وہ بھی ضرورت مند تھا یہ بھی ضرورت مند کاغذ میں دکھا دیا گیا۔ اسکریپر کو مرمت کے لیے بھیجا

گیا ہے۔ اب پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ دو چار دن میں بات دب جائے گی تو بڑا سائیں واپس بنگلے
میں چلا جائے گا"۔[۲۰]

یہ تھیں وہ باتیں جو حسن منظر نے ناول میں بیان کی ہیں جو کہ ہمارے معاشرے کی حقیقت ہے کہ پیسہ تو زمین کی ڈویلپمنٹ کے لیے لیا جاتا ہے لیکن وہ پیسہ اصل جگہ پر خرچ نہیں ہوتا جو کہ ملک کے لیے نقصان کا باعث ہوتا ہے اور اس کی زراعت کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا ہے۔ ناول میں آگے کہانی میں پتہ چلتا ہے کہ دس لاکھ کا لینڈ اسکریپر علی بخش ڈکار گیا ہے اور اب چھپنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ جب بات دب جائے گی یہ واپس آجائے گا۔ احمد بخش کو سب سے زیادہ دکھ یہ تھا کہ اس نے اپنے مزارعوں کے ذریعے مخالف زمیندار کی کھڑی فصل کو آگ کیوں لگائی تھی۔ کیا ایسا کوئی ہمارے ساتھ کرے تو ہمیں کتنا دکھ ہوگا۔ ہم کیوں کسی کا معاشی قتل کریں۔ اس کے خلاف پولیس کارروائی کریں گے۔ الٹا جرمانہ بھی ہوگا۔ لیکن یہاں ایک جرم دبتا ہے تو دوسرا منہ نکال لیتا ہے۔ جب احمد بخش منشی کی سرزنش کرتا ہے کہ میں ابھی زراعت والوں کو بتاتا ہوں کہ یہ کون سا افسر ہے جو سرکاری مال کو ہڑپ کر گیا ہے۔ منشی احمد بخش کے پاوں کو پکڑ کر کہتا ہے سائیں میں بھی اس میں رگڑا جاؤں گا۔ احمد بخش منشی سے کہتا ہے کہ فلیٹ کی چابی مجھے دو۔ لیکن منشی نے کہا کہ ساتھ کے گاؤں کے بوڑھے صوبیدار کی بیوی کو بھگا کر فلیٹ میں لے آیا ہے۔ عیاشی کر کے واپس چلا جائے گا۔ یہ باتیں سن کر احمد بخش اس وقت بہت رویا کہ خدایا یہ کیا ہو رہا ہے؟ کب تک ہوتا رہے گا؟ کون بڑے بھائی کو سمجھائے کہ ایسا کرنا سب کے لیے خطرناک ہے۔ نہ گاؤں نہ شہر میں ہم عزت سے رہ سکتے ہیں۔ آخر وارداتیں کرنے والا کب تک پولیس سے بچے گا۔ آخر کار سات دن کے بعد منشی فلیٹ کو خالی کر کے احمد بخش کے حوالے چابی کر دیتا ہے۔ اب احمد بخش کو بھی معلوم ہو چکا تھا کہ علی بخش نام کا زمیں دار ہے۔ اتنے کی اس کی زمین نہیں جتنا اس پر قرض چڑھ چکا ہے۔ زمین کی طاقت نے اسے اندھا کر دیا ہے۔

احمد بخش اس کی ان حرکتوں سے تنگ آکر امریکا چلا جاتا ہے۔ اس کے امریکہ جانے کے بعد اس کے ڈالروں سے وہ اور زیادہ عیاش ہو گیا۔ اس نے یکے بعد دیگرے حرمت، لاڈلی، روشنی، مریم، زلیخا سے شادی کی۔ بعد میں اس کے بیٹے نے باپ کی طرح اپنے سے بڑی عمر کی عورت سے شادی کی اور خالص زمینداروں کی طرح

بندوق اور شکار کا شوقین ہو گیا۔ علی بخش نے اپنی آخری بیوی مریم کو اس کے باپ سے نوٹوں سے خریدا تھا۔ ابھی اس کی عمر ۱۳ سال تھی، رنگ اس کا صاف تھا۔ گورے رنگ کی بنا پر اسے سسی کہا جاتا تھا۔ سسی سندھی میں چاند کو کہتے ہیں جو چمکتا ہو۔ اس عورت کی خریداری کو ان الفاظ میں حسن منظر نے لکھا ہے:

> "باپ اور بیٹی کے آنے کی علی بخش کو خبر تھی اور اس نے گنتی کر کے نوٹوں کا ایک پیکٹ اپنی سلک کی واسکٹ کی جیب میں رکھا تھا جو روئی کی فصل کی چنائی کا فیض تھا۔ یہ لڑکی کے باپ کے عربستان (سعودی عربیہ) کے سفر پر اور کام چلنے یا ملنے کے دنوں تک کا خرچہ تھا۔ اس نے لڑکی کے باپ سے پوچھا کب جانا ہے؟ کل یا پرسوں "ہوں" علی بخش نے بات کو سمجھتے ہوئے کہا۔ یعنی سفر کا انحصار علی بخش کی عطا پر تھا"۔[۲۱]

فصل آنے پر زمین داروں کی مالی فیاضی اور مالی جرائم عروج پر ہوتے ہیں۔ جن کو حسن منظر نے بیان کیا ہے کہ کس طرح روئی کی رقم آنے پر ایک بوڑھے شخص کی بیٹی کو عرب کا ویزا دینے کے چکر میں کمسن عورت سے شادی کر لیتا ہے۔ نہ نکاح پڑھا، نہ برات گئی بس پیسے دیے اور شادی ہو گئی۔ دوسرے علی بخش کے جھگڑے بھی عجیب قسم کے تھے اور دنیاداری بھی گھٹیا قسم کی تھی۔ زمین پر مقدمہ، قرض پر قرضے، پانی کی تقسیم پر فلاں فلاں امیدوار سے جھگڑا۔ اس کسان نے فصل کے معاملے پر دھوکہ کیا تھا۔ اسے پٹوانا ہے۔ الیکشن میں کھڑے ہونے کا عزم، وسکی کی قیمت، گرمی میں بھنگ پینے کے فوائد اور کون سی نئی ڈانسر اس علاقے میں دریافت ہوئی تھی۔ یعنی ہر کام جرائم پیشہ لوگوں والا۔ یہ سچی تصویر ہے ہمارے جاگیر دار کلچر کی جس کا ذکر حسن منظر نے بڑی عمدگی سے کیا ہے کہ کس کس طریقے سے کسان کا معاشی قتل کرتے ہیں۔

ج۔ناول نیلی بار میں معاشی جرائم:

طاہرہ اقبال کا ناول "نیلی بار" ایک اپنی نفسیاتی کشش کی وجہ سے اور دوسرا استحصالی نظام جس میں سرمایہ دار اور مزدور، جاگیر دار اور ہاری شامل ہیں، کی وجہ سے مشہور ہے۔ ناول میں انھیں چیزوں کو زیر بحث لایا گیا ہے۔ ناول میں پنجاب کی زرخیز زمین، لوگوں کا رہن سہن، اس علاقے میں پائی جانے والی نہریں، پرندے، جانور اور رسم و رواج کو بڑی ہنر مندی سے پیش کیا گیا ہے۔ "نیلی بار" کیا ہے اس کے محل وقوع پر نظر ڈالتے ہیں۔ پنجاب لفظ پانچ دریاؤں کی دھرتی کو کہا جاتا ہے۔ ان دریاؤں میں راوی، ستلج، بیاس، چناب اور جہلم شامل ہیں۔ یہ تمام دریا دریائے سندھ میں گرتے ہیں۔ دریائے سندھ جسے اباسین یا انڈس کہتے ہیں، اباسین کا مطلب ہے

"دریاؤں کا باپ" دریائے بیاس اور ستلج کے درمیانی علاقے کو "نیلی بار" کہا جاتا ہے۔ اس میں پاکپتن، قبولہ، عارف والہ، بورے والا، وہاڑی، لڈن اور میلسی شامل ہیں۔ راوی اور بیاس کے درمیان "گنجی بار" ہے۔ راوی اور چناب کا درمیانی علاقہ "ساندل بار" کہلاتا ہے۔ یہ علاقہ شیخوپورہ، لائل پور، ٹوبہ ٹیک سنگھ سے چنیوٹ، جھنگ تک پھیلا ہوا ہے۔ راوی اور بیاس کے درمیانی علاقے میں چیچہ وطنی، ہڑپہ، ساہیوال، اوکاڑہ اور کوگیرہ ہے۔ کسی بھی ناول میں زمان و مکان کا تعین لازمی شرط ہوتا ہے۔ مکان کا تعین طاہرہ اقبال میں "نیلی بار" کا علاقہ منتخب کر کے طے کیا جبکہ زمانہ انہوں نے ۱۹۴۷ء سے لے کر ۲۰۰۷ء بے نظیر کی شہادت تک کا منتخب کیا ہے۔ ناول "نیلی بار" کا کینوس بہت وسیع ہے۔ اس میں مقامی مٹی کی خوشبو، سماجی رویے، سیاست، معاشرے کی اچھائیاں اور برائیاں، علاقے کی رسومات، روایات، توہمات، جنسی رویے، زراعت، مویشی بانی، بد عقیدگی، جعلی پیری مریدی، فقیروں، گدی نشینوں، اَن پڑھ مریدوں، ظالم جاگیرداروں، بے رحم فیکٹری مالکان، صدیوں سے پسے ہوئے عوام، رسہ گیروں، ڈکیتیوں اور عالمی و ملکی سیاست کی ریشہ دوانیوں پر مشتمل ہے۔ میرا تعلق صرف اس ناول میں پائے جانے والے معاشی جرائم تک محدود ہے۔ "نیلی بار" ناول میں ۱۹۴۷ء میں ہونے والی ہجرت سے شروعات ہوتیں ہیں۔ بڑے کرداروں میں ملک فتح شیر خان، ذیلدا، فوجی نصیر، علی جواد معاویہ، پیر اسرار احمد، صفورہ بیگم، گل خان، صابر خان، زارا فتح شیر اور اس کا وزیر بھائی عبدالرحمٰن شامل ہیں۔ ناول دس ابواب اور پانچ سو چونسٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔ ناول کی ابتدا "نیلی بار" کے لوگوں کے رہن سہن سے ہوتی ہے۔ نیلی بار کی عورتیں گنجی بار کی عورتوں کی طرح لاچا پہنتی ہیں۔ ان عورتوں میں عجیب اسرار ہے۔ کہیں بہت بھدے نقوش، کالی رنگین جیسے کولی اور دراوڑی نسل کے قدیم باشندے ہوتے ہیں۔ مرد مضبوط جسم، سارا دن کھیتوں میں کام کرنے کی وجہ سے مٹی میں مٹی لگتے ہیں۔ علاقے میں جاگیرداروں کا راج ہے جن کے حکم کے بغیر کوئی بندہ وہاں رہ نہیں سکتا۔ آزادی کے بعد جالندھر، گرداس پور، امرتسر اور پٹھان کوٹ کے مہاجرین کی آبادکاری سے تھوڑی بہت تبدیلی ضرور آئی ہے لیکن راج بہرحال جاگیردار کر رہے ہیں۔ مہاجروں کو صرف دو دو، چار چار ایکڑ زمین ہی ملی ہے اگر کوئی بڑا کلیم لے کر آیا ہے تو اس کو دور دراز علاقے میں زمین ملی ہے۔ مہاجر عورتیں شلوار قمیض پہنتی ہیں۔ آئے روز مہاجر اور مقامی باشندوں میں رہن سہن اور ہلکی لڑائیاں ہو رہی ہیں۔ مقامی جاگیردار ٹینڈر الاٹ کروانے والے آبادکاروں کو گھس بیٹھیا تصور کرتے تھے۔ اس ناول میں سب سے پہلا جرم ایک شادی کی تقریب سے چار لڑکیوں کو اغوا کر کے ملک فتح شیر کے بندے اٹھا کر اپنے ڈیرے پر لے جاتے ہیں۔ پھر وہاں زنا کا بازار گرم ہے۔ لڑکیوں کے ورثا نے مقامی ذیلدار سے شکایت کی لیکن ملک فتح شیر

اس سے بڑا زمین دار تھا۔ اتنی آسانی سے قابو آنے والا نہیں تھا۔ پھر قدرت کا کرنا ایسا ہوا کہ ملک میں فوجی حکومت یعنی ایوب خان کا مارشل لاء آ جاتا ہے پھر خود ہی ملک صاحب ذیلدار کو لڑکیاں واپس کر دیتا ہے۔ دوسرا جرم جو ہے وہ خود فتح شیر کی بہن صفورہ جوان ہوتے ہی اپنے ہی جن جیسے ملازم کے کمرے میں چلی جاتی ہے وہاں اپنی عصمت شوق سے تار تار کروا دیتی ہے۔ پھر جب حمل واضح ہوتا ہے تو کنواری ماں کے لیے نت نئے القابات ایجاد ہوتے ہیں۔ کوئی یہ کہتا ہے کہ اس کنواری کو کسی نے دیکھا تک نہیں پھر اس کے ہاں قدرت نے عیسٰی، امام مہدی یا موسیٰ ہی پیدا ہو سی۔ ہر کوئی یہی خیال کر رہا تھا کہ واقعتاً کوئی عیسٰی مسیح پل رہا ہو۔ خبریں چھوڑنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ حویلی کے آس پاس کے باغوں سے عجیب خوشبو آ رہی ہے۔ کسی امام مہدی کا ظہور ہونے والا ہے۔ وڈے ملک صاحب نے بھی ایک دن حویلی میں ایسا ہی اعلان کیا۔ اس اعلان کی تصویر ناول نگار نے بڑی اچھی اتاری ہے:

> ”یہ اس گھرانے کے لیے بڑی سعادت ہے۔ بڑی عزت کا دن ہے کہ اس خانوادے میں امام مہدی علیہ السلام کا ظہور ہونے والا ہے۔ ہم اس قابل تو نہ تھے جس مقام پر رب سائیں نے ہمیں لا کھڑا کیا ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔ یا اللہ ہم اس امتحان کے قابل تو نہ تھے پر تو نے بوجھ ڈالا ہے تو پھر انکار کی مجال کس کو ہے۔ ہمیں سرخرو ہونے کی توفیق دے“۔ [۲۲]

صفورہ بی بی بالکل شانت تھی کہ واقعی میرے جسم سے خوشبو کی لہر اُٹھتی ہے۔ کوئی امام مہدی ہے آ رہا ہے۔ لیکن بڑا ملک اتنا بھولا بھی نہ تھا۔ اسے سب پتہ تھا اس نے اپنی بہن کو قتل کروانے کی عجیب واردات کھیلی۔ اس حبشی کو حکم دیا جس کا یہ بچہ تھا کہ ہم آپ لوگوں کو لاہور داتا صاحب سلام کے لیے بھیج رہے ہیں۔ راستے میں صفورہ کا کام تمام کر دینا۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ صفورہ کو قتل اور ٹکڑے ٹکڑے کر کے جنگل میں پھینک دیا جاتا ہے۔ ملک صاحب پہلے ہی لڑکیوں سے تنگ تھے کہ یہ یہاں کیوں پیدا ہو گئیں۔ الٹا تیس مربع زمین میں سے ان کو حصّہ دینا پڑتا۔ یہ مجھے لوگوں کے آگے سر جھکانے پر مجبور کرتیں چلو کام تمام ہوا۔ پھر اسی قاتل ڈکیٹ نوکر کو باندھ کر خصی کر دیا۔ بعد میں وہی ڈکیٹ اپنے بانجھپن کا بدلہ ملک کو گولی مار کر لیتا ہے۔ ساتھ ہی ملک کا بیٹا گولی مار کر ڈکیٹ کو اڑا دیتا ہے۔ پرچہ کٹتا ہے نہ مقدمہ چلتا ہے۔ کیونکہ ملک کا بیٹا عبدالرحمٰن اکیلا تیس مربع اراضی کا مالک جو ہو گیا۔ طاہرہ اقبال جو کہ خود جاگیر دار کے گھر پیدا ہوئیں، دادے الف دین کو پہلی جنگ عظیم میں بہادری دکھانے پر انگریز کی طرف سے گھوڑی پال مربعے ملے تھے۔ اپنے ناول میں جاگیرداری نظام کے خلاف ایک مضبوط آواز اُٹھاتی ہے جو ایک تو زمین کا بھوکا ہوتا ہے۔ دوسرا وہ اپنے علاقے سے معاشی طور پر کسی کو

اوپر آتا دیکھ نہیں سکتا۔ اب ناول میں اگلا مرحلہ ایوب خان کے مارشل لاء کا ہے۔ جس رات مارشل لاء لگا فوجی نصیر جس نے برما کے محاذ پر دوسری جنگ عظیم لڑی تھی ذیلدار صاحب کے بعد گاؤں کا سب سے پڑھا لکھا آدمی ہے۔ اس نے انگیز دور کی آٹھ جماعتیں پڑھی تھیں اور ان پڑھ دیہاتیوں کو عجیب عجیب خبریں سنا رہا تھا کہ آپ لوگ کل سے مزارعے نہ رہو گے کیوں کہ ایوب خان نے کہا ہے کہ میں زمینوں کو تقسیم کروں گا پورے گاؤں میں فوجی نصیر اور ذیلدار کے علاوہ کسی کے پاس ریڈیو نہیں تھا۔ فوجی نصیر رات دس بجے تک کی خبریں سن کر ٹرانسسٹر بند کر دیتا اور لوگوں کو کہتا ہے کہ آپ لوگ جن زمینوں پر کام کرتے ہیں یہ ذیلدار کے باپ کی نہیں ہیں بلکہ غداری کرنے کے صلے میں ذیلدار کے بڑوں کو ملی تھیں۔ انگریز نے بھی غداروں کو ہی نوازا تھا۔ نیا فوجی حکمران ایوب خان غریب کا حامی ہے آئندہ آپ زمینوں کے مالک ہوں گے۔ آپ لوگوں کے دن پھرنے والے ہیں۔ جو بندہ جو زمین کاشت کر رہا ہے وہ اس کی ہو جائے گی۔ آپ لوگ کب تک غربت کی چکی میں پستے رہیں گے۔ زمیندار آپ لوگوں کی محنت کا کھاتا ہے۔ آپ کو تو سوائے ذلت کے کچھ نہیں ملتا۔ نہ آپ لوگوں کے بچے پڑھ سکتے ہیں، نہ آپ لوگ ترقی کر سکتے ہیں۔ آپ لوگوں کی معاش پر تو زمینداروں کا قبضہ ہے۔ آپ لوگوں کی عورتیں جانور، دودھ، محنت، سب پر زمیندار کی حکمرانی ہے۔ اس سے چھٹکارا صرف فوجی حکمران ہی دلوا سکتا ہے۔ کل سے آپ لوگ ہی انہیں زمینوں کے مالک ہوں گے جن کی آپ کاشت کرتے ہیں۔ نوجوان مہاجروں کے لڑکے ایوب خان زندہ باد کے نعرے بلند کر رہے تھے۔ فوجی نصیر کے خطاب کو طاہرہ اقبال نے بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے:

> ”اوئے ناواقفوں، ان پڑھو! تمہیں کیا پتا کہ تمہارے حق میں کتنا اچھا ہوا ہے۔ پہلی بار سرکار نے تمہارے حق کی بات کی ہے۔ ایک جرنیل تمہارا بادشاہ بنا ہے۔ مصلیوں اور جانگلیوں کے ہاتھوں میں پکڑی حقے کی نئے وہیں ساکت رہ جاتی اور چلم کے انگارے بھسم ہوتے چلے جاتے۔ باہر پالا نہری پانیوں اور کھیتوں کی منڈیروں پر کہر بن کر جم جاتا، چار خانہ کھیسوں میں لپٹے مہاجر زور زور سے حقے گڑگڑاتے“۔ (۲۳)

فوجی نصیر خطاب سن کر اس کے پاس بیٹھے کسان ایک دوسرے سے کہہ رہے تھے کہ ایوب خان نے جو زرعی اصلاحات کا ذکر کیا ہے اس کا مطلب کیا ہے؟ وہ یہاں ملک میں کیا کرنا چاہتا ہے؟ لیکن فوجی نصیر انھیں کہہ رہا تھا کہ ”او پاگلو! اس کا مطلب ہے کہ جو مزارعہ جس کھیت کو کاشت کر رہا ہے اسی کھیت کا مالک بنا دیا جائے گا۔ کسان خوشی کے مارے پاگل ہو رہے تھے۔ ان کے حلق سے کڑوے تمبا کو کا ذائقہ سینے میں اتر رہا تھا۔ منشی متان

تو بڑے مدبرانہ کش لگا رہا تھا۔ ایک کسان بوڑھا اپنی کمزور آواز کے ساتھ کہہ رہا تھا فوجی میں ۳۲ نمبر مربعے کو کاشت کرتا ہوں کیا وہ کل میرا ہو گا؟ فوجی نصیر کہہ رہا تھا کہ کل چڑھتے سورج کے ساتھ آپ سب مالک ہو جائیں گے۔ ایوب خان فوجی شیر ہے۔ وہ تمام زمینداروں، تھانے داروں، ذیلداروں کو قطار میں کھڑے کر کے گولی مارے گا اور زمین آپ کے ہاتھ میں دے دے گا۔ پھر نعرہ بلند ہوتا ہے: ایوب خان زندہ باد، ذیلدار مردہ باد، زمیندار مردہ باد، فوجی نصیر ان کسانوں کے سامنے ایسے پھر رہا تھا جیسے وہ خود ایوب خان ہے۔ بس ایک ضرب سے سب کسانوں کو زمین دے دے گا۔ لیکن بابا کرم علی کہہ رہا تھا کہ تم لوگ نسلی غلام، غریب، مصلی، مزارعے اور چوہڑے ہو تمہاری قسمت کبھی نہیں بدلے گی۔ پھر کیا تھا ہر کوئی بابے کرم علی کو ڈھڈے مار رہا تھا۔ ساتھ ساتھ غریبوں کا دشمن بھی کہہ رہا تھا۔ فوجی نصیر کا خطاب اب تھمنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ وہ زور زور سے کہہ رہا تھا سنو کل ابھرنے والا سورج تمہارا ہے۔ تم ہی لوگ زمینوں اور حویلیوں پر راج کرو گے۔ ذیلدار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو گے۔ کل جو بھی کھیت کاشت کر رہا ہو گا وہ مزارع نہیں مالک ہو گا۔ مہاجروں کے لڑکے پھر نعرے لگاتے ایوب خان زندہ باد، فوجی نصیر زندہ باد۔ جبکہ جانگلیوں اور مصلیوں کے لڑکے چلاتے تھے کہ کیا اب یہ زمینیں ہماری ہیں؟ اب ہم بھوکے ننگے نہ رہیں گے۔ دوسرے دن کیا ہوا جن کسانوں کی باری نہری پانی لگانے کی تھی وہ ڈیوٹی پر نہیں آئے۔ ذیلدار نے دیکھا کہ سب فوجی نصیر کی بیٹھک میں بیٹھے ہیں۔ ذیلدار کے تو پیروں سے زمین نکل گئی۔ ذیلدارنی کو آج خود گوبر اٹھانا پڑ رہا تھا۔ کام کاج کرنے والی لڑکیاں مصلنیں غائب تھیں جبکہ ان کا پرانا منشی مستان دوسرے مزارعوں کو لے کر الگ سے بیٹھا تھا۔ وہ غریبوں کو بتا رہا تھا کہ کب سرکار کا حکم آ جائے تو وہ آپ کو زمین بانٹ دے گا۔ جب ذیلدار نے ساری صورت حال دیکھی تو وہ سمجھ گیا کہ یہ جانگلی غلام ابن غلام ہیں ساری چالیں ہندوستان سے آنے والے نئے آبادکاروں کی ہیں ورنہ ان جانگلیوں اور مصلیوں کا اتنا دماغ کہاں ہے کہ وہ ہمارے خلاف سوچ بھی سکیں۔ ہم ان کی روٹی کے مالک ہیں، ان کے جسموں کے مالک ہیں۔ ہمارے اناج سے یہ لوگ پلتے ہیں۔ ذیلدار نے گھوڑی اسی وقت سرپٹ دوڑائی اور تھانے پہنچ گیا۔ ابھی مجمع زمین تقسیم ہی کر رہا تھا کہ پولیس کی گارد نے دھاوا بول دیا۔ نئے نئے زمیندار بننے کے چکر میں اچانک حملے سے غریب کسان سنبھل ہی نہ پائے، پولیس ڈنڈوں، بٹوں اور بندوقوں کے بھٹوں سے سب کی چھترول کرنا شروع ہو گئی۔

منشی مستے کو الٹا لٹکا کر چھترول کی کیونکہ وہی بڑا پٹواری بن رہا تھا۔ جبکہ فوجی نصیر پولیس کو دیکھ کر بھاگ گیا تھا۔ مہاجروں نے گھروں کے اندر سے کنڈیاں لگا لی تھیں۔ پھر کیا ہونا تھا سب نوکر چاکر اپنے اپنے کام پر چلے

گئے۔ کام کرنے والی عورتوں نے ذیلدارنی کے پاؤں پکڑ لیے اور مردوں نے ذیلدار کے پاؤں پکڑ لیے۔ ساتھ ساتھ یہ بھی کہہ رہے تھے کہ فوجی نصیر نے ہمیں غلط پٹی پڑھائی۔ ہک واری معافی چا دیو ذیلدار جی۔ ادھر تھانے دار کی مرغے اور روسٹ سالم دنبے کے گوشت سے تواضع ہو رہی تھی۔ تھانے دار کہہ رہا تھا کہ ذیلدار صاحب یہ جو مہاجر آئے ہیں اصل فساد ان لوگوں کا ہے۔ یہی لوگوں کے حقوق کی بات کرتے ہیں ورنہ ان اَن پڑھ مصلیوں میں ہمت کہاں۔ ان کا مکو ٹھپنا پڑے گا۔ ان پر قتل یا ناجائز اسلحے کا کیس ڈالنا پڑے گا۔ نقص امن کی دفعہ کے تحت تو اس فوجی نصیر پر ابھی میں مقدمہ درج کرتا ہوں۔ بڑا آیا غریبوں کو زمینیں دینے والا۔ ذیلدار نے ہاتھ کے اشارے سے تھانے دار کو کہا کہ ایسا نہ کریں۔ یہ لوگ سب جدی پشتی ہمارے بردے غلام ہیں۔ بے زبان رعیت ہیں انہیں صرف گمراہ کیا گیا ہے ورنہ ان کی عقل میں ایسے باغیانہ منصوبے آہی نہیں سکتے۔ یہ صرف ہماری خدمت گزاری کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔ انہیں پہلا کلمہ نہیں آتا۔ میں نے گاؤں میں اسی لیے سکول نہیں بننے دیا کہ ان لوگوں کو عقل نہ آجائے۔ بس ایک فوجی نصیر اور دوسرے یہ نئے مہاجر لوگ ان کا دماغ خراب کرتے ہیں۔ فوجی نصیر اس لیے غنڈہ بن رہا ہے، ایک تو یہ فوجی ہے اور اوپر ایوب خان بھی فوجی آکر بیٹھ گیا ہے۔ ابھی مارشل لاء تازہ ہے بعد میں اس کا بندوبست کریں گے۔ پولیس جب کاغذی کارروائی کرکے رخصت ہوئی تو ذیلدار نے ان کے ساتھ چاول اور گندم کی بوریاں بھی تھانے دار کے لیے بھیج دیں۔ یہ تھی ہماری پولیس جس نے صرف مالدار کو فائدہ پہنچانے کا حلف اٹھایا ہے۔ غریب کو تو تھانے میں دھکے ملتے ہیں۔ انصاف تو ملتا ہی نہیں۔ ملک فتح شیر کو جب اس بات کا پتہ چلا تو وہ ذیلدار کے پاس آیا اور اسے حوصلہ دیا کہ جاگیر دار، جاگیر دار ہی ہے فوجی ایوب ابھی نیا نیا ہے ہمارے بغیر چل نہیں سکتا اور ذیلدار سنو جو تم نے واردات کی ہے میرا دل اس سے بڑا خوش ہے۔ اب تم آہستہ آہستہ مہاجروں کو تنگ کرو اور گاؤں سے بھگاؤ ورنہ ایک دن تمہاری بادشاہی ختم ہو جائے گی۔ غریب کسان اور یہ مصلی آپ کو کاٹ کھائیں گے۔ یہ مہاجر بھوکے ننگے لوگ ہیں ابھی کل یہ گٹھڑیاں اٹھائے سکھوں سے مار کھاتے ہوئے ادھر آئے تھے۔ اب یہ لوگوں کو بغاوت پر اکسا رہے ہیں جو کل تک ہمارے باپ دادا کے پاؤں چاٹتے تھے۔ زمین کے وارث ہم لوگ ہیں۔ یہ ہمارے کامے ہیں۔ ہم اس کو یہاں رہنے کی اجازت دیں گے جو ہماری رعیت بن کر رہے گا۔ مہاجر کون ہوتے ہیں ہماری بادشاہت میں مداخلت کرنے والے۔ ملک فتح شیر کے الفاظ کی تصویر طاہرہ اقبال نے ناول میں یوں کھینچی ہے:

> ”آپ تو جانتے ہیں سائیں۔ اپنی گرفت مضبوط رکھنے کو بعض اوقات رعیت کے ساتھ بھی
> سختی کرنی پڑتی ہے ورنہ پھر جو آپ کے ساتھ ہوا آپ جانتے ہی ہیں۔ ان غریبوں کو اگر آج

رج کے کھانے کو اور سر اٹھا کر چلنے کی آپ اجازت دے دیں گے تو ان کا کمینہ خون کل آپ کے ہی خلاف جوش مارے گا۔ انہیں بھوکا اور لاغر رکھو۔ ان کا سر انہی کے کمزور کندھوں میں دھنسائے رکھو۔ ان کی طاقت سے زیادہ ان سے کام لو۔ ان کی انا کو ہر روز کچلتے رہو کہ کہیں یہ اپنی کوئی عزت وعزت نہ بنا بیٹھیں۔ ان کی عورتوں کو ان کی عزتوں کو پامال کرتے رہو تا کہ بے غیرت بن کر خوفزدہ رہیں۔ جس روز یہ خوف کی کوکھ سے نکل گئے اس روز میری آپ کی بادشاہت بھی جاتی رہے گی کہ ہم تو مٹھی بھر ہیں یہ اکثریت میں ہیں۔ ہمارا ان سے عددی مقابلہ تو ہے نہیں بس انہیں اپنی طاقت سے دبائے رکھنا ہی ہماری کامیابی ہے"۔[۲۴]

یہ الفاظ ہر اس جاگیردار کے ہیں جو لوگوں کو ان کی محنت کا صلہ ہرگز دینے کے لیے تیار نہیں۔ غریب کسان نسل در نسل پس رہا ہے۔ روٹی اور تن کے کپڑوں کے علاوہ علاج معالجہ بچوں کی تعلیم سے تو یکسر محروم ہے۔ طاہرہ اقبال نے ہمارے اس نیلی بار کے علاقے کی پسماندگی خاص طور پر جاگیردارانہ نظام کے خلاف بات کی ہے اور یہ سچ بھی ہے کہ ہمارے جاگیردار حضرات خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں۔ پولیس بھی ان کی جیب سے باہر نہیں نکلتی۔ حالانکہ کسی بھی ملک کی پولیس عوام کے جان و مال کا تحفظ کرتی ہے جبکہ ہماری پولیس کو انگریز دور سے ہی ماتحتی سکھائی گئی ہے۔ اگر پرچہ کٹتا ہے تو غریب کے خلاف امیر ہر جگہ قانون کی گرفت سے آزاد ہے۔ ناول میں وہی اپنے نیلی بار کی حقیقت بلکہ پورے پاکستان کی حقیقت بیان کی گئی ہے جو کے نیلی بار طرز کی ہے۔ جب تھانے دار فوجی نصیر اور مہاجرین کے خلاف ناجائز پرچے کاٹتا ہے پھر وہ ذیلدار کے گھر سے واپس لوٹتا ہے تو نذرانے کی صورت میں بہت زیادہ اناج اور تحفے تحائف کے لدے ہوئے گھوڑے پولیس کے قافلے کے ساتھ ساتھ جاتے ہیں۔ اس سے بڑا جرم اور کیا ہوگا کہ تنخواہ تو عوام کے پیسے سے پولیس لیتی ہے لیکن چاکری بڑوں کی کرتی ہے۔ کسان دھرتی کا سپوت ہوتا ہے جو محنت کر کے اپنے اور لوگوں کے لیے اناج اُگاتا ہے۔ جاگیروں کے متعلق کارل مارکس کا کہنا ہے:

"یہ ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ جاگیروں اور نجی جائیدادوں کے موجودہ حقوق کس بنیاد پر جائز ہیں۔ سب سے پہلی دستاویزات تو تلوار کی نوک سے تحریر کی گئی جسے جرنیلوں اور سپاہیوں نے اپنے ہاتھ سے لکھا اور قیمت کے عوض تلوار، خنجر اور نیزے کی ضربیں لگا کے انسانی خون کی مہریں ثبت کی گئیں۔ وہ حضرات جو یہ فرماتے ہیں کہ وقت ہی ناجائز کو جائز بنا دیتا ہے۔ از راہ کرم اس سوال کا تسلی بخش جواب دیں کہ کسی گناہ کو نیکی بننے کے لیے کتنا

وقت درکار ہوتا ہے اور کس سالانہ شرح سے ایک غیر قانونی اور ناجائز سودا جائز بن جاتا ہے"۔[۲۵]

کارل مارکس کی یہ تحریر کتنی جاندار ہے انگریز نے برصغیر میں ان لوگوں کو جاگیریں دیں جنہوں نے ان کو حکمران بننے میں مدد دی۔ مغل دور میں تقریباً بیس ہزار جاگیریں تھیں جو زیادہ تر دس ہزاری پانچ ہزاری صوبے داروں کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ مساجد اور مدرسوں کی جاگیریں تھیں۔ انگریزوں نے ان لوگوں کو سرفہرست رکھا جنہوں نے مغلوں سے غداری کی اور انگریز کی مدد کی۔ جاگیریں دینے کے بعد ان جاگیر داروں کو کھلی چھٹی دی تھی کہ وہ جو مرضی اپنے مزارعین سے کریں کوئی پوچھنے والا نہیں۔ اپنے علاقوں میں ان لوگوں نے اسکول بھی نہ بننے دیے۔ اپنے لڑکوں کو باہر پڑھنے کے لیے بھیجتے تھے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ کسان کا استحصال اور مالی لحاظ سے صرف روٹی کپڑے تک ہی رکھنا جرم ہے اور یہ جرائم جاگیر داری سسٹم کی دین تھا۔ اسی کو موضوع بنا کر طاہرہ اقبال نے ناول کی شکل میں ڈھالا ہے۔ ناول میں اس سسٹم پر تنقید کی گئی ہے جس میں مارشل لاء آئے یا ذوالفقار علی بھٹو، جنرل ضیاء الحق، نواز شریف، بے نظیر بھٹو یا عمران خان ہر دور میں جاگیر دار وزیر مشیر ہوتے ہیں۔ طاہرہ اقبال نے اسی سسٹم اور اسٹیٹس کو کو جرم کہا ہے جو غریب کا استحصال کرتا ہے اور مالدار کو قانونی تحفظ فراہم کرتا ہے۔

ناول کے اگلے حصّے میں ذوالفقار علی بھٹو کی تحریک اور اس کے اقتدار کا زمانہ ہے جس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ جب ایوب خان کے خلاف ذوالفقار علی بھٹو نے تحریک چلائی تو ہر پڑھا لکھا شخص مارشل لاء کی گھٹن سے تنگ دکھائی دیتا تھا۔ لاہور، کراچی اور ڈھاکہ کی یونیورسٹیوں میں طلبا نے جلوس نکالے اور جمہوریت کے حق میں مظاہرے کیے۔ روزانہ طلبا اور پولیس میں جھڑپیں ہوتیں۔ لڑکے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگاتے پولیس آنسو گیس اور ہوائی فائرنگ کرتی۔ پھر نوبت سیدھے فائروں پر آگئی اور روزانہ کی بنیاد پر اموات میں اضافہ ہوتا گیا۔ ناول کا ایک کردار زارا فتح شیر اور اس کا ہم جماعت علی جواد جو کہ طلبا کا لیڈر بنا ہوا تھا، جلوس میں تقریریں کرتا اور ذوالفقار علی بھٹو کے گیت گاتا۔ پولیس روزانہ طلباء ہاسٹلز میں ہلہ بولتی اور بے گناہ طلباء کو گرفتار کر کے لے جاتی پھر ان کی قسمت عقوبت خانے ہی تھے یا جیل کی کال کوٹھڑی۔ روز شہروں میں کرفیو لگانا پڑتا۔ جس سے مزدوروں کی دیہاڑی ماری جاتی، جس سے غریب کا معاشی استحصال ہوتا۔

دوسری طرف بھٹو تحریک روز بروز ترقی کرتی چلی جارہی تھی۔ فیکٹریاں ہڑتالوں کی وجہ سے بند پڑی تھیں۔ کروڑوں کے باہر کے آرڈرز منسوخ ہورہے تھے۔ فیکٹریوں کے مزدور یونین بنا رہے تھے تاکہ مزدوری کو بڑھایا جاسکے۔ ناول کا مرکزی کردار زارا فتح شیر اس تحریک سے تنگ ہے وہ جاگیر دار کی بیٹی ہے اور

علی جواد کو کہتی ہے کہ آپ لوگ اگر اقتدار میں آ گئے تو جاگیر داروں سے زیادہ عوام پر ظلم کرو گے۔ ان الفاظ کو طاہرہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اگر ان غریبوں، مزدوروں، کسانوں کو دولت اور اقتدار مل جائے تو یہ خاندانی دولت مندوں کی نسبت کہیں زیادہ خطرناک ثابت ہوں گے۔ کہیں اسفل، کمینے، فضول خرچ اتنے کہ دنوں میں کنگلے ہو جائیں اور ملک کی اکانومی کو بھی ڈبو دیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اگر جاگیر دار اور صنعتکار ان کا معاشی استحصال کرتے ہیں تو یہ سیاستدان اقتدار کے ایوانوں تک پہنچنے کے لیے انہیں سیڑھی نہیں بنا رہے اور پھر انہیں استعمال شدہ گندے تولیے کی طرح کوڑے دان میں نہیں پھینک دیتے کیا"۔(۲۶)

انقلابی لڑکے زارا فتح شیر کو کہتے ہیں کہ اس وقت تو آپ ہماری بات کو سمجھ نہیں رہیں۔ بھٹو سوشلزم نظام کا حامی ہے۔ سوشلزم ایک نظام ہے۔ طرز معیشت ہے۔ چین، کوریا، روس جیسے ممالک ہم سے زیادہ ترقی کر رہے ہیں وہاں معاشی انصاف ہے یہاں کا کارخانہ دار مزدور کا خون نچوڑتا ہے۔ سالہا سال ان کی تنخواہیں نہیں بڑھتیں اگر بیمار ہو جائیں تو مالک دوائی نہیں لے کر دیتا۔ اگر مزدور چھٹی کرے تو تنخواہ کٹتی ہے۔ کارخانہ دار ایک سے دو پھر چار چار فیکٹریاں لگا رہا ہے۔ مزدور تو صرف چار چار فیکٹریاں ہی بدل رہا ہے۔ بھٹو ضرور سوشل انقلاب لائے گا۔ بھٹو اقتدار میں آ کر انہیں جاگیر داروں پر بھروسہ کرتا ہے جو ایوب خان کے ساتھی تھے مگر بھٹو نے فیکٹری مالکان کو کافی نقصان پہنچایا۔ کافی فیکٹریوں کو قومی تحویل میں لے لیا جس سے ملک میں انقلاب کی بجائے جاگیر دار تو تگڑا ہوا لیکن فیکٹری مالک ملک سے باہر فرار ہو گیا۔ غریب رہ گیا نعرے لگاتا اور بھوک سے مرتا جاگیر دار اقتدار کے مزے لوٹنے لگے۔ یہاں پر حالات کی تصویر کشی طاہرہ اقبال نے ناول میں کی ہے کہ اصل بات تو مزدور اور کارخانہ دار کی تھی جس سے مزدور کو اس کی محنت کا صلہ جائز طور پر لے کر دینا تھا الٹا مزدور بے روزگار ہو گیا اور بھٹو جاگیر دار تھا کسی جاگیر پر نہ قبضہ کیا نہ اسے قومی تحویل میں لیا۔ ناول نگار نے اس انقلاب کو یوں بیان کیا ہے :

"زارا نے شہر کے آسمان کو سرخ تانبا بنتے ہوئے دیکھا جس کے چاند ستارے کہیں بھسم ہو گئے تھے۔ جس کی فضائیں جھلس رہی تھیں اور ہوائیں سہم گئی تھیں۔ اسی آگ دھویں پٹرول اور جلاؤ گھیراؤ میں سے خبر نکلی۔ شیخ اخلاق کو مشتعل مزدوروں نے قتل کر دیا ہے۔ ٹیکسٹائل مل کو جب آگ لگائی گئی تو پھر اس وقت تک اسے گھیرے رکھا گیا جب تک مل کے اندر موجود مل مالک کی لاش، فرنیچر، چھت، کھڑکیوں، دروازوں کی راکھ سے الگ اپنی

شناخت گم کر چکی تھی۔ عجب قتل تھا جس کے قاتلوں کی تعداد کا تعین نہیں کیا جا سکتا تھا۔ کسی پر بھی فرد جرم عائد نہ ہو سکتی تھی۔ بلوائیوں کے جرم ڈھانپنے کو برعظیم کی یہ مٹی کتنی صفائی سے اپنی کوکھ کھول دیتی ہے“۔[۲۷]

طاہرہ اقبال نے اپنے اس ناول میں اس وقت کے حالات کا مکمل جائزہ پیش کیا ہے کہ لڑتے مرتے لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں ہوا۔ عبدالرحمٰن ملک جو کہ ملک فتح شیر کا بیٹا اور جاگیر دار تھا۔ بھٹو نے اسے اپنا وزیر زراعت بنایا جس نے کبھی بھی سڑک پر احتجاج نہیں کیا تھا۔ ان انقلابیوں میں کوئی بھی وزیر نہیں بنا جو سڑکوں پر گولیاں کھاتے اور مرتے رہے۔ بھٹو نے صنعتوں کو لٹوا کر کوئی سبق نہیں لیا لیکن زمینداروں کی طرف تو دیکھا تک نہیں۔ انقلاب نہیں آیا بلکہ غریب مزدور کی روٹی تو بند ہو گئی وہ تو رہ گیا پولیس سے مار کھانے اور نعرے لگانے کے لیے۔ طاہرہ اقبال کے مطابق پاکستان میں کچھ بھی تبدیل نہیں ہوا۔ ہلکا پھلکا چہرہ بدلتا ہے نظام نہیں بدلتا۔ بھٹو کو پھانسی ہو گئی۔ خود ساختہ امیر المؤمنین جنرل ضیاءالحق کی شکل میں سامنے آ گیا جس نے لاتعداد انسانوں کو نام نہاد جہاد میں دھکیلا۔ ایک دن خود بھی فضا میں اڑ جاتا ہے۔ بے نظیر اقتدار میں آتی ہے تو جرائم پیشہ پھر وہی وزیر مشیر حکومت کا حصّہ ہوتے ہیں۔ نواز شریف آتا ہے تو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ جاگیر دار اس کی حکومت کا حصّہ ہوتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آخر میں جنرل مشرف آ جاتا ہے۔ احتساب کا نعرہ لگتا ہے۔ اتنے میں نائن الیون کا واقعہ ہوتا ہے۔ امریکہ افغانستان پر چڑھائی کر دیتا ہے جو جنرل ضیا کے دور کے مجاہد تھے وہ اب دہشت گرد ٹھہرائے گئے ہیں۔ امریکہ عالمی دہشت گرد مسلمانوں پر بارود پھینک رہا تھا۔ الٹا دہشت گردی کی جنگ میں پاکستان دہشت گردی کی لپیٹ میں آ گیا۔ طاہرہ اقبال کا مزید یہ کہنا کہ جعلی پیر مریدوں کو بے وقوف بنا رہے ہیں۔ جرائم پیشہ ہیں، زناکار ہیں لیکن سادہ لوح اور ایمان والوں کو خوب لوٹ رہے ہیں۔ غریب عوام کا خزانہ بیوروکریٹ، جرنیل، جاگیر دار، سرمایہ دار لوٹ رہے ہیں۔ عوام وہیں کھڑے ہیں جہاں ۷۰ سال پہلے تھے۔ نظام ہے کہ بدلنے کا نام نہیں لیتا۔ آخر میں بے نظیر کی شہادت پر آ کر ناول کا اختتام ہو جاتا ہے لیکن ناول تمام لوگوں کو بے نقاب کرتا ہے جو کسان اور مزدور کا معاشی قتل کرتے ہیں۔ ناول میں جاگیر دارانہ سسٹم کے خلاف بات کی ہے کہ چالیس سال سے عبدالرحمن ملک جو کہ جاگیر دار ہے۔ زراعت کا وزیر ہے اور چالیس سال سے جعلی پیر اسرار احمد وزارت مذہبی امور چلا رہا ہے۔ نظام میں کوئی تبدیلی تو نہیں آئی البتہ جو لوگ بیرون ملک یورپ، سعودی عرب، دبئی وغیرہ چلے گئے انھوں نے نئے مکانات اور رہن سہن میں ترقی کی ہے لیکن حکومت اب بھی جرائم پیشہ افراد کے ہاتھوں میں ہی ہے۔ نظام نہیں بدلا چہرے بدلے۔ وزارتیں انھیں

خاندانوں کے پاس ہیں جن کے پاس ایوب دور (۱۹۵۷ء-۱۹۶۹ء) میں بھی تھیں۔ معمولی تبدیلی کے علاوہ کچھ نہیں بدکا جاگیر دار اور سرمایہ دار کیسی نگاہوں سے کسان اور مزدور کو دیکھتے ہیں۔ میکسم گورکی (۱۸۶۷ء-۱۹۳۶ء) کے ناول "ماں" میں بھی طاہرہ اقبال کی طرح کی تصویر دکھائی دیتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

"انسانوں کے رہن سہن کے طریقہ ہی پر اس کے خیالات کا دارومدار ہوتا ہے۔ بات دراصل یہی ہے اگر مزدور کہتا ہے "نہیں" تو مالک کہتا ہے "ہاں" اور بالکل یہی فرق کسان اور زمیندار میں ہے اگر کسان کو پیٹ بھر کھاتے دیکھ لے تو زمیندار کو نیند نہ آوے"۔(۲۸)

میکسم گورکی روس کے عظیم ناول نگار ہیں انھوں نے اپنے ناول "ماں" میں فیکٹری مزدوروں، کسانوں پر ہونے والے جاگیر داروں کے جرائم کا ذکر کیا ہے کیونکہ انھوں نے پیٹرزبرگ کی سڑکوں پر مزدوروں اور کسانوں کا خون دیکھا تھا۔ جو کہ فیکٹری مالکان اور جاگیر دار پولیس کے ذریعے کر رہے تھے۔ حکومت کو چاہیے کہ ایسا قانون بنائے تاکہ اسٹیٹس کو ضرب لگے اور معاشرتی جرائم کم ہوں۔ مجرمانہ کلچر کی جو نشاندہی میکسم گورکی نے کی وہی مجرمانہ کلچر کی نشاندہی طاہرہ اقبال نے کی۔

حوالہ جات

۱۔ اردو لغت، اردو لغت بورڈ کراچی، جلد ۱۸، ص ۲۵۱

۲۔ Long man English Dictionary, Pearson Education

۳۔ بھٹی اقبال احمد، محمد اسلم کھوکھر، معاشیات، اردو بازار، لاہور، بھٹی پبلشرز، ۱۹۸۶ء، ص ۹

۴۔ کارل مارکس، داس کیپیٹل، مترجم، سید تقی محمد، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۱ء، ص ۱۵

۵۔ منظر حسن، العاصفہ، شہر زاد گلشن اقبال، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۷

۶۔ ایضاً، ص ۵۶ تا ۵۷

۷۔ ایضاً، ص ۶۴

۸۔ ایضاً، ص ۹۸

۹۔ علامہ اقبال، بانگ درا، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۰۸ء، ص ۲۸۰

۱۰۔ میر تقی میر، کلیات، میر تقی میر (مرتب) ہ کلب علی خان فائق، مجلس ترقی ادب، اشاعت دوم، جلد چہارم، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۷۳

۱۱۔ منظر حسن، العاصفہ، شہر زاد گلشن اقبال، کراچی ۲۰۰۶ء، ص ۹۹ تا ۱۰۰

۱۲۔ https://pk.searchley.com/ws?q=us

۱۳۔ منظر حسن، العاصفہ، شہر زاد گلشن اقبال، کراچی ۲۰۰۶ء، ص ۱۵۷

۱۴۔ ایضاً، ص ۱۵۸

۱۵۔ ایضاً، ص ۱۶۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۷۰

۱۷۔ امجد طفیل، ڈاکٹر، اردو ناول (قصہ ڈیڑھ صدی کا)، سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات، پاکستان، اسلام آباد، ۲۰۱۹ء، ص ۱۷۲

۱۸۔ منظر حسن، دھنی بخش کے بیٹے، شہر زاد گلشن اقبال، کراچی، ۲۰۰۶ء، ص ۱۲۲

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۹۲

۲۰۔ ایضاً، ص ۴۵۶ تا ۴۵۷

۲۱۔ ایضاً، ص۱۹۳

۲۲۔ اقبال طاہرہ، نیلی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد،۲۰۱۷ء، ص۵۹

۲۳۔ ایضاً، ص۷۲

۲۴۔ ایضاً، ص۸۰

۲۵۔ کارل مارکس، داس کیپیٹل، (مترجم)، سید تقی محمد، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۷۲ء، ص۱۲۹

۲۶۔ اقبال طاہرہ، نیلی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد،۲۰۱۷ء، ص۱۱۱

۲۷۔ ایضاً، ص۱۲۸

۲۸۔ میکسم گورکی، ماں، دارالاشاعت، ماسکو، ۱۹۷۵ء، ص۱۹۶

باب چہارم:

منتخب اردو ناولوں میں اخلاقی جرائم کی پیش کش

اخلاقیات:

ماہرین بشریات کے مطابق اخلاقیات کا تعلق انسان کے باہمی تعلق سے ہے۔ عام گفتگو میں ایسے جملے سننے کو ملتے ہیں کہ اس کو ایسا کرنا چاہیے تھا۔ اچھے اور برے کی تمیز کیسے کی جائے۔ آیا کہ اس کے حسن اخلاق کی وجہ سے یا اس کے کردار کی وجہ سے۔ لیکن خوش خلقی انسان کو بھلی لگتی ہے اور انسان اس کو بہتر محسوس کرتا ہے۔ لیکن یہ انسان کے اچھے اور برے اعمال کا تعین بھی کرتی ہے۔ اخلاقیات کی تعریف میں ولیم للی جو کہ مغربی مفکر ہیں ان کے مطابق: ''اخلاقیات سے مراد سماج میں رہنے والے انسانوں کے کردار کے علم کو کہتے ہیں۔''[۱]

اس میں صواب، خیر، انسانی کردار تین چیزیں اہم ہیں جو معاشرے میں انسانی کردار کا تعین کرتی ہیں۔ ماہر انسانیات جے ایس میکنزی کے مطابق: '' اخلاقیات اس نصب العین کے مطالعے کا نام ہے جو انسانیت میں مضمر ہے۔''[۲] یہ علم انسانی کردار یعنی انسانوں کے ارادی اعمال زیرِ بحث لاتا ہے۔ یہ زندگی کی اعلیٰ اقدار کا مطالعہ کرتے ہیں جس میں صداقت، حسن اور خیر جیسے اعمال کو پیدا کرنے میں مدد ملتی ہے۔ اس کا سب سے بڑا حصہ انسانی کردار ہوتے ہیں جس کو ناول نگاروں نے کرداروں کے ذریعے موضوع بحث بنایا ہے۔ اس میں کردار کی مرضی، ارادہ، خواہشات، ارادی عمل، سیرت، محرک اور خبث باطن کو موضوع بحث لایا جاتا ہے۔ اخلاقی لذتیت کی اقسام میں ذاتی لذتیت، رہبانی لذتیت، عمومی لذتیت یہ وہ وقتی خوشیاں جن کو ناول نگاروں نے تنقیدی انداز میں پیش کیا ہے۔ میرے موضوع کا دائرۂ کار اخلاقی جرائم کے مطالعے تک محدود ہے۔ عمومی مطالعے میں مرزا رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا''، ''مرزا رسوا''، پریم چند کا ''بازارِ حسن اور غبن''، سجاد ظہیر کا ''لندن کی ایک رات''، کرشن چندر کا ''ایک عورت ہزار دیوانے''، عزیز احمد کا ''ایسی بلندی ایسی پستی'' شامل ہیں جن میں اخلاقی جرائم پر کھل کر بات کی گئی ہے۔ مخصوص ناولوں میں ''کنجری کا پل''، ''نرک'' اور ''حبس'' شامل ہیں۔

''کنجری کا پل'' ناول کا جائزہ لینے سے پہلے میں کنجری یا طوائف کی مختصر تاریخ کا جائزہ لینا چاہتا ہوں۔ اردو ادب میں طوائف یا کنجری بالخصوص ناول میں ایک اہم موضوع رہا ہے۔

الف۔ جسم فروشی کی مختصر تاریخ:

عربی زبان کے مشہور ادیب اور نثر نگار الجاحظ (۷۷۶ء تا ۸۶۸ء) کے مطابق کنجری یا طوائف گانا گانے والی کو کہا جاتا ہے ۔[۳]

"فرہنگ آصفیہ" میں طوائف کے معنی ہیں :

"ناچنے والی عورت، کنجری، کسبی، رنڈی، رقاصہ، لولی"۔[۴]

عام طور پر ہر وہ عورت جو اپنی آواز یا جسم فروشی کا کاروبار کرتی ہے طوائف کہلاتی ہے۔ اردو زبان کے ممتاز افسانہ نگار سعادت حسن منٹو کہتے ہیں کہ "عصمت کو بیچنا جس کو عورت کی زندگی کا سب سے قیمتی زیور تصور کیا جاتا ہے، اس زیور کی قدر اس لیے بڑھ گئی ہے کہ عورت جب ایک بار اسے کھو دیتی ہے تو سماج کی نگاہوں میں اس کی کوئی عزت نہیں رہتی۔

منٹو نے مزید اس زیور کو کھوئے جانے کی حالت کو بیان کیا ہے:

۱۔ شادی کے بعد یہ گوہر مرد کی جیب میں چلا جاتا ہے۔

۲۔ بعض اوقات مرد اسے زبردستی حاصل کر لیتا ہے۔

۳۔ بعض اوقات عورت شادی کے بغیر ہی اسے پسندیدہ مرد کے حوالے کر دیتی ہے۔

۴۔ بعض عورتیں حالات سے مجبور کر اسے بیچ دیتی ہیں۔

۵۔ بعض عورتیں اس کی تجارت کرتی ہیں۔[۵]

نیاز فتح پوری عصمت فروشی کے حوالے سے لکھتے ہیں :

> "فحاشی نام ہے ہر اس طریق عمل کا جو قانون قدرت یا سوسائٹی کے مقرر کردہ اصولوں کے خلاف خواہش نفسانی کو پورا کرنے کے لیے اختیار کیا جائے۔ اس میں وہ صورت بھی شامل ہے جس کا تعلق کسب زر سے ہو۔ عصمت فروشی کہتے ہیں۔ جسم فروشی کی تاریخ کے مصنف جارج ریلے سکاٹ (۱۸۹۰ء-۱۹۸۶ء) (The History of Prstitution) کے مطابق وہ ایک ایسا مرد یا عورت جو کہ مالی یا کسی اور طرح کے معاوضے کے بدلے یا محبت سے عاری لذت کے حصول کے لیے جسم فروشی کو جزووقتی (پارٹ ٹائم) یا کل وقتی

پیشے کے طور پر اپنا لے اور لاتعداد لوگوں کے ساتھ نارمل یا ابنارمل جنسی عمل میں حصّہ لے، خواہ ان کا تعلق اس کی اپنی صنف سے ہی ہو طوائف کہتے ہیں۔ بال لیکراٹیکس نے طوائف کی تعریف اس طرح کی ہے:(۶)

"ایسی تمام عورتیں جو شادی کے بغیر یا اپنے شوہر کے علاوہ کسی اور مرد کے ساتھ یعنی عمل کرتی ہیں طوائف کہلاتی ہیں۔"(۷)

امریکہ کے مشہور کرمنالوجسٹ لیری جے سیگل(Larry-J-Siegel) کے مطابق:

The term derives from the latin prostituere, which means:

"To cause to stand in front of". The prostitute is viewed as publicly offering his or her body for sale". (۸)

طوائف کی اقسام (Types of Prostitutes):

i۔ مغنیہ:

یعنی گانا گانے والی والیاں تمام ممالک میں ہوتی ہیں۔ شراب خانوں، ہوٹلوں، نائٹ کلبوں اور کوٹھے پر گاتی ہیں۔ جبکہ ہمارے ہاں یہ کوٹھیوں میں رہتی ہیں اور رات کے وقت ان کا زیادہ کام چلتا ہے۔ گانے کے علاوہ جسم فروشی بھی اس میں شامل ہے۔

ii۔ رقاصہ:

مغنیہ گانا گاتی ہے اور رقاصہ رقص کرتی ہے۔ دوسرے ممالک میں ہوٹلوں، کلبوں، چکلوں، عریاں اور نیم عریاں رقص کرتی ہیں۔ ساتھ ساتھ جسم فروشی کا دھندہ بھی چلتا ہے۔

iii۔ عصمت فروش:

یہ کوٹھیوں اور چکلوں میں بیٹھنے والی عورتیں جو جسم اور حسن کی قیمت وصول کرتی ہیں۔

iv۔ کال گرل:

کال گرل ایسی طوائف کو کہا جاتا ہے جو ٹھاٹھ سے رہتی ہو۔ اس کا معاوضہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ امیر آدمی ہی ان کی صحبت سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ امریکہ میں ان کا معاوضہ ۱۵۰۰ ڈالر سے لے کر ۱۰۰۰۰ ڈالر ایک رات کا ہوتا ہے۔

v۔ گلیوں میں پھرنے والیاں:

ان عصمت فروش عورتوں کا کاروبار چل پھر کر ہوتا ہے۔ عام طور پر یہ پولیس سے بچ کر جسم فروشی کرتی ہیں۔ ان کا زیادہ کام لاری اڈہ، ریلوے اسٹیشن، ہسپتال وغیرہ کے باہر چلتا ہے۔

vi۔ بار گرلز، شراب خانوں اور ہوٹلوں میں کام کرنے والیاں:

بار روم یا ہوٹلوں میں کام کرنے والی عورتیں جسم فروشی کرتی ہیں۔ ہوٹلوں میں ان کے الگ سے کمرے ہوتے ہیں۔ ہوٹل انڈسٹری میں عورت کے کاروبار کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ امریکہ میں انھیں بی گرل (B Girls) بھی کہتے ہیں۔ یہ عورتیں اکثر شراب میں مست رہتی ہیں۔ امریکہ میں ملٹری بیسوں کے نزدیک ان کے بار روم کی تعداد کثرت میں ہوتی ہے۔

vii۔ ٹیکسائیاں، ڈیرہ دار طوائفیں:

یہ عصمت فروش بڑی بڑی جگہوں پر رہتی ہیں۔ ان کی کمائی صرف عصمت فروشی ہوتی ہے۔ لوگ ان کے پاس چل کر جاتے ہیں۔ ان کی بہترین جھلک ہمیں "امراء جان ادا" میں ملتی ہے۔ یورپ میں انھیں Cathouses، سپورٹنگ ہاؤس Sporting Houses یا Ill Repute Hose زیادہ تر ان ہاوسز کو نائیکہ چلاتی ہیں یا ٹھیکیدار چلاتے ہیں۔

viii۔ بوڑھی طوائفیں:

طوائفیں جب بوڑھی ہو جاتی ہیں تو یہ نائیکہ کا روپ دھار لیتی ہیں۔ نوجوان طوائفوں کو پال کر ان سے دھندہ کرواتی ہیں۔ اکثر بوڑھی طوائفیں اپنی جگہ تبدیل کرتی رہتی ہیں۔

ix۔ سرکٹ ٹریولر:

یہ گروپوں کی شکل میں بازاروں اور فیکٹری ایریاز میں گھومتی ہیں۔ زیادہ تر ان کے گاہک فیکٹری ورکر یا ٹرک ڈرائیورز ہوتے ہیں۔

x۔ ٹھیکیدار دلال (PIMS):

قحبہ خانوں کے اندر چھوٹے چھوٹے کمروں میں رہنے والی طوائفیں جن کے مالک یہ ٹھیکیدار ہوتے ہیں۔ یہ ٹھیکیدار طوائفوں کا آرگنائزر ہوتا ہے۔ زیادہ تر لڑکیاں ان کے پاس اغواہ شدہ یا مجبور ہوتی ہیں۔ ٹھیکیدار

ان کو صرف روٹی، کپڑا اور مکان کی سہولت ہی دیتے ہیں یا تھوڑی بہت تنخواہ دے دی۔ پولیس کیس میں ضمانت کرا دی۔ اکثر ان کے پاس لڑکیاں آتی اور جاتی رہتی ہیں۔

xi۔ شوقین طوائفیں:

عام طور پر یہ دیکھا گیا کہ کالج، یونیورسٹی اور بڑے گھروں کی لڑکیاں حدِ بلوغت تک پہنچتے ہی اس دلدل میں پھنس جاتی ہیں۔ یہ مالدار مردوں اور لڑکوں سے دوستی کر کے سیر سپاٹے اور تحفے وصول کرتی ہیں اور اپنا مکروہ شوق پورا کرتی ہیں اور سفید پوشی بھی برقرار رکھتی ہیں۔ ان میں سے اکثر لڑکیاں نشہ بھی کرتی ہیں۔

xii۔ گاہک (خریدار):

گاہک اصل میں وہ عظیم ہستی ہے جو عورت کو مجبور کرتا ہے۔ اس نے عورت کو بازار کی زینت بنایا۔ اپنی بیوی کو چھوڑ کر کنجری کے پاس کیوں جاتا ہے۔ اس سوال کی متعدد وجوہات ہیں۔ مرد عورت کی تبدیلی چاہتا ہے۔ جنسی طور پر مضبوط اور قوت باہ ادویات کو استعمال کرنے والے اور کمزور جنسی مرد بھی ان طوائفوں سے استفادہ کرتے ہیں۔ ان کے پاس اس لیے جاتے ہیں کہ حمل ہونے کی صورت میں بدنامی نہیں ہوتی۔ بعض لوگوں کو ان کے پاس جانے اور ڈانس گانا سننے کا شوق ہوتا ہے۔ مرد گھریلو جھگڑوں سے تنگ آکر شادی نہ کرانے والے حضرات بھی اکثر طوائفوں کے پاس جاتے ہیں۔ اس کو گاہک یا خریدار کہا جاتا ہے۔ تمام برائیوں کی جڑ یہ ہے۔

xiii۔ برصغیر میں عصمت فروشی کے بازار:

برصغیر میں بھی عصمت فروشی کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ اکثر بڑے مندروں جیسے سومنات کا مندر تھا۔ عورتوں کو باقاعدہ عصمت فروشی پر لگایا جاتا تھا۔ اکثر راجے مہاراجے عصمت فروش عورتوں کی بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ متحدہ ہندوستان میں سب سے پہلا باقاعدہ چکلہ یا جسم کی فروشی کا اڈا بادشاہ محمد تغلق کے عہد میں قائم ہوا اس کا نام "طرب آباد" تھا۔ دوسرا چکلہ بادشاہ جلال الدین اکبر نے آگرہ میں فتح پور سیکری کے پاس "شیطان پورہ" کے نام سے آباد کیا۔ خاندان غلاماں، سلاطین دہلی یا مغل دور کی بات کی جائے تو بادشوں نے جہاں جہاں شاہی قعلے تعمیر کیے۔ اس کے ساتھ شاہی بازار بھی بنائے۔ لاہور کا شاہی قلعہ کے ساتھ شاہی بازار، دہلی کا قلعہ ساتھ شاہی بازار جسے چاوڑی بازار کہتے ہیں، ملتان کا قلعہ ساتھ شاہی بازار اور انھیں بازاروں نے پھر بعد میں طوائفوں نے اپنے رنگ جمائے سکھ دور (۱۸۰۰ء-۱۸۴۹ء) آدھا لاہور شہر اس بُرے کام کے لیے مختص تھا۔ انگریز دور (۱۸۵۷ء-۱۹۴۷ء) میں بھی ان بازاروں نے ترقی کی کیونکہ بنے ہی یہ بازار ان کے لیے تھے۔

ب۔ناول ”کنجری کا پل“میں اخلاقی جرائم:

یہ ناول دو سو تین ۲۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔اس میں کنجری کے پُل کی صورت میں ایک ایسا آئینہ تیار کیا گیا جو جھوٹ نہیں بولتا۔اس میں ہمارے سماج کے اندر پائے جانے والے طاقتور اخلاقی جرم عصمت فروشی کی داستان ہے کہ کس طرح لوگ ترقی یافتہ ہونے کے باوجود جنس کے شکاری ہیں۔طوائف نے نیا طریقہ واردات یعنی ماڈلز، کیٹ واک گرلز، کال گرلز کے روپ میں پتھریلی چھاتیوں اور کسے جسموں کے ساتھ شکاریوں کا شکار ہوتی ہیں۔عام آدمی کا داخلہ اس لیے نہیں کہ اس کے پاس کار، کوٹھی اور پیسہ نہیں ہے۔جبکہ پیسے والا جرم کرکے بھی عزت دار ہے۔انسان کے اندر بیٹھا ہوا ضمیر اس کا شیطان اسے مذہب کے لبادے میں بھی شیطان ہی رہتا ہے جبکہ ظاہراً یہ پاپی مبلغ ہے اور فکر آخرت کا درس دیتا ہے۔ناول نگار کے نزدیک مجرم طوائف نہیں ہے بلکہ وہ ہے جو اسے راہ راست پر آنے سے روکتا ہے۔یونس جاوید کا یہ ناول ”کنجری کا پل“ہمیں معاشرے کے اندر پائی جانے والی ناہمواری، پیسے کی ریل پیل ایسے جرائم کو جنم دیتی ہے۔آج ہم بحثیت معاشرہ نہیں گروہ ہیں اور گروہ کے اندر سوچنے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔کیونکہ جرائم تو ہر قوم میں پائے جاتے ہیں۔وہ انھیں کنٹرول بھی کرتے ہیں۔یونس جاوید ایک طویل تخلیقی سفر کے بعد ناول نگاری کی طرف آئے۔پی ٹی وی پر ان کے ڈرامے اندھیرا اجالا، عہد وفا، صبح جمال، دیار عشق، کانچ کا پل، عشق سے تیرا وجود، ساون روپ، زاد راہ، ایک محبت کی کہانی، تکمیل اور سٹیٹس نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ایک تو یونس جاوید منٹو اور کرشن چندر کی طرح واشگاف الفاظ میں شخصیت کا پوسٹ مارٹم نہیں کرتے بلکہ وہ سماجی برائیوں کا پوسٹ مارٹم کرتے ہیں۔”کلیات ناسخ“ تین جلدوں میں تدوین کرکے اس پر محققانہ مقدمہ بھی لکھا۔”حلقہ ارباب ذوق“ پر تحقیقی مقالہ لکھ کر پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ان کے دو ناول ”کنجری کا پل“اور ”ستونت سنگھ کا کالا دن“منظر عام پر آئے ہیں۔

ناول ”ستونت سنگھ کا کالا دن“ میں مسلمانوں اور سکھوں کا آپس میں ملنا اور احساس ندامت دکھانا۔ کیوں کہ کافی عرصے کے بعد ملتے ہیں۔وہ لاہور میں اپنے خوشگوار محبت اور رشتے داروں کا ذکر کرتے ہیں۔ان دونوں کو ملال اس بات کا تھا کہ آخر صدیوں کی محبت ۱۹۴۷ء میں لمحوں میں غیروں کی باتوں میں آکر کیسے ختم ہو گئی۔انسان درندہ بن گیا۔یہ دراصل ہندو کی سیاست تھی۔ہندو کی لگائی ہوئی آگ تھی جس کا ایندھن مسلمان اور سکھ بنے۔لیکن یہاں پر میرا موضوع ان کا ناول ”کنجری کا پُل“ ہے۔یہ یونس جاوید کا پہلا ناول بھی ہے جو ۲۰۱۱ء میں منظر عام پر آیا۔اس کا مرکزی مسئلہ طوائف کی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔کس طرح ایک طوائف کٹیا سے نکل کر مرسڈیز گاڑیوں اور محل تک پہنچتی ہے۔ یونس جاوید ایک کامیاب ناول نگار ہیں، انہوں نے

اپنے اس ناولٹ میں طوائف کی زندگی کے جس ظاہر و باطن کو کھولا ہے اور سماج کی اخلاقی جرائم کو الٹ پلٹ کیا ہے۔ طوائف جب سے وجود میں آئی ہے ہمیشہ لوگوں نے اس کی مجبوری سے فائدہ اٹھایا ہے۔ مجرم طوائف نہیں ہے بلکہ معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو اس سے فائدہ حاصل کرتا ہے۔ اس ناول میں بڑے بڑے کاروباری لوگ، سیاستدان، اہل دانش، مذہبی لبادہ اوڑھے بڑے بڑے عطار پھر سب چیزوں سے مایوس جب طوائف حقیقت میں واپسی کا راستہ اختیار کرنا چاہتی ہے تو اس کی شخصیت ایک سوشل ورکر اور صوفی کی طرح محسوس ہوتی ہے جو خدا کو راضی کرنے کے لئے مخلوق کی بھلائی اور عبادت کے لیے مسجد تعمیر کرتی ہے لیکن حضرت عطار اپنی خواہش کی تکمیل نہ پا کر اسے لوگوں کے جذبات کو ابھار کر شہید کروا دیتے ہیں۔ طوائف کا کردار اس کی حیثیت کا مسئلہ ناول میں اٹھایا گیا ہے۔ انسان نے اتنی ترقی کر لی ہے لیکن اندر سے تبدیل نہیں ہوا۔ تعلیم، ترقی، تمدنی سفر کے باوجود اس کے اندر کی خود غرضی، سفاکی اور شر کا عنصر قطعاً ماند نہیں پڑا ہے۔ جب اس کی خواہش پوری نہیں ہوتی تو وہ سماجی اقدار، تہذیبی رویوں اور مذہبی تعلیمات اپنی اشرف المخلوقات کی حیثیت سب کو ایک طرف اٹھا کر پھینک دیتا ہے۔ اس سے بڑا اخلاقی جُرم اور کیا ہو سکتا ہے کہ ضرورت پڑنے پر تمام چیزوں کو اپنے مطلب کے لیے استعمال کر لیتا ہے۔ یونس جاوید کا کمال یہ ہے کہ جرائم پر سے پردہ اُٹھاتے ہیں لیکن خود جذباتی نہیں ہوتے بلکہ جذباتی مواقع پیدا کرتے ہیں۔ جیسے طوائف کا اپنے بھائی کو پہچان کر خودکشی کرنا اور حضرت عطار کا کنجری کے انکار عقد پر لوگوں کو جذباتی کرنا اور پھر مسجد کو شہید کرانا ایسے کردار ہے جو مذہبی لبادہ اوڑھے بڑے مجرم ہیں۔ نہ ہی یونس جاوید عصمت فروشی جیسے جرم کو ختم کرنے کا ٹھیکہ لیتے ہیں، وہ محبت کے حامی اور محبت سے ہر جرم کو ختم کرنے کا درس دیتے ہیں وہ معاشرے کے اچھے مصور ہیں جنہوں نے معاشرے کی کئی تہوں کو اُلٹ دیا۔ کرداروں میں ظہرہ مشتاق، فہمیدہ فیروزے، زرینہ، مہرالنسا، صبازادی، دیوان عاشق حسین، سلمان گوہر، کاشف، احمد خان اور حضرت عطار شامل ہیں۔ دراصل گناہ کے نیچے تقوی چھپا بیٹھا ہے جبکہ نیکی کے نیچے گناہ۔ ظہرہ اور حضرت عطار کی کہانی اسی چیز کا پردہ فاش کرتی ہے۔ ناول میں کہانی کی ابتدا کچھ یوں ہے۔

مشتاق مالی ایک معمولی آدمی ہے جو دبئی پلٹ ہے۔ اس کی گریجویٹ بیوی ظہرہ مشتاق کی گھر والوں نے مالی سے اس لیے شادی کر دی تھی کہ وہ دبئی میں رہتا ہے ورنہ ظہرہ اور مشتاق کا کیا جوڑ۔ مشتاق کے دبئی جانے کے بعد اس نے بوتیک اور کیٹ واک کے علاوہ ڈیزائن گھر بھی کھول لیا۔ یہاں سے اس کے اخلاقی جُرم کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہی فیشن کی دنیا اس کو نئے نئے لڑکوں اور جوان لڑکیوں کو ایک دوسرے کے ساتھ اکٹھا کرنے کا موقع دیتی ہے۔ کاروبار کا اچھا آغاز ہوتے ہی ظہرہ اپنا پرانا مکان بیچ کر نئے پوش ایریا میں کنال کی کوٹھی خرید لیتی ہے۔ ساتھ بوتیک اور کیٹ واک کے سامان کو بھی بڑی کوٹھی میں منتقل کر دیتی ہے۔ اب ظہرہ نے توے کی

چیزوں کو اپنے اوپر حرام کیا اور دودھ، مکھن، شہد، جوس کچی سبزیوں اور پکے پھلوں کے ساتھ جوان لڑکوں کو ماڈل بنانے کی کلاس بھی کھول لی۔ دیکھتے ہی دیکھتے فائیو سٹار ہوٹل کے سوئمنگ پول میں لڑکوں کے ساتھ نہانا اور اپنا پتھریلا بدن سب کو خوشی سے دکھانا اس کا دلچسپ مشغلہ بن گیا۔ ہوٹل میں اس کی رسائی سیاستدانوں اور بیوروکریٹس کے علاوہ سرمایہ داروں سے بھی ہو گئی۔ ہر مہینے نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں بدلنا اس کا معمول بن گیا۔ مشتاق مالی دبئی سے واپس آکر اس کا سکورٹی گارڈ بن جاتا ہے جو کوٹھی کے باہر صرف گیٹ کھولتا ہے اور آنے والوں کو مسکراہٹ دیتا ہے۔ اس انداز کو ناول نگار نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے:

> ”دوسرا دھندہ جو صرف پیٹ سے نیچے کا ہے، زیادہ پھل لایا ہے۔ اب تو نچلے، متوسط اور غریب ترین طبقے کے لوگوں میں بھی خوشحالی اُترنے لگی ہے اور جگہ جگہ مشتاق مالیوں کی مطمئن تعداد ربِ قدیر کے شکر گزار ہونے کا اعلان کرنے کے لیے کسی نہ کسی مزار پر حاضر ہوتی اور نیازیں تقسیم کرتی دکھائی دیتی ہے“۔(۹)

یونس جاوید نے ہمارے معاشرے کا مجرمانہ چہرہ یہاں بے نقاب کیا ہے کہ اگر کوئی خوبصورت لڑکی اپنا اسکول کا بستہ لیے روڈ پر کھڑی اپنی گاڑی کا انتظار کر رہی ہے تو ایک دو تین منٹ میں جتنی بھی گاڑیاں گزرتی ہیں اپنی لمبی گردن سے اسے ایسے دیکھتے ہیں جیسے کچا کھا جائیں گے۔ لیکن مجھے ایسی طوائفوں سے نفرت ہے جو سکول کی لڑکیوں کی یونیفارم استعمال کرتی ہیں۔ صرف اپنے پیٹ کی پیاس بجھانے کے لیے پھر ان میں روز بروزاضافہ ہو رہا ہے۔ جرم ہے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لیتا۔ وہ اس کی مثال ۱۹۴۳ء والے بنگال کے قحط سے دیتا ہے جس میں عورت ننگی اور زمین پر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ بچے ریل کی پٹریوں پر لہولہان ہو گئے۔ بات کیا تھی کہ پاپی پیٹ نے ایسے جرم کرائے کیونکہ بھوک میں عبادت، خدائی احکامات، جمالیات، خلاقیات، مذہب اور قوانین سب دھواں ہو جاتے ہیں۔ جسم صرف پیٹ کی آگ بجھانے پر احکامات صادر کرتا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ساتھ جرائم کی دنیا میں فیروزے، صبازادی اور زرینہ اس کا ساتھ نبھانے لگیں۔ پھر انہوں نے مغل بادشاہ بابر کا ایک شعر لکھ کر دیوار پر لٹکا دیا۔ بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست، لیکن اس شعر کی سمجھ ان کو نہیں آئی بس یہ ایک خوبصورت شعر تھا جو دیوار پر لٹکا دیا۔ پھر کیا تھا کہ جرائم کی دنیا میں بڑے بڑے طالبان حسن ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت گاڑی اور ہوٹل جوانی ہے کہ ڈھلنے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ پھر اندرون اور بیرون ملک کے لاکھوں روپے مالیت کے دورے۔ ان میں سے ایک دورے کا حال ناول نگار نے اس طرح بیان کیا ہے، ملاحظہ ہو:

"فیروزے آج سے دو روز بعد جمال شاہ کے ساتھ بیرون ملک جانے والی تھی۔ دو ماہ کے لیے یہ وعدہ گزشتہ ماہ ہی طے ہوا تھا۔ ۹۰ فیصد رقم پیشگی اکاؤنٹ نمبر ۳۰۲۰۰ میں جمع ہو کر سید مل چکی تھی۔ تحائف اور اخراجات کا شمار نہ تھا اور ایسے ہی رنگین لمحات کا تصوران دونوں کے چہکنے اور مہکنے کے سبب بنا ہوا تھا"۔[۱۰]

ظہرہ مشتاق آپ میڈم ظہرہ بن چکی تھی۔ نئی آنے والی لڑکیوں کی پرورش اس نے ہی کی تھی۔ فیروزے اور صبازادی نے اب یہ تہیہ کر لیا کہ آئندہ کوئی بھی بیرونی بکنگ ہو، میڈم کو اعتماد میں لیا جائے گا۔ ویسے بھی ہماری ساری ذمہ داری میڈم نے اٹھا رکھی ہے۔ ناول نگار نے یہاں پر ایک اور کردار حضرت بابا جی عطار صاحب ڈالے ہیں۔ ان کو احمد خان میڈم کے گھر آنے کی دعوت دیتے ہیں۔ جب حضرت عطار آتے ہیں تو سب لڑکیاں اور میڈم برقعے میں ملبوس ہو جاتی ہیں۔ حضرت جی اللہ صمد اللہ صمد کرتے ان کی بات سنتے ہیں۔ میڈم ظہرہ کی خواہش ہے کہ اتنا پیسہ کیا کرنا ہے۔ کچھ لوگوں کی فلاح کے لیے زندگی میں کام کرتی جاؤں۔ پھر اُنہوں نے حضرت بابا عطار سے کہا کہ ایک مسجد، ہاسٹل، مدرسہ جس میں بچوں کے لیے کمپیوٹر کی تعلیم بھی ہو، قائم کرنا چاہتی ہوں۔ حضرت نے سر جھکاتے ہوئے پوچھا نیکی میں دیر کس بات کی۔ بس سارے اخراجات کا تخمینہ لگاؤ۔ میڈم ظہرہ نے کہا کہ تخمینے اور حساب کتاب کی ہرگز ضرورت نہیں ہے۔ میں صرف سکون قلب چاہتی ہوں۔

ظہرہ مشتاق کی بیٹی لندن پڑھنے کے لئے گئی ہوئی ہے۔ وہاں اس نے اپنا ایک پاکستانی دوست بنا لیا ہے اور وہ اپنی امّی کو فون کر کے اس کے ساتھ شادی کا کہتی ہے لیکن ماں نے لڑکے کے والد کا نام سنتے ہی چپ سادھ لی اور بے ہوش ہو گئی کیونکہ لڑکا اس کا حقیقی بھائی ہے۔

ظہرہ مشتاق جب اپنی بیٹی سے لندن بات کرتی ہے تو ساتھ اس کی بات بھی کراتی ہے جو اس کا دوست پاکستانی لندن میں اس کے ساتھ زیر تعلیم ہے۔ لڑکا فون پر کہتا ہے کہ ماما میرا نام دلدار ہے۔ میرے پاپا قومی اسمبلی کے ممبر ہیں۔ اس سے پہلے مرکز میں وزیر تھے۔ سیاست ان کا شوق ہے۔ زیادہ تر وہ حکومتی کاموں پر بھی اپنی جیب سے خرچ کرتے ہیں۔ گزشتہ ماہ وہ لندن میں پاکستانی وفد کے ساتھ ملکہ الزبتھ کے ڈنر میں بھی شریک ہوئے تھے۔ ان کا نام دیوان عاشق حسین بخاری ہے۔ بس یہ سننا تھا کہ ظہرہ مشتاق کے ہاتھ سے فون گر پڑا۔ کبھی اس کی بیٹی مہر النساء تو کبھی دلدار حسین بخاری ہیلو ماما، ہیلو ماما کرتے لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ ناول کا یہ حصّہ بڑا جذباتی ہے۔ تمام طوائفیں ظہرہ کے گرد جمع ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر آ کر بتاتا ہے کہ برین ہیمبرج یا ہارٹ اٹیک نہیں ہوا بلکہ بلڈ پریشر بہت زیادہ بڑھ گیا ہے جس کی وجہ کوئی صدمہ بھی ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹروں نے فون

سننے اور کسی سے بھی بات کرنے سے منع کر دیا۔ شہر کے بڑے مشٹنڈے اس کی خبر گیری کرنے آ رہے تھے۔ ڈاکٹر تھے کہ ایک ڈرپ اترتی تو دوسری ڈرپ کے ساتھ ڈاکٹر باادب کھڑا نظر آتا تھا۔ ظہرہ کسی بھی لڑکی کو کچھ بتا نہیں رہی تھی کہ آخر معاملہ کیا ہے۔ اتنے میں لندن سے مہر النساء لاہور میں ماں کے پاس پہنچ جاتی ہے۔ دونوں ماں بیٹی گلے لگ کر خوب روتی ہیں۔ ظہرہ کا کلیجہ تھوڑا سا ہلکا ہوا تو اس نے اپنی بیٹی مہر النساء سے کہا کہ اگر تم میری بیٹی ہو تو دیدار سے شادی کا خیال نکال دو۔ بیٹی ماں سے کہتی ہے کہ ماما آپ تو روشن خیال ہیں پھر آپ ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔ وہ تو میری محبت ہے۔ ماں نے کہا کہ میں اب بھی روشن خیال ہوں پر آرتھوڈکس نہیں ہوں۔ لیکن حقیقت بتانا بھی میرا فرض ہے کیوں کہ میں تمہاری ماں ہوں۔ تجھے میں نے جنم دیا ہے۔ بیٹی ماں کے ہاتھ چومتی ہے اور یہ کہتی ہے کہ بندہ بڑے سے بڑا گناہ بھی کرتا ہے تو اللہ سبحانہ وتعالیٰ توبہ کرنے پر اسے معاف کر دیتے ہیں۔ انسان فرشتہ نہیں ہے بلکہ فرشتوں سے افضل ہے۔ اس لیے اس میں گناہ کی صفت بھی ہے لیکن جب توبہ کرتا ہے تو وہ ذات خوش ہو کر اس کو معاف کر دیتی ہے اور اس پر خوش ہوتی ہے۔ ماں اپنی بیٹی سے کہتی ہے کہ میں نے خطاکار ہوں مرنے سے پہلے اپنے گناہوں سے معافی مانگتی ہوں لیکن میں آج آپ کو اپنے گناہوں کا سچ بتاؤں گی۔ یونس جاوید ایک منجھے ہوئے ڈرامہ نگار بھی ہیں۔ یہاں ناول میں وہ اس داستان گناہ کو جو بدترا خلاقی جرم ہے اس طرح بیان کرتے ہیں۔ ان کا بیان سادہ، سبق آموز اور گہرا بھی ہوتا ہے جس طرح یہ ہے :

> ”دیوان عاشق حسین بخاری ہماری زندگی میں دو سال بندھن باندھ کر رہے تھے۔ انہی سے میری کوکھ ہری ہوئی تھی۔۔۔۔۔ جب وقت آیا تو ہاسپٹل میں پہلے بیٹے کا جنم ہوا۔۔۔۔۔ دیوان صاحب نے اس لوتھڑے کو لپیٹ لیا اور اپنی جاگیر پر لے گئے۔ ٹھیک رات کو چھ گھنٹے بعد ایک دوسرا بچہ پیدا ہوا۔۔۔۔۔ جو لڑکی تھی۔ وہ تم تھیں۔ تمہیں ہم نے چھپا کر ظہرہ محل پہنچا دیا تھا۔ دیوان عاشق حسین کے ہاں اور کوئی بیٹا نہ تھا۔۔۔۔۔ اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ انہوں نے تمہارے ساتھ پیدا ہونے والے کا نام دیدار حسین رکھا تھا“۔ (۱۱)

ناول میں یہاں پر ایک برے کردار سے دوسرا برا کردار جنم لے رہا ہے یعنی گناہ سے گناہ پیدا ہو رہا ہے۔ اس ناول کے بارے میں ڈاکٹر سلیم اختر لکھتے ہیں:

> ”ناول کنجری کا پل“ کی صورت میں اس نے ایسا آئینہ تیار کیا ہے جو معاصر معاشرہ کے مسخ شدہ نقوش دکھاتے ہوئے Distorting Mirror میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ناول کے کردار کسی طلسماتی دنیا میں سانس نہیں لیتے وہ میرے اور آپ کے جانے پہچانے

ہیں۔ کسی سڑک پر کسی گلی میں، کسی کوٹھی کے خوبصورت دروازے کے ساتھ کہیں نہ کہیں سامنا ہو جاتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم انھیں پہچان نہ سکیں۔ ان کے باطن میں جھانک نہ سکیں۔ ان کی زیست کے تضاد در تضادات کو سمجھ نہ سکیں۔ ان کی شناخت کے لئے کسی یونس جاوید کی ضرورت ہوتی ہے جبکہ میں اور آپ یونس جاوید نہیں۔"[۱۲]

ناول نگار نے ناول میں بُرائی سے بُرائی کی ایسی تصویر کھینچی ہے کہ اب مزید اس سے بُرائی جنم نہیں لے گی۔ طوائف کی غیرت جاگ چکی ہے وہ اپنی بیٹی کو گناہ در گناہ کی دلدل سے نکالنا چاہتی ہے اور اسے اپنی سچی داستان سنا دیتی ہے۔ اس کے بعد بیٹی بھی ماں سے وعدہ کر کے اپنا ارادہ ترک کر لیتی ہے۔ ناول نگار نے طوائف کی داستان کی آڑ میں قدیم شہنشاہوں کے کارناموں سے بھی پردہ اٹھایا ہے کہ وہ کس طرح رشتہ کرتے تھے۔ ان کے ہاں ایسا کرنا اخلاقی جُرم نہیں تھا لیکن اب ایسا ممکن نہیں کیونکہ اسلام اسے گناہ تصور کرتا ہے۔ تفسیر ابن کثیر میں علامہ عماد الدین ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ابتدا میں جب اولاد آدم کم تھی تو بہن بھائیوں کے رشتے جائز تھے لیکن جوں جوں آبادی بڑھتی گئی تو اس کو ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اب یہ عظیم گناہ ہے۔ اس لیے ظہرہ نے کنجری ہونے کے باوجود اس رشتے سے انکار کر دیا۔

ج۔ جام مصدق کے اخلاقی جرائم (زنا، شراب نوشی، اغوا، قتل):

ناول میں اگلا کردار سندھ کے جاگیر دار جام مصدق کا ہے جس نے اپنی بہت بڑی حویلی اور مہمان خانہ بنایا ہوا ہے۔ اس میں ایک سے بڑھ کر ایک طوائف ہر عمر کے معزز مہمانوں کے لیے بلوائی جاتی ہے۔ یہاں پر ایک اور کردار سلمان گوہر کا ہے جو خوبصورت نوجوان ہے۔ ہر عورت اس پر مرمٹنے کے لیے تیار کھڑی ہے۔ سمن اور فیروزے ان مہمانوں کی دل لبائی کے لیے خصوصی طور پر مدعو تھیں۔ فیروزے اور سمن سے وہ قابو میں نہیں آرہا تھا۔ جام مصدق بہت زیادہ پیسے خرچ کرتا تھا۔ تیز شراب کے ساتھ کال گرل کو یہ بھی آرڈر تھا کہ قوت باہ کی میڈیسن استعمال کرے تاکہ آنے والے مہمان جی بھر کر اپنا جنسی غصّہ ٹھنڈا کریں۔ سرخ رنگ کے جاگیر داروں کو دیکھ کر ظہرہ کا دل چاہ رہا تھا کہ ان کی جوانی اور رعنائی ایک پل میں اندر سمیٹ لوں۔ جام صادق کے مہمانوں میں اکثر اس کے دشمن ہی ہوتے تھے۔ وہ بھی سیاسی دشمن، جن میں سردار رند، زبیر چانڈیو، قادر جونیجو، کرامت چاندی والا اور پیر صاحب ضمیر خان، یہ سب جاگیر دار ایم این اے موجودہ اور سابقہ وزیر لیکن جام مصدق انتہائی چالاک سیاست دان اور جاگیر دار تھا۔ ایسی شطرنج کی چال چلتا کہ ہمیشہ دوسرا ہی شکست کھاتا بلکہ زندگی کی بازی بھی ہار جاتا ہے۔ یہ سب لوگ عورتوں کے گوشت کے شوقین، رقص و سرور کے دلدادہ

تھے۔ جام مصدق عجیب شخص تھا۔ جب محفل جمتی تو شراب کا ایک جام ضرور لیتا اور بہت آہستہ سپ کر کے نکل جاتا۔ اس نے کبھی کسی طوائف کو گود میں لیا نہ کبھی چوما، نہ آنکھوں کی شہوت میں ڈوبا کوئی پیغام دیا۔ البتہ یہ ضرور کہتا کہ کوئی مہمان ناراض نہ ہو اور کسی قسم کی کسر نہیں رہنی چاہیے۔ جب تیز شراب اور ننگے بدن طوائفیں دیکھ کر رند اور چانڈیو وغیرہ اپنی جوانی کے جوہر دکھاتے تین چار گھنٹے کی عیاشی ان کو کارڈیالوجی سنٹر پہنچادیتی اور ایک ایک کر کے سب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ پھر بعد میں یہ راز منکشف ہوا کہ کنجریاں اور شراب ساتھ شراب کے اندر تیز میڈیسن جب ان میں کوئی گر جاتا تو جام مصدق خود آ کر ان کو اسپتال پہنچاتا۔ اندر سے وہ بڑا خوش ہوتا تھا کہ ایک اور دشمن گیا۔ جب اس نے سومرو کو اسپتال جانے سے قبل خود نئے کپڑے پہنائے اور ایمبولینس میں لٹا دیا۔ اتنے بیوقوف دشمن تھے کہ وہ خود اس خودکشی کو قبول کرتے تھے۔ ناول میں یونس جاوید نے اس ڈرامائی انداز دشمنی کو اس طرح پیش کیا ہے :

> ”مجھے اسی دن معلوم ہوا کہ میں جام مصدق کے ہاتھ میں کتنا بڑا ہتھیار تھی۔۔۔۔۔ اور دشمن کو راہ سے ہٹانے کے کیا کیا طریقے ان وڈیروں نے ایجاد کر رکھے تھے۔ مجھے ماضی یاد آنے لگا۔ جو گواہی بن کر میرے سامنے آ کھڑا ہوا تھا کہ زبیر چانڈیو۔۔۔۔۔ تین صحبتوں کی مے نوشی اور میری کارکردگی پر کیوں کر پمز گیا تھا اور پھر نہ لوٹا تھا۔ پھر قادر جونیجو مضبوط ہونے کے باوجود دوسری صحبت میں ہی تڑپنے لگا اور پھر ایسا مفلوج ہوا کہ دل ہاسپٹل میں جا کر بند ہو گیا۔ سردار رند۔۔۔۔۔ کو بھی میرے ساتھ سوتے میں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ جام مصدق نے اسے کس محبت اور نم آنکھوں سے کارڈیالوجی پہنچایا۔ اس کے گھر والوں کو بلایا۔ خود دن رات تیمارداری کی۔ اخراجات تک برداشت کیے“۔ (۱۳)

یہ تھے وہ جرم جن کو جام مصدق بڑی محنت سے طوائفوں کے ذریعے انجام دیتا تھا۔ ہمارے سیاسی وڈیرے ایسی اخلاقی بیماریوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اس لیے بُرے شطرنج کے کھلاڑیوں کے چکر میں آجاتے ہیں۔ ان کی مرغوب غذا صرف شراب اور کباب ہوتا ہے۔ یونس جاوید نے ان طوائفوں کی زندگی سے پردہ اٹھایا ہے جو پیسے کے چکر میں پیار سے قتل کرتی ہیں کیونکہ یہاں ادیب کے ہاں قتل کا سبب ان لوگوں کے شوق ہیں جنہیں وہ کھل کر کرتے تو ان کا جسم ان کا ساتھ نہ دیتا جس سے موت واقع ہو جاتی۔ سب سے آخر میں سلمان گوہر مرا۔ وہ بھی بلڈ پریشر کا مریض تھا اس کو جام مصدق کے بندوں نے اغوا کر کے قتل کیا اور پھر اس کی لاش بوری میں بند کر کے نہر میں پھینک دی گئی۔ فیروزے جس نے یہ تمام قتل کرائے تھے۔ جام مصدق نے کراچی کے ایک

فلیٹ میں قتل کرا دیا۔ اس کی لاش کئی دن اندر ہی پڑی رہی صرف اس کی ڈائری سے اس کی پہچان ہوئی کہ یہ فروزے سمن ہے۔ اس کی تمام دولت بھی ظہرہ مشتاق کے پاس تھی۔ ظہرہ مشتاق نے اب یہ سوچ لیا تھا کہ اب باقی زندگی اسلام کی خدمت میں گزارے گی اور تمام گناہوں کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے گی۔

د۔ کال گرل صبازادی کے اخلاقی جرائم اور خودکشی:

فیروزے کو قتل جام مصدق نے اس لیے کروایا تھا کہ وہ اس کے ہر جرائم کی مرکزی کردار تھی جس کے ذریعے اس نے سومرو، چانڈیو، سلمان گوہر اور سردار رند کو قتل کرایا تھا۔ اب وہ مزید بڑے ثبوت فیروزے کو ٹھکانے لگانا چاہتا تھا تو اس نے لگایا۔ کیوں کہ اس کے پاس جام مصدق کے اتنے راز جمع ہو گئے تھے کہ اس کی ساری پارسائی اور سیاسی طاقت ایک ہی وار سے موت کے پروانے میں تبدیل ہو سکتی تھی۔ فیروزے عرف سمن بیگم کی ڈائری سے جو اس کی موت کے بعد ملی شناخت بیگم زوجہ سلمان گوہر کے نام سے کوئی۔

ناول میں اگلا کردار صبازادی کا ہے جس کو اس کے ماں باپ نے بچپن میں ایک بوڑھے کے ہاتھ فروخت کر دیا تھا لیکن گورا رنگ اور مست جوانی کی وجہ سے وہ ظہرہ مشتاق کے بوتیک میں پہنچ گئی تھی۔ اب وہ بھی بڑی بڑی بکنگ کر رہی تھی۔ آج اگر کراچی میں ہے تو دوسرے دن لاہور اسلام آباد کے فائیو سٹار ہوٹل میں۔ کاشف خان نام کے ایک بندے نے اسلام آباد سے اس کی بکنگ لاہور کے فائیو سٹار ہوٹل میں کرائی۔ یہ بھی ان بڑے لوگوں کی طرح تھا جو لڑکی کو پسند اسلام آباد میں کرتے ہیں لیکن ملتے لاہور میں جا کر ہیں۔ ادھر اسلام آباد میں بے شمار ہوٹل اور گیسٹ ہاؤسز کی بھرمار ہے لیکن یہ لوگ لاہور صرف نظروں سے بچنے کے لیے ظہرہ نے تمام لڑکیوں کو لڑکوں سے ملنے کے آداب سمجھا دیے تھے جس سے آنے والے مرد حضرات خوش ہوتے ہیں۔ یہ ویسے ہی ہیں جیسا کہ ناول "یاما" یعنی طواف میں ایک نائکہ نئی آنے والی لڑکیوں کو مردوں سے ملنے کے آداب سمجھاتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "اب ایک بات نصیحت کی اور تم سے کہہ دوں۔ بُرا نہ ماننا اکثر مہمان تم پر انوکھے طریقے سے شہوت کا اظہار کریں گے۔ عام طور پر ہماری فرم کو اس سے کوئی سروکار نہ ہو گا کہ کسی مہمان نے جو تمہاری خوبی کا دم بھرتا ہے یا جس کے ساتھ تمہارا دل مل گیا ہے تمہیں کتنا زائد انعام دیا ہے۔ ہمیں تو اپنے مقررہ ٹیکس سے مطلب ہے یا کھانے پینے کی چیزوں سے۔ جو کچھ وصول ہو اس سبب سے اگر کوئی اچھا مہمان بھی تم سے کوئی الٹا سیدھا فعل کروانا چاہے تو دوٹوک جواب دے دو۔ ہم تمہیں اس پر مجبور نہیں کریں گے۔ نہ ہمیں یہ حق پہنچتا

ہے۔ صرف ہمارے تمہارے درمیان اقرار اس بات کا ہے کہ اگر وہ سیدھی سادی پرانے طریقے کی محبت چاہے تو انکار نہیں کرنا ہو گا۔ اگر ایسا کرو گی تو قول توڑو گی۔ یہ تمھیں بتا دوں کہ یہ لوگ بعض دفعہ بڑی بڑی رقمیں دے کر نہال کر دیتے ہیں اور کھانے پینے کی چیزوں پر بھی روپیہ پانی کی طرح بہاڈالتے ہیں۔ یہ لوٹ کا مال سب تمہارا ہے۔ ہمارا حصّہ تو دکان کی آمدنی سے ہے"۔(۱۴)

یونس جاوید نے ایسی ہی تصویر طوائف کی اس ناول میں کھینچی ہے کہ گاہک سے اتنا ہی تعلق بنانا جس کا وہ قابل ہو۔ اپنی فیس وصول کی اور اگلے گاہک کی طرف ہو لیے۔ یہاں رشتہ داری نکالنا مقصود نہیں ہوتا۔ کاشف ہوٹل میں آکر صبازادی سے آہستہ آہستہ سب کچھ اس کے ماضی کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہے۔ کاشف نے صبازادی پر لاکھوں روپیہ خرچ کیا تھا کیونکہ اس کے پاس پیسے کی کمی نہیں تھی۔ اس نے نو سو کروڑ سے زیادہ کا فراڈ کیا تھا اس لیے وہ اپنی عیاشی کے لیے فائیو سٹار ہوٹل میں کمرہ بک کرواتا ہے۔ اس کو وہ اپنی جنسی تسکین کہتا ہے۔ صبازادی کاشف کا منہ چوم کر کہتی ہے کہ تم میری تعریفیں کر رہے ہو۔ لوگ ہمیں "سیکس ورکر" کہتے ہیں۔ تم تو میرے سارے بدن کو چومے جا رہے ہو۔ کاشف خود بھی شراب پیتا ہے اور صبازادی بھی شراب پیتی ہے۔ پھر کاشف اپنی آپ بیتی صبازادی کو بتاتا ہے کہ میں شمالی وزیرستان کا رہنے والا ہوں۔ جب وہاں آپریشن ہوا تو میری عمر صرف دس سال تھی۔ فوجیوں نے مجھے بھی پکڑ لیا۔ جب میں بے گناہ نکلا تو بریگیڈیر صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے اور اپنی سگی اولاد کی طرح پالا۔ بریگیڈیر صاحب کا کوئی بچہ نہیں تھا۔ مجھے انگریزی سکولوں میں پڑھایا گیا۔ آج کل میں ایف اے پاس ہوں۔ بریگیڈیر صاحب ڈیڑھ سو کروڑ کی جائیداد چھوڑ کر مرے تھے وہ سب میری ہے۔ ڈیڑھ سو کروڑ انہوں نے بینکوں سے کاروبار کے لیے تھے اور بعد میں قرضہ معاف کرا لیا۔ اس غیر اخلاقی مالی جرم کو یونس جاوید نے اس طرح عکاسی کی ہے:

"بریگیڈیر صاحب؟ بس وہی ٹریجڈی میری زندگی میں۔۔۔۔ریٹائرڈ ہو چکے تھے ۔۔۔۔ بزنس کیا۔۔۔۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ انہوں نے بزنس کے لیے ڈیڑھ کروڑ قرضہ بھی لے رکھا ہے-- اسی لیے تو میں ایف اے سے آگے نہ پڑھ سکا۔ بزنس تو خیر کیا ہوتا۔۔۔۔ انھوں نے دوسروں کی طرح قرضہ معاف کرا لیا۔۔۔۔ اس دن وہ بہت خوش تھے۔ انہوں نے مجھے نئی کرولا لے کر دی۔ ماں جی کے لیے پراڈو لائے ۔۔۔۔ حالانکہ چھے گاڑیاں موجود تھیں۔ ہاں یہی تین سال میری زندگی کے روشن اور

مزید ار گزرے۔ چوتھے سال کے آخر میں وہ نیب زدہ ہو گئے۔ تمام قرضے معاف کرانے والوں کو دھر لیا گیا"۔(۱۵)

ناول میں ہمارے پیارے ملک پاکستان کی داستان لکھی ہے کہ مجرموں نے اس کو کس انداز سے مقروض کیا۔ بینکوں سے بڑے بڑوں نے قرضے لیے جب نیب زدہ ہوئے تو طاقتور لوگوں کی طرح بریگیڈیر صاحب بھی بری ہو گئے لیکن دوست جیسا شیطان میرے لیے چھوڑ گئے تاکہ میں گناہ کی وادی میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غرق ہو جاؤں۔ کاشف کی داستان ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ رات کو دونوں صبازادی اور کاشف خان ایک دوسرے کو چومتے چومتے مست اپنی اپنی کہانی سن رہے تھے۔ اچانک اس میں ڈرامائی موڑ آتا ہے جب وہ یہ بتاتا ہے کہ میں وزیرستان کے فلاں گاؤں کا رہنے والا ہوں۔ میرے اصلی باپ کا نام یہ تھا۔ باپ سانپ کے ڈسنے سے مر گیا۔ ماں بھی مر گئی۔ چھوٹی بہن حیا کو بخار نے مار دیا۔ ایک چھوٹے بھائی کو جنگجو بہلا پھسلا کر لے گئے۔ ہاں ایک بڑی بہن تھی جس کا نام صبا تھا اس کو باپ نے ساڑھے تین لاکھ میں گندل خان لکڑہارے کے آگے بیچ دیا تھا۔ بس یہ لفظ صبازادی سننے تھے کہ کاشف خان کے منہ پر زور سے تھپڑ مار دیا اور ننگی ہی ہوٹل کے برآمدے میں نکل آئی۔ اب ہوٹل میں الف ننگی لڑکی کو ہر کوئی دیکھنے کے لیے اپنے اپنے کمرے سے باہر آ گیا۔ کوئی بریگیڈیر تو کوئی ہوٹل کا مینجر، کوئی بزنس مین تو کوئی جاگیر دار، کوئی بیوروکریٹ ہر کسی کے منہ میں الف ننگی لڑکی کو دیکھ کر پانی آرہا تھا۔ رات کے اڑھائی بجے کا وقت تھا۔ اگر کوئی اس کی طرف چادر یا کپڑے پھینکتا تو وہ نیچے گرا دیتی۔ لوگ اسے کس انداز میں سمجھاتے ہیں۔ ناول میں یونس جاوید نے اس کو یوں بیان کیا ہے:

"اس سے زیادہ گھٹیا حرکت کیا ہو گی کہ شریف تماش بین کو سرِ بازار بے عزت کر دیا جائے۔ ایسے مہذب شخص جو تجھے عزت دینے اور تیرا مقام بلند کرنے کو تجھے اعلیٰ ترین اور اتنے بڑے ہوٹل میں لایا ہو تم نے دومنٹ میں اسے رسوا کر کے تماشہ بنا رکھا ہے۔ ابھی تک کیوں کیا تم نے ایسا"۔(۱۶)

ایک مسافر آکر کہتا ہے کہ یہ لنڈا بازار میں رات گزارنے والے لوگ فائیو سٹار ہوٹل کی عزت کو داغدار کر رہے ہیں۔ مینجر علیحدہ سے منت سماجت کر رہا ہے۔ صبازادی ننگی کبھی ادھر تو کبھی اُدھر دوڑ کر جا رہی ہے۔ اس کے اندر ایمان جیسی طاقت جاگ جاتی ہے۔ وہ کاشف خان اس کا سگا بھائی تھا۔ پھر وہ اس کے ساتھ بدفعلی بھی کر چکی تھی۔ مزید کرنے سے اس کی غیرت جاگ گئی۔ لیکن لوگ ہیں کہ کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ تم بچی نہیں ہو بلکہ خود اپنی مرضی سے اس ہوٹل میں آئی ہو۔ لیکن اندر کی بات تو صرف صبا ہی جانتی تھی۔ صبا غرا کر

کاشف پر زور سے تھوکتی ہے اوراس کی لائی ہوئی چادر کو دور پھینک دیتی ہے اور چیخ مار کر بھاگتی ہوئی بالکونی سے نویں منزل سے نیچے چھلانگ لگادی۔ گرتے ہی اس کی جان نکل گئی۔ ساتھ ساری ہڈیاں بھی ٹوٹ گئیں۔ اس کی کنپٹی سے گرتی خون کی لکیر فرش پر انکار اور غیرت لکھ رہی ہے۔ اس نے یہ ثابت کر دیا کہ کنجری خواہ کچھ بھی ہو بھائی سے مزید زنا نہیں کر سکتی۔ ناول میں یہاں پر اس کی خودکشی اس کی غیرت کی وجہ سے ہے۔ اسی غیرت کو ظہرہ مشتاق نے جلا بخشی تھی۔ جب اس نے اپنی بیٹی مہرالنساء کی شادی دیدار حسین جو اس کا سگا بھائی تھا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہاں پر بھی کچھ ایسی ہی ناول میں ملتی جلتی کہانی ہے جس کو یونس جاوید نے جرم سے مزید جرم کی پیدائش کو روکا ہے اور خود ہمیشہ ہمیشہ کے لیے گم ہو گئی۔ اس کے لہو سے بننے والی لکیر کی یونس جاوید نے الفاظ کی صورت میں اس طرح تصویر کشی کی ہے:

> ”سب سے نمایاں کنپٹی سے بہنے والی لہو کی لکیر تھی جو فرش پر ایک ”انکار“ رقم کرتی چلی جا رہی تھی۔ دوسرے دن ہر اخبار میں ڈیڑھ انچ کالم میں ایک ہی خبر شائع ہوئی تھی۔ ”ایک خوبرو عورت نے ملازمت کے لیے دی گئی درخواست مسترد ہونے پر ہوٹل ”ہیر وسٹار“ کی نویں منزل سے کود کر خودکشی کر لی۔۔۔۔۔ پولیس کو ورثہ کی تلاش ہے“۔ (۱۷)

یہ تھی اس طوائف کی داستان جس نے غیرت کے پردے میں جان دی اور حیا کے دامن کو چاک ہونے سے مزید بچا لیا۔

ر۔ حضرت بابا عطار کے اخلاقی جرائم اور شیطانیت:

ناول اب اپنے انتہائی اہم موڑ کی جانب بڑھتا ہے۔ سمن صبازادی کی موت اور مہرالنساء کی غیر قانونی دیدار سے شادی جیسے جرائم کے بعد ظہر مشتاق کا جسم شل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ ایک پل صراط کو عبور کرتی ہے تو دوسرا پل اس کی راہ روکے کھڑا ہوتا ہے۔ زندگی میں رکاوٹ کے پُل ہیں کہ ان کی تعداد کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہی۔ ہر پُل ایک سراب کی طرح پھیلتا چلا جاتا ہے۔ ہر طرف سے اس کے کانوں میں گناہ گار گناہ گار کی آوازیں آتی ہیں۔ وہ ان کا مداوا چاہتی ہے، پارسائی اختیار کر کے مخلوق خدا کے لیے ایک مثال بننا چاہتی ہے۔ یہاں گناہ کے اندر سے پارسائی پھوٹتی نظر آتی ہے۔ اس لیے اس نے بابا جی حضرت عطار کو ”مسجد العظمت“ بنانے کا کہا تھا اور اس کے لیے تین چار کروڑ روپیہ بھی دیا تھا۔ جب مسجد تیار ہو گئی تو ظہرہ مشتاق نے بابا جی سے کہا کہ آپ مجھے مسجد کے افتتاح کے لیے کب بلائیں گے؟ تو وہ اگلے جمعۃ المبارک کا کہتا ہے۔ ساتھ اسے یہ بھی کہتا ہے کہ اگر گناہوں کا کفارہ ادا کرنا چاہتی ہو تو ایک بات سنو آپ کے میاں مشتاق صاحب آٹھ سال تک لاپتہ

رہے۔ آپ کا نکاح بھی فسخ ہو گیا ہے اور آپ بغیر حلالہ کے اس کے ساتھ رہ رہی ہے ہیں۔ ظہرہ کہتی ہے کہ حضرت جی وہ علیحدہ کمرے میں رہتے ہیں میرا ان سے کوئی تعلق نہیں سوائے گھر کے ایک فرد کے۔ بابا جی کہتے ہیں کہ آپ تو عذاب کو دعوت دے رہی ہیں۔ بابا عطار کبھی گاؤ تکیے کو ٹیک لگا کر بیٹھتا ہے تو کبھی سر نیچا کر کے ظہرہ سے کہتا ہے کہ تو اپنا احتساب خود کر۔ لیکن وہ کہتی ہے حضرت جی میں نے تو اپنی دنیا اب خدا کے لیے وقف کر دی ہے۔ حضرت عطار کہتا ہے کہ اگرچہ تم مجھ سے چھے سال بڑی ہو لیکن میں آپ کو ظہرہ جان کہتا ہوں۔ خدا تعالیٰ خوبصورت ہے اور خوبصورتی کو پسند کرتا ہے۔ جُگ بیت گئے لیکن حسن یوسف کی مثال ابھی تک زندہ ہے۔ ظہرہ کہتی ہے کہ مجھے کوئی راستہ بتائیں تاکہ میں اپنے آپ کی تکمیل کر سکوں۔ میرے لیے کیا حکم ہے حضرت جی؟ حضرت جی کے دل میں جو بات مچل رہی تھی وہ یہ ہے کہ میں آپ کو اپنے عقد میں لینا چاہتا ہوں۔ ظہرہ نے حضرت عطار کی تبلیغ سے یہ اندازہ لگالیا تھا کہ کچھ تو پردہ داری ہے جس کا اظہار حضرت جی نہیں کر رہے ہیں تو اس نے وہ کر دی۔ ظہرہ پر ایسے ہوا جیسے کسی نے بھاری پتھر اس کے سر پر دے مارا ہے۔ کیونکہ حضرت جی کی ٹھہر ٹھہر کر طول طویل گفتگو سے کسی طوفان کے اٹھنے کی بو آ رہی تھی۔ پہلے تو ظہرہ پر کپکپی طاری ہوئی لیکن خاموشی کی طاقت نے اس کو حوصلہ دیا۔ ابھی ظہرہ کچھ کہنے والی تھی کہ حضرت جی بیچ میں بول پڑے سچی بات تو یہ ہے کہ شرع میں کوئی شرم نہیں ہے۔ ربِ کریم کی شکر گزاری اسی میں ہے کہ جس میں انسان کے سارے گناہ دُھل جائیں اور بندے کی عاقبت بھی سنور جائے۔ وہ فرض صرف نکاح ہے اور سچی بات پوچھتی ہو تو میں آپ کے بغیر ظہرہ جی اب ایک پل بھی گزار نہیں سکتا۔ نہ آپ کے بغیر اب سانس چلتی ہے۔ یہ تھا حضرت جی کا اصل چہرہ کہ اگر مجھ سے عقد کرو گی تو سارے گناہ دُھل جائیں گے ورنہ سیدھی جہنم میں جاؤ گی جو آپ نے غیر اخلاقی جُرم کیے ان کی بخشش کسی صورت نہیں ہے۔ یہ تھی حضرت عطار کی خواہش۔ اب ظہرہ لب کشائی کرتی ہے کہ حضرت جی آپ نے مجھے دنیاداری سے بچایا۔ غلط کاری سے نجات دلائی، ایک روشن راستہ دکھایا جس سے میرے دل کو بھی سکون ہوا۔ ظہرہ کی آواز اس کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ گویا وہ ہانپ رہی تھی۔ یونس جاوید ایک کامیاب ڈرامہ نگار ہیں یہاں ناول میں بھی ان کا انداز ڈرامائی ہے۔ ناول یہاں پر اپنے عروج پر ہے۔ ایک اخلاقی گناہ کرنے والی طوائف جب راہ راست پر آنے کی کوشش کرتی ہے تو دنیادار اسے ایسا کرنے نہیں دیتے۔ اصل میں یہی لوگ مجرم ہیں جو کسی کو اچھی راہ لگانے کی بجائے اپنی خواہشوں کی تکمیل چاہتے ہیں۔ ظہرہ پھر اپنی بات شروع کرتی ہے کہ حضرت جی آپ میرے مرشد بھی ہیں، ولی بھی۔ آپ کی حیثیت میرے نزدیک ایک دیوتا کی ہے۔ آپ ہی میری عاقبت اور نجات کے امانتدار ہیں۔ میں اس مقدس رشتے کو توڑ نہیں سکتی۔ میں دوبارہ شہوت کی

گھاٹیوں میں نہیں جاسکتی۔ لیکن حضرت صاحب کہتے ہیں کہ سارے راستے اللہ کی دی ہوئی عقل سے کھلتے ہیں جو تمام جہانوں کا خالق ہے، مالک بھی ہے مگر انسان کتنی بڑی نیکی کر جائے، کیسا ہی اس نے دنیا میں فلاحی کام کیا ہو، اس پر جو لیبل لگا ہو وہ نہیں اُترتا ہے، نہ دھلتا ہے۔ پھر وہ ظہرہ کو ڈیرہ دار طوائف اماں صالحہ کا قصّہ سناتے ہیں۔ اس کو یونس جاوید نے یوں پیش کیا ہے :

> "میں تمہیں اماں صالحہ کا قصّہ سناتا ہوں ۔۔۔۔۔ جو ڈیرہ دار طوائف تھی اور تین نسلوں سے تھی۔ عمر بھر دھندہ کیا، کرایا، بازار اس کی جنت وہی دوزخ بھی۔ اس کے اندر بھی نیکی کی کونپلیں مہکنے لگی تھیں۔ رفاعی کام تو اس نے بہت کیے ۔۔۔۔۔ مگر تمہاری طرح زندگی استوار کی۔ عشوہ طراز تھی۔ خوبرو تھی۔ جوان اور پرکشش تھی۔ زندگی سے لذت کا حصول اس کا وطیرہ رہا مگر نیکی کی چنگاریاں بھی سینے میں موجزن رہیں۔ سچائی کی رمق تابندہ ہونے سے ہی وہ انسانوں کے لیے نیک جذبات لیے تھی مگر بازار میں سے کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتی تھی۔ یہ بھید بالآخر کُھل ہی گیا۔ جب اس نے ۱۹۲۰ء میں لاہور میں بڑے نالے پر پُل تعمیر کرایا۔ مگر ایک مدت سے لوگ میلوں کا سفر کر کے جس منزل پر پہنچتے تھے اب سہولت سے گزرنے لگے مگر کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی کہ یہ کسی طوائف نے بنوایا ہے"۔(۱۸)

قصّہ مختصر کہ اٹھارہ سال بعد پل کا ایک حصّہ شدید بارشوں سے ٹوٹ گیا تو لوگوں کو معمار کا خیال آیا جب یہ خبر اماں صالحہ تک پہنچی تو اس وقت وہ بوڑھی ہو رہی تھی۔ اس نے دوبارہ اس کی تعمیر کروائی۔ لوگوں کو جب پتہ چلا تو وہ کنجری پُل کے نام سے مشہور ہو گیا اور تماش بینوں نے اماں صالحہ کو پہچان کر ہی پُل کو "کنجری کا پُل" کہنا شروع کیا تھا پھر کیا تانگے والے اور لاریوں والے بھی پُل کنجری جانے والوں کے لیے آوازیں لگانا شروع ہو گئے۔ حتیٰ کہ پورے علاقے کا نام پُل کنجری مشہور ہو گیا۔ اماں صالحہ کی اور بھی بڑی خدمات تھیں۔ جب ۱۹۳۹ء میں خاکساروں پر پولیس نے فائرنگ کی تو بھاٹی چوک سے شاہی مسجد تک کا علاقہ میدان جنگ بن گیا۔ خاکساروں کے لیڈر کو گولی لگنی تھی کہ انہوں نے ایک گورے پولیس افسر کو بیلچوں سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ پولیس نے جلوس پر اندھا دھند گولیاں چلائیں جس طرح ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء میں جلیاں والا باغ امر تسر اور ۱۹۳۰ء میں قصہ خوانی بازار پشاور میں ریاست کی سرپرستی میں عوام کا قتل عام ہوا۔ ٹبی گلی میں جب فائرنگ ہوئی تو لوگ بھاگ کر اماں صالحہ کے گھر داخل ہو گے۔ اماں نے ان کو پناہ دے دی۔ پولیس نے گھر گھر تلاشی لی لیکن

اماں نے کسی خاکسار کا نام نہ بتایا۔ حتٰی کہ وہ اس کی پناہ میں تھے پھر اماں کو گرفتار کر کے شاہی قلعہ میں رسیوں سے باندھ دیا۔ اماں نے اپنی جان دے دی لیکن کسی خاکسار کا پتہ نہ بتایا۔ رسیوں سے بندھے کے جسم سے سارا خون نچڑ گیا لیکن آزادی کی خاطر ایک کنجری نے جان دے دی۔ وطن کے لیے جان سے بڑا کوئی نذرانہ نہیں۔ جب اس قربانی کے چرچے شہر شہر گاؤں گاؤں پھیلے تھے تو ہر کوئی اسے شہادت کا درجہ دیتا تھا۔ لیکن ٹِل کا نام اماں صالحہ شہید لکھنے کی بجائے کنجری کا ٹِل ہی رہا۔ اب پھر یہاں ناول نگار نے ڈرامائی انداز اختیار کرتے ہوئے ظہرہ نے حضرت عطار سے شادی کرنے سے انکار کر دیا ہے اور یہ کہتی ہے کہ میں پہلے ہی شادی شدہ ہوں۔ مزید گناہ در گناہ نہیں کر سکتی۔ پھر کیا ہوا کہ حضرت جی آگ بگولہ ہو گئے۔ میری بات غور سے سنیں اگر اماں صالحہ کنجری کسی درویش سے عقد کرتی تو اس کے درجے ولیوں کے برابر ہو جاتے۔ لیکن ظہرہ نے دوٹوک الفاظ میں کہا کہ میں نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر رکھا ہے۔ اب میں ساری آسائشیں اور سارے دکھ لوٹا چکی ہوں۔ انھیں واپس لینا خیانت ہے۔ میں خدا کی ذات میں فنا ہو کر امر ہونا چاہتی ہوں۔ میں اپنی ذات کی نفی کے لیے حضرت جی آپ کے پاس آئی تھی۔ اب میں دنیاداری کی کالک نہیں مل سکتی۔ دنیا کو میں نے ظاہر اور باطن سے دیکھ لیا ہے۔ مجھے معاف کریں اور میری طرف سے پکا انکار سمجھیں۔ حضرت جی نے کہا کہ تمہاری مسجد الاعظمت تیار ہے اور ساتھ مدرسہ بھی۔ اس پر ہم نے دن رات محنت کی ہے۔ اگلے جمعے کو افتتاح کے لیے آجانا۔ لیکن اندر ہی اندر سے حضرت عطار نے بدلہ لینے کی ٹھانی۔ حضرت عطار کے اندر کا درندہ جاگ گیا۔ پگڑی عمامہ تو اس نے ظاہری طور پر اوڑھا تھا اندر سے وہ بھی خواہش کا غلام تھا اور جرائم پیشہ لیکن زبان پر ہر وقت توبہ استغفار پڑھتا رہتا۔ جاتے وقت ظہرہ نے منت سماجت بھی کی تھی کہ حضرت جی مجھے معاف کرنا۔ ہم آپ کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہیں۔ ہم اس قابل نہیں ہیں کہ آپ کے عقد میں آئیں۔ آپ بہت عظیم ہستی ہیں۔ حضرت عطار اب کھل کر بدلہ لینے کا ارادہ کر چکا تھا۔ اگلا جمعہ آنے پر ظہرہ کے ڈرائیور احمد خان نے چار ہزار ڈبے مٹھائی کے اور اس کے علاوہ تین چار دیگیں بریانی اور ایک دیگ زردہ کا انتظام کر لیا۔ جمعے کی پہلی اذان ہوتے ہی احمد خان مسجد کے سامنے جا پہنچا۔ لیکن وہاں تو منظر ہی بدلا ہوا تھا۔ اتنی شاندار مسجد کے سامنے بہت بڑا لوگوں کا جلوس اکٹھا ہوا ہے جس کی قیادت حضرت عطار کر رہے ہیں۔ ظہرہ مسجد سے سو گز دور ہی گاڑی میں بیٹھی یہ نظارہ کر رہی ہے اور اندر سے بے حد خوش ہے۔ اب جو تقریر حضرت عطار نے وہاں کی وہ ہمارے آج کے ملّاؤں پر بڑی فٹ بیٹھتی ہے۔ جو آئے روز مذہب کو اپنے ذاتی مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں اور فساد فی الارض پھیلاتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:

”دوستو۔۔۔۔۔مومنو۔۔۔۔۔فیصلہ ابھی ہونا چاہیے۔۔۔۔۔میرے سوالوں کا جواب دو

بولو۔۔۔۔۔شراب سے وضو جائز ہے؟ بولو۔۔۔۔۔ بولو؟؟

ہجوم نہ پورے پھیپھڑوں کا زور لگا کر جواب دیا۔۔۔۔۔نہیں۔۔۔۔۔نونو“

کیا سور کے گوشت سے روزہ افطار کیا جا سکتا ہے؟

ہجوم نے جواب میں کہا: حرام۔۔۔۔۔حرام

صاحبو۔۔۔۔۔حرام کی کمائی سے زکٰوۃ دی جا سکتی ہے؟؟زور سے بولو

لوگ پکارے نہیں نہیں نہیں

پھر سوال اٹھایا گیا۔ کیا جسم فروشی کی کمائی سے اللہ کا گھر تعمیر کیا جا سکتا ہے؟ ہجوم زور سے

چلایا”استغفر اللہ استغفر اللہ “

دوسرے گروہ نے زور سے اچھالا”لاحول ولا۔۔۔۔۔قوۃ۔۔۔۔۔لاحول ولا قوۃ“(۱۹)

پھر کیا تھا کہ ہر طرف سے لوگ مٹا ڈالو، گرا دو، گندگی صاف کرو، نعرۂ تکبیر لگتے ہی مسجد العظمت کے ستون، محراب، نقش و نگار، شیشے سب چکنا چور ہو گئے۔ ہجوم نے پتھر مار مار کر قیمتی فانوس تباہ کر دیے۔ یہ ہمارے مجرمانہ کلچر کی ایک جھلک ہے۔ ہر بندہ جنت کمانے کے چکر میں زیادہ سے زیادہ جوش سے تباہی پھیلانے میں مصروف تھا۔ اتنے میں حضرت عطار کی آواز آئی۔ اگر جنت کمانا ہے اور اب عاقبت سنوارنا ہے تو جسم فروشی کی یاد کو جڑ سے اکھاڑ پھینکو۔ ظہرہ حضرت عطار کی حرکتی دیکھ کر خون کے آنسو رو رہی تھی۔ احمد خان ڈرائیور نے پولیس کو ایمرجنسی کال کی۔ ہجوم نے ظہرہ کی گاڑی کو آگ لگا دی۔ احمد خان کو پتھر مار مار کر ہلاک کر دیا۔ پولیس نے آکر بڑی مشکل سے ظہرہ کو گاڑی سے نکالا اور بچا کر ساتھ لے گئے۔ ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں کنجری کنجری۔۔۔۔۔ حضرت عطار نے ظہرہ کی جلی ہوئی بی ایم ڈبلیو گاڑی دیکھی جس میں وہ کبھی لیٹ کر سفر کرتے تھے۔ جب تمام کام مکمل ہو گیا تو ہجوم سے کہا کہ مردود احمد خان کی لاش کو ٹھکانے لگا دو۔ نماز جمعہ کا وقت نکل رہا ہے۔ حضرت عطار کی انا، غرور، حتیٰ کہ خواہش کی بھینٹ چڑھتی یہ مسجد، مدرسہ، بی ایم ڈبلیو گاڑی، احمد خان ڈرائیور کا قتل سب غیر قانونی، غیر آئینی اور بہت بڑا اخلاقی جرم تھا۔ یہاں ہمیں ایک درس یہ ملتا ہے کہ کنجری کا پُل تو اب بھی رواں دواں ہے۔ لوگ اس سے فائدہ اٹھا رہے ہیں جبکہ مسجد العظمت حضرت عطار کی جنسی خواہش کے سبب شہید ہو گئی۔ پولیس آئی اس نے مسجد کو تالا لگا دیا کر اوپر سرکاری مہر ثبت کر دی اور مسجد پر سرکار کا قبضہ ہو گیا۔ یونس جاوید نے جس انداز سے کنجری کا پُل ناول کا اختتام کیا ہے اور اس میں ایک سے بڑھ کر ایک

اخلاقی جرم ساتھ ساتھ قاری کی توجہ پاکستان کے بگڑتے ہوئے حالات کی طرف دلوائی ہے جہاں نام نہاد پیر اَن پڑھ مولوی، لوگوں کو مار دھاڑ کی ترغیب دیتے ہیں اصل میں یہ لوگ دہشت گرد ہیں جو اسلام کی خدمت نہیں کر رہے بلکہ حلیہ بگاڑ رہے ہیں۔ اسلام تو کہتا ہے کہ ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہے۔ ناول کی روشنی میں جب ہم اپنے اردگرد دیکھتے ہیں تو ایسے جرائم پیشہ حضرت عطار ہر جگہ موجود ہیں۔ ۳ دسمبر ۲۰۲۱ء کو سیالکوٹ میں سری لنکن فیکٹری منیجر کو کلمہ گو مسلمانوں نے صرف اس لیے ڈنڈوں اور پتھروں سے مار کر لاش کو جلا دیا کہ اس نے کوئی اسلامی پوسٹر پھاڑا ہے جبکہ مارنے والے اسے مذہبی فریضہ سمجھ کر ایسا کر رہے تھے لیکن ان چیزوں سے اسلام کا دور کا واسطہ بھی نہیں کیونکہ اسلام تشدد، مار دھاڑ، قتل وغارت، الزام تراشی کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مساوات، رواداری، عفوودرگزر، دوسروں کے کام آنا، انسانی جان کی حرمت اس کے نزدیک خانہ کعبہ سے بڑھ کر ہے۔

ناول کے آخر میں یونس جاوید کہتے ہیں کہ آج ہم لاہور کے کسی بھی مزار کی زیارت کرتے ہیں، جن میں نمایاں بابا لال شاہ، شاہ حسین، پیر مکی، میاں میر، بی بی پاک دامن، حضرت موج دریا، شاہ جمال، شاہ شمس قادری شاہ عنایت سب سے بڑھ کر حضرت علی ہجویری داتا صاحب کا مزار ہے تو ہمیں چاروں طرف پھیلی ہوئی آبادیوں کے مکینوں کو "کنجری کاپُل" پار کرنا ضروری ہے۔ ناول نگار کے نزدیک مجرم حضرت عطار ہے۔ کنجری ظہرہ مشتاق پاک دامن ہے کیونکہ اس نے اپنے خدا کے حضور سچی توبہ کر لی ہے۔ رب غفور توبہ قبول کرتے ہیں جبکہ حضرت عطار جیسے لوگ توبہ سے محروم ہیں۔ یہاں پر یونس جاوید نے نام نہاد قسم کے لوگوں کا ذکر کیا ہے جو مسلمان تو ہیں لیکن نام کے۔ اندر کچھ نہیں۔ اس واقعے سے ملتا جلتا واقع ایلف شفق کے ناول " چالیس چراغ عشق کے "(Forty Rules of Love) کا بھی ہے جب شہر کی مشہور طوائف " گل صحرا "مولانا جلال الدین رومی کا لیکچر سننے کے لیے مسجد میں مردانہ روپ دھارے بیٹھی تھی تو اچانک کوئی بچہ پاس سے گزرا جس سے اس کی مردانہ پگڑی سرک گئی اور اس کے بال دیکھ کر کوئی پچیس تیس لوگ اس کو مارنا شروع ہو گئے۔ یہ مجرمانہ رویے کی تصویر کشی ہے۔ ملاحظہ ہو:

> "پس منظر میں ہنگامہ سا اٹھا، پہلا خیال مجھے یہ آیا تھا کہ مسجد میں کوئی جیب تراش پکڑا گیا تھا۔ لیکن چیخیں بلند ہوتی گئی اور ان میں شدت آتی گئی تو میں سمجھ گیا کہ کوئی بڑی بات ہوئی تھی۔ کوئی جیب تراش اس قدر شوروغوغانہ کرتا۔ ہمیں جلد ہی معلوم ہو گیا ایک عورت، ایک مشہور طوائف مسجد میں مردانہ حلیے میں پکڑی گئی تھی۔ لوگوں کا ایک گروہ اسے یہ چلاتے ہوئے دھتکار کر باہر نکال رہا تھا۔ اس دغاباز کو درے لگاؤ! طوائف کو درے لگاؤ۔

> اس حالت میں مشتعل ہجوم گلی میں نکل آیا۔ مجھے مردانہ لباس میں ملبوس ایک عورت کی جھلک دکھائی دی۔ اس کے چہرے پر موت کی سی زردی تھی اور اس کی بادامی آنکھیں دہشت زدہ تھیں۔ میں نے پہلے کئی لوگوں کو گھیر کر مارتے دیکھا تھا۔ میری اس بات پر حیرت کبھی ختم نہ ہوئی کہ لوگ ہجوم میں شامل ہو کر کیسے ڈرامائی طور پر بدل جاتے تھے۔ عام آدمی جو ماضی میں کبھی شدت پسند نہ رہے ہوتے تھے۔۔۔۔۔ کاریگر، پھیری والے یا ٹھیلے والے۔۔۔۔۔ جب آپس میں مل جاتے تو قتل کرنے کی حد تک جارح ہو جاتے تھے۔ ہجوم کے ہاتھوں ہلاکتیں عام تھیں اوران کے آخر میں دوسروں کی تنبیہ کے لیے لاشوں کو نمائش کے لیے چھوڑ دیا جاتا تھا"۔(۲۰)

یہاں پر بھی کوئی ایسا ہی منظر تھا کہ احمد خان کی لاش کو جوش ایمان میں آکر عام مشتعل لوگوں نے اس لیے چھوڑا تھا کہ کنجری عبرت حاصل کرے۔ ساتھ دوسرے لوگ بھی لیکن اصل بات کا کسی کو بھی علم نہیں تھا۔ اس سے بڑھ کر ناقص ایمان اور کس کا ہو سکتا ہے جیسے اس ناول میں لوگ کنجری کنجری مسجد میں کر رہے ہیں۔ ویسا ہی منظر یہاں بھی تھا کہ مسجد العظمت کے باہر حضرت عطار کی قیادت میں ہجوم کنجری کنجری مار ڈالو، لٹکا دو، فنا کر دو کے نعرے لگا رہے تھے۔ یہاں پر ایک لطیفہ یاد آگیا کہ ایک دفعہ ایک شخص نے حضرت شاہ ولی اللہ (۱۷۰۳ء تا ۱۷۶۱ء) محدث دہلوی کے فرزند شاہ عبدالعزیز (۱۷۴۶ء تا ۱۸۲۳ء) سے پوچھا کہ:

> "مولوی صاحب یہ طوائف یعنی کسبی عورتیں مرتی ہیں تو ان کے جنازے کی نماز پڑھنی درست ہے یا نہیں؟ آپ نے فرمایا جو مرد ان کے آشنا ہیں ان کی نماز جنازہ پڑھتے ہو یا نہیں؟ اس نے عرض کیا ہاں پڑھتے ہیں، حضرت نے کہا تو پھر ان کی بھی پڑھ لیا کرو۔"(۲۱)

ڑ۔ نسیم انجم کے ناول نرک میں اخلاقی جرائم:

نسیم انجم کا ناول "نرک" جس کے معنی دوزخ کے ہیں، جو کہ مخنث حضرات کے بارے میں ہے۔ یہ ہمارے معاشرے کا اہم حصّہ ہیں۔ بظاہر یہ لوگ ہمارے ساتھ رہتے ہوئے بھی ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔ معاشرہ ان کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ جائیداد میں خاندان کے لوگ ان کو حصّہ نہیں دیتے۔ کم تعلیم یافتہ ہونے پر سرکاری ملازمتیں کم ملتی ہیں۔ ان کی الگ دنیا ہے۔ پانچ سال کے بچے سے لے کر ۸۰ سال تک کے مرد عورتیں ان کو مذاق کرتے ہیں۔ اس ناول میں مخنث حضرات کی زندگی کے متعلق اہم انکشافات ہیں۔ میرا موضوع صرف ان کے اخلاقی جرائم ہیں۔ اس ناول کا مرکزی کردار گلو گلنار جو کہ ایک مشہور ڈاکٹر کا بیٹا ہے اس

کو اغوا کر کے آختہ کر کے ہمیشہ کے لیے مردانہ قوت سے محروم کر دیا جاتا۔ پھر برائی کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ مرد کی مرد کے ساتھ شادی پھر منشیات کی سپلائی کا دھندہ جسم فروشی جیسے جرائم کی کہانی کو اچھے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ اس ناول میں جرم یہ نہیں ہے کہ ایک لڑکے کو اغوا اور زبردستی نروان کر دیا جاتا ہے بلکہ مجرم معاشرہ ہے جو ان لوگوں پر توجہ نہیں دیتا۔

ز۔ ببلو کا اغوا:

ناول میں اہم کہانی ببلو کے اغوا کی ہے۔ ببلو ڈاکٹر فراز اور علینہ کا بیٹا ہے۔ یہ بچہ بہت لاڈلا اور ڈاکٹر فراز کی شادی کے پانچ سال بعد بڑی دعاؤں سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوئی، اس لیے ببلو بہت زیادہ لاڈلا ببلو تھا۔ ببلو خوبصورتی کے ساتھ بہت زیادہ حسین بھی تھا۔ سکول میں اوّل آتا۔ سکول واپسی پر اکثر دوست اپنی گاڑی میں بٹھا کر گھر چھوڑ جاتے لیکن قسمت کا لکھا کون ٹال سکتا ہے۔ ماں باپ ببلو کو ڈاکٹر بنایا جاہتے تھے لیکن وہ افسر بننا چاہتا تھا۔ ایک دن وہ پیدل کہیں جا رہا تھا کہ دو عجیب وغریب شکلوں والے بندے ملے۔ پہلے ببلو نے خوف محسوس کیا پھر اکڑ کر چلنا شروع کر دیا۔ انہوں نے ببلو کے منہ پر رومال رکھا اور ٹیکسی میں ڈال دیا۔ اس منظر کو جو جرائم پیشہ افراد کرتے ہیں، ناول نگار نسیم انجم نے بڑی اچھی منظر کشی کی ہے:

> ”وہ دونوں آمنے سامنے آ گئے تھے۔ وہ پریشان ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگا راستہ سنسان اور راہ گیر بھی نظر نہیں آ رہے تھے۔ گاڑیاں دور سے گزر رہی تھیں۔ ان لوگوں نے اس کا راستہ روک لیا۔ کہاں جا رہے ہو میرے چاند۔ کیا اسکول سے بھاگے ہو؟ میں۔۔۔۔۔۔میں ۔۔۔۔۔۔اپنے گھر جا رہا ہوں۔ میرا راستہ چھو۔۔۔۔۔۔چھو۔۔۔۔۔۔۔ڑو“ وہ خوف کی وجہ سے ہکلانے لگا۔ اچانک ہی ایک ٹیکسی اس کے پاس آ کر رُک گئی، اتنی دیر میں ایک نے رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ جب ہوش آیا تو وہ ایک سیلن زدہ بدبودار کوٹھڑی میں بند تھا۔ اس کے کانوں میں گھنگھروں کی آواز کے ساتھ بہت سی بھر کم آوازیں آ رہی تھیں“۔ (۲۲)

ببلو کی جب آنکھ کھلی تو وہ گھبرایا ہوا تھا اور تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کیونکہ وہ ایک اندھیری کوٹھڑی میں قید تھا اور اس کے ہاتھ پاؤں زنجیروں سے بندھے ہوئے تھے۔ پہلے تو ببلو ان سے خوف کھا رہا تھا اور مسلسل روئے جا رہا تھا لیکن بعد میں جب اس نے دیکھا کہ میک اپ سے لدی لڑکیاں اس کے گرد جمع ہو گئی ہیں اور کوئی اسے پانی پلا رہا ہے تو کوئی کھانے کے لئے کہہ رہا ہے، کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ نیا نیا ہے ڈرا ہوا ہے آہستہ آہستہ ٹھیک ہو جائے گا، کوئی گود میں بٹھا کر یہ کہہ رہی ہے کہ میرے ساتھ دوستی کرو گے تو کوئی ٹی وی، وی سی آر دیکھنے کے لیے کہہ رہی ہے۔ ببلو ان کو یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے چھوڑ دو۔ میرے پاپا آپ کو بڑا انعام دیں گے۔ وہ بہت بڑے ڈاکٹر

ہیں۔ میں اتنی گندی جگہ پر نہیں رہ سکتا۔ لیکن وہ ببلو کو دھمکیاں دے کر اور مار کر چپ کرا دیتے ہیں۔ تو کوئی اس کی طرف دیکھ کر گانا گانے پاس بیٹھ جاتی ہے:

سیاں اناڑی سے نینا لڑا بیٹھی
ارے کیا کر بیٹھی کسے دل دے بیٹھی(۲۳)

کوئی یہ کہہ رہی ہے ابھی نیا نیا ہے آہستہ آہستہ ماحول سے دوستی کرے گا۔ ببلو نے گلنار بن جانے کے بعد رات کو اُٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن کوئی نہ کوئی جاگ جاتا تھا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا گلنار ماحول کا عادی ہوتا چلا گیا، تالیاں بجانا، گانا گانا، ناچنا، پان کی گلوریاں کھانا، آنکھ مارنا اور مٹکانا سب کچھ سیکھ گیا۔ جب گلنار جوان ہوئی تو خوبصورت دوشیزہ سے کم نہ تھی۔ جسے دیکھتے ہی بڑوں بڑوں کے دل بہک جاتے۔ گلنار اب اس ماحول کی عادی ہوگئی اور گھر جانے کا خیال دل سے نکال دیا۔ نسیم انجم نے اس ناول میں یہ بات واضح ہے کہ کس طرح ایک اچھا کھاتے پیتے گھرانے کا بچہ جنسی جرائم کی دنیا میں پہنچ جاتا ہے۔ ''گلنار زندہ ہوگئی اور ببلو مر گیا'' ہے اب وہ سارے کام خود کرنا شروع ہو گیا۔ مثلاً تالی پیٹنا، آنکھ مارنا، ٹھمکا لگانا، گانے گانا، عصمت فروشی جیسے سارے کام اب دوزخ میں پہنچ گیا تھا اور سب کاموں کا وہ سربراہ بن گیا۔ کسی شخص کی زندگی کو اغوا کر کے بدلنا بہت بڑا جرم ہے جس کو نسیم انجم نے ناول کا موضوع بنایا ہے اور یہ ہمارے سماج کا حصّہ ہے۔

س۔ہیروئن فروشی:

ہیجڑوں کی اس قیام گاہ کے قریب جو لوگ رہتے تھے ان میں اکثر جرائم پیشہ بھی ہیں جو روز ان کو استعمال کرتے ہیں کیوں کہ یہ لوگ آگے سے مزاحمت نہیں کرتے اس لیے جلدی دوسروں کی دھمکیوں میں آجاتے ہیں۔ ناول میں ایک کردار ثاقب اور نوراسائیکل والا کا ہے جو بظاہر دیکھنے میں تو سائیکل وغیرہ کو پنکچر اور ٹھیک کرتے ہیں لیکن غیر اخلاقی جرائم میں بھی ملوث ہیں۔ وہ منشیات اور ہیروئن فروشی جیسے جرائم کے لیے ہیجڑوں کو استعمال کرتے ہیں تاکہ کسی پر شک نہ ہو اور دھندہ بھی چلتا رہے۔ ہمارے سماج میں ایک چیز عام ہے جگہ جگہ ہمیں ہیروینچی پلوں کے نیچے اور فٹ پاتھوں میں بے ہوش نظر آتے ہیں۔ پولیس بھی ہیروئن فروشوں سے ملی ہوتی ہے ورنہ یہ کام اتنی آسانی سے ہو ہی نہیں سکتا. ناول نگار نے سماج کی نبض پر ہاتھ رکھ کر صحیح لکھا ہے :

"ساتھ میں ثاقب اور سائیکل والا نورا بھی اس کی جان کے دشمن ہو جائیں گے چونکہ وہ ان کے کئی رازوں کو جانتی ہے بلکہ خود بھی ان کے جرم میں ملوث ہے۔ اب کسی کو کیا معلوم کہ نکڑ پر سائیکل والا نورا اور ثاقب کی جو دکان ہے وہ محض دکھاوا ہے وہ بظاہر تو سائیکل کی ٹیوب کے پینکچر جوڑتا اور ٹائر بدلتا ہے ورنہ اصل میں تو سب کی ہیروئن فروش ہیں اور گاہکوں تک پہنچانے کے لیے انہوں نے مجھے اور ریشم کو چنا ہے"۔ [۲۴]

یہ وہ تصویر ہے جو ناول نگار نے کھینچی ہے۔ اس سچی تصویر کے پیچھے ہمارے سماج کے اندر پائے جانے والے اخلاقی جرائم کی کلی کھلتی ہے۔ سب سے بڑھ کر اس میں کالج کے لڑکے لڑکیاں ہماری نوجوان نسل کو نشے پر لگانا اور تباہ کرنا ہے۔ ایک عام سروے کے مطابق نوجوان نسل میں نشے کا بڑھتا ہوا رجحان پچھلے دس سالوں کی نسبت ایک سو دس فیصد زیادہ ہو گیا ہے۔ حالانکہ گرو تو ان کو ایسے حرام کمانے سے منع کرتے ہیں۔ ٹرانس جینڈر کمیونٹی میں یہ اخلاقی برائی عام ہے اور ان پر شک بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ش۔ گلنار کو آختہ کرنے کا اخلاقی جرم:

ہیجڑے ایک دن سارے اپنے اپنے دھندے میں چلے جاتے ہیں۔ امی حضور (گرو جی) نے گلنار کو یہ کہہ کر روک لیا کہ میں نے تجھ سے کچھ راز کی باتیں کرنی ہیں۔ آج دل کر رہا ہے کہ تجھ سے ڈھیر ساری باتیں کروں۔ تجھے قیمے والے پراٹھے اپنے ہاتھ سے پکا کر کھلاؤں ہائے نی میری لاڈو تجھے کتنے ارمانوں سے میں نے بیٹی بنا کر پالا ہے۔ مجھے تو شروع دن سے ہی تجھ سے بڑا پیار ہے۔ تو بھولی بھالی میری آنکھوں کا نور، میرے دل کی ٹھنڈک، میرا تم پر سب سے زیادہ حق ہے۔ آگے سے گلنارِ یہ کہتی ہے کہ امی حضور آپ حکم کریں آپ ہی میری ماں اور میرا باپ ہیں۔ رب کے علاوہ تیرا ہی آسرا ہے۔ میں اپنی امی حضور کے واری جاؤں۔ اب امی حضور جو کہ اس کے ساتھ بہت بڑا اخلاقی جُرم کرنے جا رہی ہے یعنی اب امی حضور نے اسے مردانہ خصوصیات سے محروم کرنے کا ارادہ کر لیا ہے اور چکنی چپڑی باتوں سے اسے گھیر رہی ہے۔ ناول کا یہ مرکزی خیال بھی ہے کہ اخلاقی جرم کی دوزخ (نرک) امی حضور کہتی ہے۔ گلو میرے پاس آ جا میں تجھ پر صدقے واری جاؤں میرے لیے ذرا کڑک دودھ پتی بنا کر لا اور یہ بھی دیکھ میں نے تیرے لئے رس والی مٹھائی اور بڑی بیکری کے دیسی گھی والے بسکٹ رکھے ہیں۔ وہ بھی ساتھ لے آنا۔ چائے بسکٹ کھانے کے بعد امی حضور نے گلنار سے کہا کہ تو الھڑ نار ہے زمانے کی نگاہیں خراب ہیں تو اس طرح کر کہ نروان بن جا۔ ساتھ ہی گلنار نے پوچھا امی حضور یہ نروان کیا ہوتا ہے۔ دیکھ میری بنو چھوٹا سا آپریشن ہے پھر تم ہمیشہ کا آرام پاؤ سکھ کے لیے تھوڑی سی تکلیف تو برداشت کرنا پڑتی

ہے۔ گلنار دیکھ میں تیری طرح ہونہار لڑکا تھا ایک دن میں اغوا ہو گئی اچھا ہوا جو میں پیدائشی طور پر ہیجڑا تھا لیکن آپ ٹھیک مرد ہیں آپ کو ہیجڑا بننا پڑے گا۔ گلنار ضد کرنا شروع کر دیتی ہے لیکن امی حضور نے کہا تجھے تو ہار اور سونے کا تاج پہنایا جائے گا۔ تحفے تحائف ملیں گے۔ ہر روز نیا مرد تیرا انتظار کرے گا۔ منہ مانگی رقم وصول کرو گی جبکہ نقلی ہیجڑے کی کوئی عزت نہیں ہوتی۔ ناول کا یہ بڑا اہم موڑ ہے لیکن دلچسپ بھی ہے کیونکہ یہ ہمارے معاشرے میں ہوتا ہے۔ ایک تو اغوا جیسا جُرم دوسرا اس کو مردانہ صفات سے محروم کرنا اس سے بڑا جرم ہے۔ امی حضور کس طرح مزید گلنار کو اُکساتی ہے :

> "دیکھ ری گلو ایک چھوٹا سا آپریشن ہوتا ہے تو کہے میں کر دوں گی لیکن مجھے کسی حکیم کی مدد چاہئیے ہو گی نہیں تو ہماری اپنی برادری کا جراح ہے اور آج کل یہ ڈاکٹر بھی بڑی آسانی سے کر دیتے ہیں۔ پر فیس تگڑی لیتے ہیں اور چند اتگڑی رقم دے کر تو سارے کام ہی کرائے جاسکتے ہیں۔ دولت میں بڑی طاقت ہے ری"۔ (۲۵)

ایسی باتیں سن کر گلنار دو ہفتے تک تو اپنے حواس کھو بیٹھتی ہے۔ کبھی اس کے ذہن میں بچپن، جوانی پھر اغوا والا سارا منظر سامنے آجاتا ہے۔ بار بار خواب آور گولیاں کھا کر سو جاتی ہے۔ باقی نور جہاں، ریشم، ریما اس کا دل بہلانے کی کوشش کرتی ہیں لیکن وہ اپنے حواس ہی کھوتی جارہی ہے۔ ہر وقت اس کے ذہن میں ایک ہی بات گھوم رہی ہے۔ آپریشن آپریشن ہائے اللہ کتنا بڑا جُرم اور گناہ کرنے جارہی ہوں۔ یا اللہ میری قسمت کیسی ہے وغیرہ وغیرہ۔ دو چار دن کے بعد نشہ ٹوٹا تو امی حضور سے آپریشن کی ہاں کر دی۔ نروان بننے کا یہ مرحلہ بڑا مشکل تھا لیکن امی حضور کی خواہش تھی آپریشن کروالیا۔ ہمیشہ کے لیے ایک مرد ہیجڑا بن گیا۔ چند دن افسوس کرنے کے بعد گلنار اپنے معمول پر واپس آگئی۔ پھر وہی ہمیشہ کا نرک اور گلنار نے اپنی سہیلیوں کے ساتھ ناچ گانا شروع کر دیا۔

ص۔ دانش کی گلنار سے شادی والا جرم:

اس ناول میں نسیم انجم نے کردار میں توازن رکھا ہے۔ اگلا کردار دانش کا ہے جو ایک معمولی سا صحافی اور کیمرہ مین ہے۔ تانیہ نامی لڑکی سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے لیکن اس دوران اس کا باپ اس کی شادی اپنی کسی رشتہ دار سے کرنا چاہ رہا ہے۔ لڑکا انکار کرتا ہے اور گلنار سے اس کی پرانی دعا سلام ہے۔ اس کا مہمان بن جاتا ہے۔ باپ اس کو عاق کر دیتا ہے۔ گلنار کے پاس جا کر اس نے گھنگھرو پہن کر ڈانس کرنا شروع کر دیا۔ گلنار کے پوچھنے پر اس نے بتایا کہ میں گھر کا رہا ہوں نہ گھاٹ کا۔ میرے ابا نے مجھے عاق کر دیا ہے لو یہ اخبار پڑھو کیا لکھا

ہے۔ یااللہ میں نے ایسا تو نہیں سوچا تھا۔ سب نصیبوں کے کھیل ہیں۔ وہ سسکیاں لے کر رو رہا تھا۔ نیلو فر اور زیبا اپنے اپنے کمرے میں چلی گئیں اور گلنار اس کا دل بہلانے لگی۔ اِدھر دانش کی اماں نے بھی رو رو کر اپنا بُرا حال کر لیا تھا۔ اب دانش ہر طرف سے مایوس ہے اور گلنار اس کی خدمت کر رہی ہے۔ ہاتھ پاؤں دھلوا رہی ہے کھانا بنا کر دے رہی ہے۔ کپڑے استری کر کے اس کی خدمت کر رہی ہے۔ اب گلنار دانش سے کہتی ہے کہ ہماری شادی ہونے والی ہے تھوڑی دیر امی حضور تجھ سے کچھ وعدے لینے آئیں گی تو اس کی باتوں کا صحیح صحیح جواب دینا۔ اتنی دیر میں امی حضور نے آ کر کہا اُٹھ رے چھوکرے تجھ سے دو تین باتیں کرنی ہیں۔ دیکھ رے لاڑے جوان لڑکی کا رشتہ دے رہی ہوں لاڑی کو خوش رکھے گا نا۔ دانش کو انھوں نے بھنگ کا نشہ دیا ہوا ہے۔ امی حضور نے کہا ہے اس کو تھوڑا بہت نشہ دیئے رکھ ورنہ کھیل بگڑ جائے گا۔ پھر آنے والے دنوں میں ان کی شادی ہو جاتی ہے۔ اس کا حال ناول نگار نے کس طرح بیان کیا ہے:

> "پھر آنے والے دنوں میں گلنار اور دانش کی شادی ہو گئی۔ گلنار نے سرخ شرارہ پہنا، بیوٹی پارلر سے میک اپ کروایا، مہمان اکٹھے ہوئے، زردے پلاؤ کی دیگیں پکیں۔ شربت بٹا چھوارے تقسیم ہوئے۔ دانش کو بھی بادامی رنگ کی شلوار قمیض اور اس پر سرخ ستاروں کی ٹوپی پہنائی گئی اور سر پر گلابی ململ کے دوپٹے کی پگڑی باندھی گئی۔ گلنار اور دانش کو ایک سجے سجائے کمرے میں منتقل کر دیا گیا۔ اس طرح شادی کی رسم پوری ہو گئی"۔[۲۶]

نسیم انجم نے ہمارے معاشرے کی تیسری نسل پر اس قدر قریب ہو کر لکھا ہے کہ عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے، ہمارے معاشرے میں مرد کا مرد سے نکاح جائز نہیں گناہ کبیرہ ہے لیکن اکثر ہیجڑوں کے ساتھ ایسے واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں۔ کچھ دن قبل شادمان لاہور میں پولیس میں ایک ایسے ہی کیس کا اندراج ہوا۔ لڑکے کے ساتھ لڑکے کی شادی کا انجام وہی ہے جو ایک زناکار کا ہے یعنی کوڑے یا سنگسار لیکن یہ ایک ناول ہے اس میں انوکھا پن تب ہی آئے گا جب اس میں کوئی نئ چیز شامل ہو گی لیکن یہ اخلاقی جرم ہمارے معاشرے کا حصّہ ہے اور جو ہیجڑوں نے دانش کو نشہ دیا اس کی عاق والی مجبوری سے فائدہ اٹھایا اور مرد کی مرد سے شادی کرا دی۔ مرد کی مرد سے بد فعلی لواطت کے معنی میں آتی ہے۔ ہیجڑوں سے انٹرویو کرنے کے بعد یہ بات معلوم ہوئی کہ لواطت سے کوئی ہیجڑا بھی محفوظ نہیں۔ پاکستان میں ہیجڑوں کی اکثریت HIV ایڈز اور شوگر جیسی بیماریوں میں مبتلا ہے تو ان کو راہ راست پر لانے کے لیے حکومت کو ان کے لیے سہولیات پیدا کرنی چاہئیے۔ الٹا گھر والے ان کو گھر سے نکال دیتے ہیں۔ رشتہ دار ان کو منہ نہیں لگاتے پھر یہ لوگ سوائے اپنے امی

حضور یا گرو کے رحم و کرم پر ہوتے ہیں۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کے لیے علیحدہ اسکول ہونے چاہئیے تا کہ یہ معاشرے کی ٹھوکروں اور برائیوں سے بچ سکیں۔ یہ لوگ کھلے عام یہ کہتے ہیں کہ اس میں ہمارا کیا قصور ہے ہمیں تو اللہ تعالی نے پیدا ہی اس طرح کیا ہے۔ بات نسیم انجم کی اس حس کی ہو رہی ہے جو بطور انہوں نے ناول نگار اس میں دلچسپی لی ہے کہ یہ لوگ جس قسم کے اخلاقی جرائم میں ملوث ہیں، ارباب اختیار کو ان کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ تا کہ ایک انسان اور پاکستانی مسلمان یہ بھی ریاست کا حصّہ بنیں اور قومی ترقی میں اپنا حصّہ ڈالیں۔ ناول میں گڈے کی شکل میں ان کے گھر بیٹا بھی پیدا ہوتا ہے۔ گلنار اسی طرح درد سے چیختی ہے۔ ڈاکٹر زبیدہ آ کر دس ہزار روپے میں آپریشن کرتی ہے۔ یہ سب ڈھونگ ہیجڑے لوگ اپنا دل بہلانے کے لیے کرتے ہیں۔ پھر ایک دن دانش بغیر اطلاع دیے بھاگ جاتا ہے اور گلنار پریشان ہو جاتی ہے۔ مرد کی بے وفائی کے طعنے دیتی ہے۔ بعد میں گلنار اپنی ساتھیوں سے کہتی ہے کہ زندگی ہم لوگوں کی نہیں ہے۔ زندگی صرف مرد اور عورت کی ہے۔ جہاں تو ان لوگوں کے لیے بنا ہے ہم صرف استعمال ہوتے ہیں۔ شادی، خوشی، جسم فروشی، گداگری، منشیات فروشی جیسے جرائم کے لیے۔ نسیم انجم نے ان کے لیے بہت اچھا لکھا ہے۔ یہ لوگ واقعی مسائل کا شکار ہیں اور ان لوگوں کی اگر تربیت کر دی جائے تو یہ لوگ بھی معاشرے کے مفید رکن بن سکتے ہیں۔ آخر میں گلنار ہر سہیلی کو کوئی ڈھنگ کا ہنر اور کاروبار کرنے کی تلقین کرتی ہے۔ اس ناول کا اختتام بھی ایک اچھے طریقے سے کیا گیا ہے۔ آخر میں ہم نے یہ دیکھنا ہے کہ ان لوگوں کے مسائل کیا ہیں؟ کیوں یہ لوگ جرائم کی دنیا میں اخلاقی جرائم کا مرتکب ہوتے ہیں۔ کیوں مرد حضرات اپنی نفسانی خواہش کی خاطر ان کا استعمال کرتے ہیں۔ کیوں خونی رشتے دار ان سے ہر قسم کا ناتا توڑ دیتے ہیں۔ ساری زندگی ان کو نہیں ملتے۔ موت کے بعد بھی گھر والے ان کو نہیں دیکھتے۔ نسیم انجم نے اس ناول "نرک" میں ایک واقعہ بیان کیا ہے کہ گلنار کے والد جب فوت ہو گئے تو کوئی اس کو والد کا منہ تک نہیں دیکھنے دیتا تھا۔ سب یہی کہتے تھے بھاگ ادھر سے کہاں آ گیا ہے تو حالانکہ وہ اپنے والد کے جنازے پر تھا۔ پھر اسی طرح دھتکار کر بھگا دیا جاتا ہے۔ یہ کتنا بڑا دردناک منظر اور جرم ہے ان لوگوں کے ساتھ جو ہمارا معاشرہ کرتا ہے۔ اگر کوئی خواجہ سرا مر جائے جیسے امی حضور گو جی مر جاتی ہے تو ساری رسومات صرف یہ خواجہ سرا برادری ہی ادا کرتی ہے۔ باقی کوئی ان کے دکھ میں شریک بھی نہیں ہوتا۔ عموماً یہ پیدا ہونے سے لے کر موت تک محرومیوں کا دکھ جھیلتے ہیں پھر معاشی اور سماجی حقوق کی محرومی، پھر ایک شادی شدہ زندگی کی محرومی، اخلاقی جرائم کا سبب بنتی ہیں۔

ض۔ پاکستان میں کتنے خواجہ سرا ہیں؟

پاکستان میں کل کتنے خواجہ سرا ہیں، مکمل اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ میں نے اس بات کا سراغ لگانے کے لیے ادارہ شماریات (پی بی ایس) جو کہ ماؤ ایریا جی ٹن میں واقع ہے، وہاں جا کر یہ معلوم ہوا کہ اگر کسی کے گھر خواجہ سرا پیدا ہوتا ہے تو پہلے تو وہ اس کا اندراج ہی نہیں کراتا۔ لیکن ۲۰۰۹ء میں سپریم کورٹ کے حکم کے مطابق پاکستان کی چھٹی مردم شماری میں معذور اور خواجہ سرا افراد کے لیے علیحدہ فارم شامل کیے گئے تھے۔ ملک میں موجود خواجہ سرا افراد کی تعداد دس ہزار چار سو اٹھارہ تھی جن میں سب سے زیادہ پنجاب یعنی ۶۴ فیصد پنجاب میں رہتے ہیں۔ یہ تعداد مصدقہ نہیں ہے کیوں کہ وہ لوگ جن کو روزی کمانے کے لئے کوئی کام نہیں ملتا، ان کی تعداد جو اس کمیونٹی میں شامل وہ خواجہ سرا نہیں بلکہ مکمل مرد ہیں۔ ان کی تعداد تیس ہزار سے زیادہ ہے۔ ہمارے ہر ایک شہر، گاؤں، محلے، گلی کوچوں، ٹریفک سگنل پر گھومنے پھرنے والے اور شادی بیاہ پر ناچنے گانے والے خواجہ سراؤں کی تعداد کم نہیں۔ میرے اپنے اندازے کے مطابق ان کی تعداد لاکھوں میں ہو سکتی ہے ہزاروں میں نہیں۔

ط۔ خواجہ سراؤں کے مسائل کیا ہیں؟

خواجہ سرا معاشرے کے دھتکارے ہوئے افراد ہوتے ہیں اور ہمارا معاشرہ ان کو انسان بھی نہیں سمجھتا۔ اس لیے ان کے مسائل کی فہرست بہت طویل ہے۔ کئی مسائل معاشرے کے جنم دیے ہوئے ہیں اور کئی مسائل ریاست کی غفلت اور خواجہ سراؤں کے پیدا کردہ ہیں۔ ان کے مسائل درج ذیل ہیں:

۱۔ ماں باپ اور معاشرہ انہیں قبول نہیں کرتا۔

۲۔ تعلیم کے مسائل ہیں ریاست ان کی تعلیم کی ذمہ داری نہیں لیتی۔

۳۔ بچپن سے ہی انہیں جنسی ہراسگی اور جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

۴۔ صحت کے مسائل ہیں۔ پورے پاکستان میں صرف کراچی میں ایک ٹرانس جینڈر سپیشلسٹ ڈاکٹر ہیں، اس کا نام ڈاکٹر ثناء یاسر ہے۔ حال ہی میں سارہ گل ہیجڑے نے ایم بی بی ایس کا امتحان کراچی سے پاس کیا ہے۔

۵۔ بنیادی انسانی حقوق تک ان کی رسائی مشکل ہے۔ سرکاری ملازمتوں میں کوٹا بھی مختص نہیں جیسے معذور افراد کا ہوتا ہے۔

۶۔ ۱۹۷۳ء کے آئین کے تحت خواجہ سراؤں کو ان کا قانونی حق شناختی کارڈ نہیں ملا تھا۔ ۲۰۰۹ء میں سپریم کورٹ آف پاکستان نے ان کو یہ حق دلوایا۔ اب تک سولہ سو (۱۶۰۰) خواجہ سراؤں کے شناختی کارڈ بن چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ووٹ کا حق اور سرکاری ملازمتوں میں ان کے کوٹے جیسے حقوق اس میں شامل ہیں۔

۷۔ عصمت فروشی اور بیکاری جیسے مسائل ہیں۔

۸۔ اگر کوئی خواجہ سرا مر جائے تو اس کی تدفین کے مسائل ہیں۔ کوئی مولوی ان کا جنازہ نہیں پڑھاتا۔

۹۔ خواجہ سراؤں کو ابھی تک اپنے حقوق کا علم نہیں جس میں خواجہ سرا اور حکومت دونوں برابر کے ذمہ دار ہیں۔

۱۰۔ اگر کوئی خواجہ سرا قتل ہو جائے جیسا کہ ۲۰۲۱ء میں اب تک ۷۷ خواجہ سرا قتل ہو چکے ہیں۔ ان میں سے ۴۶ کے پی کے (KPK) میں ہوئے ہیں۔ کسی انسانی حقوق کی تنظیم نے ان کی کوئی قانونی مدد نہیں کی۔ خواجہ سرا خود ہی اس کا بندوبست کرتے ہیں۔

۱۱۔ قانون کے آرٹیکل ۳۷۷ سے خواجہ سراؤں کو باہر نکالا جائے جس میں شامل سب لوگ جرائم پیشہ ہیں۔

ظ۔ کیا نظر آنے والے سب خواجہ سرا واقعی حقیقی ہیں؟

یہ سوال بھی اپنی جگہ اپنی اہمیت رکھتا ہے کہ روز بازار یا چوراہوں میں ہمارے ارد گرد نظر آنے والے تمام خواجہ سرا حقیقی خواجہ سرا ہیں اور جسمانی طور پر محروم ہیں؟ تو اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ بہت سے بہروپیے بناوٹی اشیاء کا استعمال کر کے خواجہ سراؤں کا روپ دھار لیتے ہیں۔ نسیم انجم کے ناول ”نرک“ کا ہیرو ببلو بھی مرد سے آختہ کر کے خواجہ سرا بنایا گیا تھا۔ خواجہ سرا کا روپ دھارے دھندہ کرنے والے اکثر نوجوان مرد ہوتے ہیں۔ خواجہ سراؤں کو ان سے تحفظات ہوتے ہیں۔ خواجہ سراؤں کا زیادہ بہروپ دھار کر یہ جرائم کرتے ہیں۔ خواجہ سرا کمیونٹی کا یہ استحصال بھی کرتے ہیں۔ یہ بہروپیے بغیر کسی محنت کے پیسہ اکٹھا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ یہ گر جان چکے ہیں کہ سڑکوں اور چوراہوں پر بھیک مانگنے سے اچھے خاصے پیسے کمائے جاسکتے ہیں اور لوگوں کے پیچھے پڑ جانے سے کوئی اپنی جان چھڑوانے، تو کوئی صدقہ نکالنے کی خاطر انہیں کوئی نہ کوئی نوٹ لازمی دے جائے گا۔ لہٰذا یہ کہا جاسکتا ہے کہ خواجہ سرا بن کر مانگنا آج کل گداگری کا نیا فیشن بن چکا ہے۔ خواجہ سرا برادری ان قبضہ گروپ سے خوف زدہ ہے۔

ع۔خواجہ سراؤں کے ذریعے جرائم:

اچھے بُرے لوگ ہر طبقہ میں پائے جاتے ہیں تو یقیناً خواجہ سرا کمیونٹی میں بھی ہر طرح کی فطرت کے لوگوں سے بھری ہو گی جو اپنے مختلف عزائم رکھتے ہیں۔ آج متعدد خواجہ سرا غربت سے تنگ آکر اور بعض کسی خطرناک نیٹ ورک کا حصّہ بن کر جرائم کی دلدل میں دھنس چکے ہیں۔ نسیم انجم کے ناول کا مجرم بھی گو.جی ہے جو کمسن لڑکوں کو اغوا کر کے آختہ کرتا پھر دھندہ کرواتا تھا۔ ناول میں ببلو کو منشیات فروشی کرتے دکھایا گیا ہے۔ وہ معاشرے کے دھتکارے ہوئے یہ خواجہ سرا مظلومیت کا لبادہ اوڑھ کر لوٹ مار کرتے پھرتے ہیں۔ ڈکیتی، چوری، جسم فروشی، منشیات فروشی جیسے جرائم میں ملوث پائے جاتے ہیں۔ ان کی کارستانیوں کا شکار زیادہ تر پردیسی اور سادہ لوح افراد ہوتے ہیں۔ رات کے اندھیرے میں خوبصورت لڑکی بن کر اکثر ویران جگہوں یا بڑی سڑکوں پر کھڑے ہو کر دعوت گناہ دیتے ہیں اور اسی کی آڑ میں لوگوں کو نقدی سے محروم کر دیتے ہیں۔ اس میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ ان جرائم پیشہ خواجہ سراؤں کے ہاتھوں لٹنے والے مارے شرم کے مقدمہ درج ہی نہیں کرواتے اور یوں یہ جرائم پیشہ لوگ قانون کی گرفت سے بچ نکلتے ہیں۔ ایسے دھندے بڑے شہروں بالخصوص کراچی، لاہور، پشاور، فیصل آباد، راولپنڈی اور اسلام آباد میں سرِعام جاری ہیں۔

غ۔حالات میں بہتری کیسے آئے گی؟

خواجہ سراؤں کے مسائل کو حل کرنے کے لیے ریاست کو ٹھوس اقدامات کرنے ہوں گے۔ اب ریاست نے خواجہ سراؤں کو تسلیم کر لیا ہے لیکن معاشرے نے ابھی تک تسلیم نہیں کیا۔ آج کل سوشل میڈیا کا دور ہے اور آئے روز ایسی ویڈیوز اور پوسٹیں نظروں سے گزرتی ہیں جن میں خواجہ سراؤں پر بدترین تشدد، زیادتی ہوتی نظر آتی ہے۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ قبل وہ ویڈیو بھی وائرل ہوئی جن میں کچھ مرد خواجہ سراؤں کو برہنہ کر کے تشدد کر رہے تھے۔ اس ویڈیو میں مردوں کے چہرے واضح ہونے کے بعد کسی تادیبی کاروائی تک کی خبر سامنے نہیں آئی۔ چنانچہ ایسے واقعات پر ریاستی اداروں بالخصوص قانون نافذ کرنے والے اداروں کو فوری ایکشن لینا چاہیے۔ ایسے واقعے میں کسی ایک بار مجرم کو عبرتناک سزا مل جائے تو یقیناً ان واقعات میں کمی آجائے گی۔ اس طرح خواجہ سراؤں میں وہ لوگ جو معاشرے میں باعزت مقام اور روزگار چاہتے ہیں حکومت کو ہر صورت ان کی مدد کرنی چاہیے تاکہ انہیں تعلیم اور نوکری کی جانب راغب کرنا چاہیے۔ ناول "نرک" کا لب لباب بھی یہی ہے کہ وہ خواجہ سرا جو جرائم پیشہ ہیں یعنی جسم فروشی، گداگری اور منشیات فروشی کے دھندے

میں ملوث ہیں، ان کو سزا ملے۔ میری ایک تحقیق کار کے طور پر ملک کے ممتاز خواجہ سراؤں سے ملاقات ہوئی ہے۔ اس میں عائشہ مغل، جنت علی، نایاب علی، فیض اللہ فیضی، ایڈووکیٹ نشاراؤ شامل ہیں۔ یہ پڑھے لکھے خواجہ سرا ہیں۔

فیضی نے اردو ادب میں ایم فل کیا ہے اور ممتاز ماہر لسانیات ڈاکٹر رؤف پاریکھ ان کے نگراں مقالہ تھے۔ علیشہ شیرازی نے ملتان میں ان کا اسکول کھولا ہے۔ آہستہ آہستہ پاکستان کے تمام بڑے شہروں میں اسکول کھل جائیں گے۔ وزارت انسانی حقوق میں گریڈ ۱۸ کی ڈپٹی ڈائریکٹر کی پوسٹ صرف خواجہ سراؤں کے لیے ہے۔ عائشہ مغل نے کامسٹ یونیورسٹی سے ایم فل کیا ہوا ہے اور پورے ملک میں صرف ایک خواجہ سرا ایکسپرٹ ڈاکٹر ہے۔ ثنایاسر جو کراچی میں پریکٹس کرتی ہیں۔ سرکاری ملازمتوں میں ان کی عمر کی حد تک ۳۵ سال کی بجائے ۴۵ سال کی جائے تاکہ زیادہ لوگوں کو روزگار مل سکے۔ شہروں میں ایسے سینٹرز قائم کیے جائیں جو ان کی کونسلنگ کریں تاکہ ان سے جرائم پیشہ کم سے کم بن سکیں۔

ق۔ محمد الیاس کے ناول حبس میں اخلاقی جرائم:

محمد الیاس ہمارے اس عہد حاضر کے نمائندہ ناول نگار ہیں۔ اگرچہ ان کے ناولوں کا بنیادی موضوع محبت ہے۔ لیکن انہوں نے محبت کے علاوہ مزاحمت اور معاشرتی جرائم پر بھی قلم اٹھایا ہے۔ میں اپنے اس مقالے میں ان کے چھٹے ناول "حبس" کو موضوع بنایا ہے۔ اس میں پیش کیے گئے اخلاقی جرائم کے اسباب و محرکات کا جائزہ لیا جائے گا۔ یہ ایک کثیر الموضوعاتی ناول ہے۔ اخلاقی جرائم اس ناول کا اہم موضوع ہیں۔ دلدار عالم اور وجی اس میں دو اہم کردار ہیں۔ جب یہ میٹرک کر کے کالج میں داخلہ لیتے ہیں تو رہائش کالج کے ہاسٹل میں رکھتے ہیں۔ وہاں ان کا واسطہ پیڈرو گروپ سے پڑتا ہے جو لڑکوں کو ناحق تنگ کرتے تھے۔ ان کو بھی تنگ کرنے لگے۔ ہمارے ہاں ایسا ہوتا بھی ہے کہ نئے آنے والوں کا استقبال ہمیشہ بُری حرکات کر کے کیا جاتا ہے۔ پیڈرو پارٹی کے اجمل عرف اجو نے تو ہم سے پانچ روپے لیٹرین فیس لے لی اور ساتھ دھمکیاں بھی دیں۔ ان کی ان حرکتوں پر وجی اس سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ دوسروں لڑکے وجی اور دلدار کو لیٹرین الاٹمنٹ کروانے کے طعنے دیتے تھے۔ پھر وجی نے جو اخلاقی جرم اِن کے ساتھ کیا، وہ ناول نگار محمد الیاس نے اس کی تصویر بڑے اچھے انداز میں پیش کی ہے۔

> "ایسا شور بلند ہوا کے آنکھ کھل گئی۔ ذرا حواس بحال ہونے پر کچھ اس طرح کی بلبلاہٹ سنائی دی گویا کسی جیتے جاگتے انسان کی کھال ادھیڑی جارہی ہے۔ لپک کر باہر آیا تو دیکھا کہ

غسل خانوں کی طرف اور لوگ بھی بھاگے جا رہے ہیں۔ باقی لوگوں کے ساتھ وجی بھی کھڑا نظر آیا۔ ولیم کو موجود پایا۔ اس اثنا میں چوکیدار اور وارڈن ملک عظیم بھی پہنچ گئے۔ استاد پیڈرو لیٹرین کے سامنے بلب کی روشنی میں لوٹنیاں لگاتے ہوئے دونوں رانیں بُری طرح پیٹ رہا تھا۔ اس کے منہ سے مغلظات بھی اُبل اُبل کر فضا میں بلند ہو رہی تھیں"۔ (۲۷)

یہ وہ حال تھا جو ناول نگار نے واقعے کا بیان کیا کہ دوسروں سے انتقام لینے کے لیے کیسے غیر اخلاقی طریقہ کار اپنایا گیا کہ لیٹرین میں حاجت پوری کرنے والے کو پیچھے سے آکر ٹانگوں میں گرم لک لگائی گئی یہ ایک ایسا واقعہ ہے جو اخلاقی جرائم کی مد میں آتا ہے اور قابل گرفت جرم ہے کہ ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے غیر اخلاقی جرم کیے جا رہے۔ ہمارے بڑے شہروں کے ہاسٹلز میں بھی منشیات، شراب اور دوسرے غیر اخلاقی جرائم ہوتے ہیں۔ یہ ان کی سچی تصویر ہے لیکن تحصیل سطح کے ہاسٹلوں میں زنا اور منشیات سے لے کر لواطت تک ہر قسم کے جرائم ہوتے ہیں۔ آئے روز ہم خبریں سنتے ہیں کہ قائداعظم یونیورسٹی اسلام آباد کے ہاسٹلز میں منشیات فروشوں کا راج ہے اور اس کے ساتھ ملحقہ جنگل ان منشیات فروشوں کی پناہ گاہیں ہیں۔ پولیس بار بار ایکشن بھی کرتی ہے لیکن پھر بھی نتائج صفر سے آگے نہیں بڑھ سکے۔ اگر کسی کا بیٹا یا بیٹی ہاسٹلز میں رہتا ہے تو اس کے لیے یقیناً فکر والی بات ہے۔ یہاں پر محمد الیاس نے اپنے خدشات کا اظہار ناول میں کیا ہے کہ کس غیر اخلاقی حرکت سے اپنے دشمن لڑکوں سے بدلہ لیا اور استعمال ہاسٹل کے قریب بھٹہ مزدوروں کو کیا۔ مخبری کی گئی کہ فلاں بندہ فلاں لیٹرین میں گیا ہے۔ اس پر وار کیا جائے۔ ناول کی تکنیک بے حد فنکارانہ اور دلچسپ بھی ہے۔ اصل واقعے کو بیان کرنے کا ایک وسیلہ ہے یا ایک ایسا اسٹیج جس پر روشنی اور پرچھائیوں کا ایک کھیل چل رہا ہے۔ یہ بیانیہ ویسے ہی ہے جیسے لاطینی امریکی ادیب اور ناول نگار مثلاً بورفیس گارشیا مارکیز، حوان الفو، کورتازار، یا اسٹور یاس اور انفانتے وغیرہ کے ہاں حقیقت کو ایک عام ادبی پیرائے میں بیان کیا گیا ہے جیسا کہ ہاسٹل میں بھٹہ مزدور عورتوں سے ساری ساری رات گزارنے والے لڑکوں کا حال زناکار اخلاقی جرائم کرنے والی عورت کے الفاظ اس طرح بیان کیے گئے ہیں۔

"وجی کو غنیمتے نے بتا دیا کہ گزشتہ سردیوں کی ایک رات اس نے شفو اور اجو کی مدد سے کس طرح دیوار پھاندی اور کمرے میں آئی۔ سحری کے وقت واپسی پر پیڈرو حرامی نے روپیٹ کو صرف چھے روپے دیے۔ دن کے وقت مجھ سے سچا بھی نہ اٹھایا گیا۔ مزدوری خاک کرتی۔ یہ سمجھ لو کہ اتنی بھاری مصیبت اٹھا کر زیادہ سے زیادہ دو روپے کی بچت

ہو گئی۔ اب اتنے بُرے کام میں بندے کا فائدہ بھی نہ ہو تو کتنے افسوس کی بات ہے شفقو سے میں نے کہا بھی کہ اتنی سردی میں ڈیرے تک جاتے ہوئے میں بیمار پڑ گئی تو چھے روپے دوا دارو پر نکل جائیں گے۔ دل میں ذرا سا بھی خدا کا خوف ہے تو تھوڑا انصاف کرو۔ تین مشٹنڈے مل کر کم از کم پندرہ روپے تو دو تا کہ میں بھی دو دن مزدوری کیے بغیر عیش و آرام سے گزار لوں۔ کتی کا جنا کہنے لگا برابر کا موج میلہ ہے۔ الٹا اس میں ہم پیسے لیا کرتے ہیں"۔ (۲۸)

یہ وہ جرائم ہے جو کالج کے ہاسٹل میں لڑکے کرتے تھے۔ اس ناول میں محمد الیاس کا مشاہدہ پوری جزئیات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ ہمارے تعلیمی اداروں کے ہاسٹلوں میں پیش آنے والے غیر اخلاقی کام ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے لیے لڑکے طرح طرح کی حرکات کرتے ہیں۔ مدرسوں میں ان سے بھی بُرا حال ہے۔

ک۔ تھانیدار نواب خان کی گوگی سے جنسی زیادتی:

ناول میں ایک بڑا اخلاقی جرم تھانیدار نواب خان کے ہاتھوں گوگی نامی لڑکے سے جنسی زیادتی ہے۔ تھانیدار نواب خان شہرت کے حوالے سے اچھا آدمی نہیں تھا۔ شہر میں کہیں بھی ان کا ذکر چھڑ جاتا تو تضحیک آمیز گفتگو ہونے لگتی۔ جس پر ہر شخص شرمندگی محسوس کرتا۔ موصوف کے بارے میں ایسی ناگفتنی زبان زدِ عام تھی اور ہر کوئی اس تھانیدار کا حوالہ دے کر ٹھٹھا اُڑاتا۔ یہ کردار ناول کو جاندار بھی بناتا ہے لیکن ہے ناول کا بدترین کردار۔ تھانیدار نواب خان جب ہیڈ کانسٹیبل ہوا کرتے تھے تو جڑانوالہ تھانے میں بطور محرر تعیناتی کے دوران اس کو سترہ اٹھارہ سالہ گوراچٹا لڑکا گل محمد عرف گوگی تھانے میں شکایت درج کرانے آتا ہے۔ وہ تھانیدار سے کہتا ہے کہ بعض سکول کے اوباش لڑکے اِسے تنگ کرتے ہیں لیکن تھانیدار اسے کہتا ہے کہ محض چھیڑ چھاڑ کرنے اور بُری نیت سے ورغلانے کے الزام پر پولیس کسی کو نہیں پکڑ سکتی جب تک کوئی ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو۔ شک کا فائدہ اٹھا کر مجرم بری ہو جاتے ہیں۔ میں آپ کو ایسا طریقہ بتاتا ہوں کہ مجرم کو فوری ہتھکڑیاں لگ جائیں اور عدالت میڈیکل کے ثبوتوں سے مجرموں کو سزا سنا دے۔ آپ فوری میرے کوارٹر کی چابی لیں اور کوارٹر میں بیٹھیں۔ صرف پندرہ بیس منٹ انتظار کریں میں آ جاؤں گا۔ پھر میں آپ کو سکیم بتاؤں گا جو بڑا بدمعاش بنا پھرتا ہے اس کے تن کے کپڑے اتار کر ایسی چھترول کریں گے۔ ساری زندگی بدمعاشی نہیں کرے گا۔ اوپر سے عدالت بھی اس کو سزا دی گی۔ ناول میں اگلا مرحلہ بڑا دل دکھانے والا ہے۔ اس میں گوگی تھانیدار کے کوارٹر میں بیٹھا آگ میں جھل رہا ہے کہ حوالدار کے مشورے پر عمل کر کے وہ شادے بدمعاش کو ایسا سبق سکھائے گا کہ وہ ساری عمر یاد کرے گا۔ شدید غصّے اور نفرت کے امتزاج پر دشمن کو تباہ کر دینے کی آرزو جب غالب آتی ہے تو عقل کا چراغ گل ہو جاتا ہے۔

اس روز شادے بدمعاش نے بھی سکول سے چھٹی کے بعد تمام لڑکوں کے سامنے لچرپن کا مظاہرہ کیا تھا۔ اتنے میں دو قلمی آم جو کہ برف میں لگے یخ ٹھنڈے تھے، تھانیدار لے کر آجاتا ہے۔ گوگی اور تھانیدار آم کھاتے ہوئے باتیں کرتے ہیں۔ تھانیدار منجھے ہوئے چور کی طرح پینترا بدلتا ہے، کہتا ہے کہ زیادتی کا نشانہ خواہ مرد بنے یا عورت جب سرکاری ہسپتال کا ڈاکٹر معائینہ کر کے رپورٹ لکھ دیتا ہے تو خواہ مجرم ملک کے صدر کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو، سزا سے نہیں بچ سکتا۔ گوگی ساتھ ساتھ تھانیدار کی باتوں میں ہاں سے ہاں ملا رہا تھا۔ تم یہاں سے پکے ثبوتوں کے ساتھ تھانے جاؤ گے۔ پھر وہاں ہسپتال جا کر معائنہ کرانا ہے۔ ڈیوٹی محرر کو میں بتا آیا ہوں۔ وہ ہر معاملے میں آپ کی مدد کرے گا۔ بیان دیتے ہوئے کہنا کہ شادے بدمعاش نے میرے ساتھ زبردستی کی ہے۔ بس جو جو میں کہتا ہوں کرتے جانا زیادہ وقت نہیں صرف پانچ منٹ لگیں گے۔ واپسی کے بہانے کے لیے میں گھڑی ادھر ہی چھوڑ آیا ہوں۔ آپ کے ساتھ جا کر سارا کام کراؤں گا۔ میں دیکھوں گا اس طرح وہ بدمعاش شادا حرامی کیسے اچھا بچہ بنے گا۔ اس واقعے کو ناول نگار نے کتنے اچھے پیرائے میں قلمبند کیا ہے کہ حقیقی زندگی کی تصویر کشی ہوتی ہے کہ کس طرح تجربہ کار اپنی واردات ڈالتا ہے۔ گوگی کو پیار سے بے آبرو کرتا ہے۔

> ”بے آبروئی کا کھیل اختتام پذیر ہوتے ہی گوگی کی عقل ٹھکانے آگئی۔ جس غلیظ حرکت سے بچنے کی خاطر وہ دادرسی کے لیے سرگرداں تھا، وہیں اس کے ساتھ عجیب فریب کاری کے پردے میں ہو چکی تھی اور عدل گستر ہی اس کا مرتکب ہوا جو ہنوز حیوانی روپ میں چارپائی پر بے سدھ پڑا اونگھ رہا تھا۔ ذلت و رسوائی کے شدید احساس نے گوگی کے تن بدن میں آگ لگا دی۔ لباس پہن کر تھانے جانے کی بجائے میز سے آم کے رس میں لتھڑی ہوئی چھری اٹھائی اور تھکن کے نشے میں چور بدن پر اوندھے ماندے پڑے لجلجے عضو کو ایک ہی وار میں کاٹ کر الگ کر دیا۔ گوگی دلدوز چیخ بلند ہونے پر ایک ہی جست میں دروازے پر پہنچا اور چٹخنی گرا کر بھاگ نکلا“۔[۲۹]

کسی لڑکے کو باتوں میں پھسلا کر جنسی زیادتی کرنا کتنا بڑا جرم ہے اور پھر جوشِ انتقام میں جو گوگی نے تھانیدار کے ساتھ کیا، وہ اس سے بڑا جرم ہے۔ گوگی کے انتقام کے پیچھے یہ جذبہ ہے کہ دوبارہ تھانیدار کسی کے ساتھ بدفعلی کے قابل نہ رہے۔ یہاں پر محمد الیاس نے مزاحمت کی جذبے کو ابھارا ہے۔ کمزور طبقے کے استحصال کی عمدہ تصویر کشی کی گئی ہے۔ ساتھ ساتھ قارئین کے شعور کو بھی بیدار کیا ہے کہ کس طرح تھانیدار جُرم کرتا ہے۔ پھر اس سے جُرم پیدا ہوتا ہے۔ محمد الیاس مزاحمت کے علمبردار ناول نگار ہیں۔ ایک ناول نگار ادیب کے ہاں اس جُرم کے اسباب و محرکات میں انتقام کا عنصر غالب ہے۔ دوسری طرف تھانیدار کی غیر اخلاقی حرکت جو

کہ وہ کافی عرصہ سے کرتا چلا آرہا تھا وہی اس جرم کا محرک تھا۔ بڑے بڑے اردو کے ناول نگار مستنصر حسین تارڑ، ممتاز مفتی، عبداللہ حسین، شمس الرحمٰن فاروقی کے ہاں بھی ایسے ہی جرائم کے انتقامی جذبات کی عکاسی کی گئی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کے ہاں جذبات کے انتقامات زیادہ ہیں یا روسی ناول نگار اور ادیب میکسم گور کے ہاں ایسا ہی ہے۔ وہ اپنے ناول میں یہی لکھتے ہیں کہ :

> ''مفلسی، بھوک اور بیماری لوگوں کو محنت کا یہی صلہ ملتا ہے۔ ہر چیز غریب کے خلاف ہے، خون پسینہ ایک کر کے کام کرتے ہیں۔ ہمیشہ گندگی میں رہتے ہیں، ہمیشہ بے وقوف بنائے جاتے ہیں۔ ہمیں ایسے رکھا جاتا ہے جس طرح کتے کو زنجیر سے باندھ کر رکھتے ہیں۔ ہم کسی چیز سے واقف نہیں۔ ہر چیز سے ڈرتے ہیں۔ ہماری زندگی ایک طویل رات ہے''۔[۳۰]

میکسم گورکی کے ہاں بھی ہمیشہ غریب کو انصاف دینے کے بہانے یا استعمال کرنے کے بہانے بیوقوف بنایا جاتا ہے۔ محمد الیاس کا مؤقف بھی یہ ہے کہ مزاحمت تو تب پیدا ہوتی ہے جب دوسرا ماموں بنا کر آپ کے ساتھ زیادتی کرتا ہے۔ تھانیدار نے آختہ ہو کر یہ بات کسی سے نہیں کی بلکہ گوگی کے ایک لکھے خط سے معلوم ہوا جو اس نے اپنے دوست کو لکھا تھا۔ لوگوں کو یہی بتایا تھا کہ میں تھانیدار کو قتل کر کے آیا ہوں۔ ہمارے ہاں ایسے واقعات کثرت سے ہوتے ہیں۔ یہ جرم برائے جرم کو تقویت دینے والی بات ہے۔ لڑکے نے تھانیدار کو ہی نہیں بلکہ اس کی بیوی کو بھی قتل کیا جو اپنے جذبات ساری عمر اللہ اللہ کرتی گزار گئی۔ اس میں تھانیدار کی بیوی کا تو کوئی قصور نہیں تھا لیکن تھانیدار پہلے سے بھی بڑا شیطان ثابت ہوا کرپشن دھڑلے سے کرتا تھا۔ آخری عمر میں اس نے توبہ کی۔ لیکن حرام کی کمائی سے پلنے والی اس کی بیٹی سہودی اپنی مرضی کرنے لگی۔ ناول کے اس موڑ پر محمد الیاس نے حرام جیسے گناہ کے اثرات کا جائزہ بڑی باریک بینی سے لیا ہے کیونکہ ناحق لوگوں کو تنگ کرنا اور مال بنانا کہاں کا اُصول ہے جو کہ ایک جرم ہے۔ بعد میں نواب خان نس کٹا تھانیدار مشہور ہو گیا۔ یہ عوام کا انتقام تھا جو اس کو یہ نام دیا گیا۔ قانون کو اس کے خلاف حرکت میں آنا چاہیے تھا لیکن قانون کے رکھوالوں کے ساتھ قانون کم ہی حرکت میں آتا ہے۔ یہ ہماری پولیس کا رویہ ہے۔

گ۔ مولوی ثاقب لائبریرین اور فحش لٹریچر (پورنوگرافی):

محمد الیاس نے ''حبس'' میں ایک کردار مولوی ثاقب لائبریرین کو ڈالا ہے جو کہ فحش لٹریچر باتصویر لڑکیوں کو پڑھنے کے لیے دیتا تھا۔ پہلے افسانے اور کہانیاں دیتا تھا پھر ساتھ ہی فحش لٹریچر دے دیتا۔ اگر کوئی لڑکی غصّے کا اظہار کرتی تو وہ اس کو اپنی بہن بنا لیتا۔ نام مولوی تھا لیکن وہ مولوی نہیں تھا۔ ہر وقت فلمی ہیرو کا روپ

دھارے رکھتا۔ عمر کوئی تیس اور چالیس کے درمیان ہو گی۔ ثاقب نے لائبریری میں ممنوعہ کتب کو علیحدہ رکھا ہوا تھا۔ ہر عمر کے مرد و خواتین اس سے کرایہ پر کتابیں لے کر پڑھتے تھے۔ بگڑے ہوئے لڑکے ثاقب کی لائبریری میں ہی زیادہ وقت گزارتے۔ وہاں پر وہ اپنی پسند کی لڑکی سے رقعہ بازی بھی کر لیتے۔ آہستہ آہستہ مولوی صاحب کا کاروبار پھیلتا گیا اور سینہ بہ سینہ گند پورے علاقے میں پھیل گیا۔ اخلاقی جرائم کے پجاری ثاقب کا کاروبار سونے کی طرح چمکنے لگا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے مکافات عمل شروع ہوا۔ مشہور رائٹر ابن صفی کو پڑھنے والی لڑکی نے کتاب مانگی۔ لڑکی بڑی سلجھی ہوئی تھی۔ اس نے فحش لٹریچر کتاب جو دوسری کتاب کے نیچے رکھ کر دے رہا تھا مولوی ثاقب کے منہ پر دے ماری اور محلے میں ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ ساتھ ہی ثاقب کی شخصیت لچکدار ہوئی۔ اس نے گری ہوئی کتاب پاؤں سے کاؤنٹر کے نیچے کر دی۔ بڑی عاجزی سے معافی مانگتا ہوا ثاقب پیاری بہن، پیاری بہن کا تکرار کر رہا تھا اور لوگوں سے کہہ رہا تھا کہ میرے پاس ایسی کتاب سرے سے ہے ہی نہیں۔ میں محلے میں کام کرتا ہوں ایسا لٹریچر رکھنا میری غیرت کے خلاف ہے۔ یوں اس دن آفت ٹل گئی لیکن ثاقب بُری حرکت یعنی بدفعلی کرنے کے وقت جن لڑکوں کو باہر نگرانی کے لیے بٹھاتا تھا اور بعد میں ان کی باری نہیں آنے دیتا تھا۔ ان میں سے ایک اس بے انصافی پر سارا کھیل ہی بگاڑنے پر تلا ہوا تھا۔ تین بار وہ کرسی پر یعنی کاؤنٹر پر بیٹھا رہا لیکن باری آنے پر ثاقب حیلے بہانے کرتا۔ لڑکے نے حلقے کے ممبر طالب حسین کو اپنے اعتماد میں لیا اور اپنے شکار کی تاک میں رہا۔ بعد میں ثاقب لائبریرین کو بڑی بے عزتی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ یہ بہت بڑا اخلاقی جرم تھا اور قابل سزا بھی تھا۔ اس منظر کی تصویر کشی ناول نگار نے اس طرح کی ہے:

> "موقع ملتے ہی اشارہ دیا اور چھاپا پڑ گیا۔ معززین نے پہلے سے حکمت عملی طے کر رکھی تھی۔ ثاقب کا منہ کالا کر کے گلے میں جوتوں کا ہار ڈالا اور گدھے پر بٹھایا۔ مین بازار کے علاوہ بڑی بڑی گلیوں، سڑکوں اور اہم مقامات پر جلوس کے جلو میں شام تک گھمایا۔ جس کا دل چاہا آگے بڑھ کر گدھا سوار کے سر پر جوتا رسید کر تا گیا۔ وہ ایسا بدبخت ثابت ہوا کہ سگے باپ نے بھی ہجوم میں گھس کر لرزتے کپکپاتے ہاتھوں سے جوتے دے مارے۔ سزا کاٹ کر تقریباً چار سال بعد گھر پہنچا تو روپ ہی نرالے تھے۔ بہت خوبصورت داڑھی بڑھا رکھی تھی، پیشانی پر محراب، سر پر ٹوپی، لبوں پر ہر وقت کلام پاک کا ورد"۔[۳۱]

ہر معاشرے میں جرم سے جرم جنم لیتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی ایسا ہی ہے۔ ہمارا ناول نگار بھی معاشرے کا فرد ہے۔ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے معاشرے کا مشاہدہ کرتا ہے پھر جا کر تخلیق کی صورت میں انوکھا پن ڈال کر ناول تیار کرتا ہے تو ادب کا دوسرا مقصد پڑھنے والوں کے لیے ذہنی نشوونما کے علاوہ

معاشرے کے جرائم اور بیماریوں سے بھی آگاہ کرتا ہے تاکہ معاشرہ اپنی جز کو ٹھیک کرے۔ کل خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔ لیکن ہمارے ہاں کچھ رواج غلط ترقی کر گئے ہیں۔ اگر کوئی چور چوری کرتا پکڑا جائے یا بد فعلی کا مرتکب بندہ ہاتھ آ جائے تو ہم لوگ پولیس کے آنے سے پہلے ہی ریمانڈ لینا شروع کر دیتے ہیں جو کہ غیر قانونی ہے۔ اکثر پولیس والے یہ کہتے ہیں کہ ملزم ہمارے پاس جب پہنچا تو بیان دینے سے پہلے ہی اس کی موت واقع ہو چکی تھی۔ لوگ کہتے ہیں کہ پولیس نے مار دیا۔ ہمارے ہاں جعلی پولیس مقابلے بھی ہیں، جعلی پرچے تو غریبوں کے خلاف روز کٹتے ہیں۔ یہ وہ جرائم ہیں جو اخلاقیات کی مد میں آتے ہیں۔ محمد الیاس نے اپنے اس ناول میں فحش لٹریچر اور قابل اعتراض تصویروں والی کتابیں ہمارے معاشرے میں ایسے بہت سے مولوی ثاقب ہیں جو سادہ لوح لڑکیوں کو پھانس کر یہ کام کرتے ہیں لیکن آج کل ترقی زیادہ ہو گئی ہے۔ ہر بچے کے ہاتھ میں موبائل ہے اور انٹرنیٹ سے آسانی سے اپنی مرضی کی تصویریں دیکھ سکتا ہے، اسے آسانی سے ڈاؤن لوڈ کر سکتا ہے، مگر محمد الیاس نے اپنے ناول "حبس" میں مولوی ثاقب کو مجرم نہیں بلکہ اسے پکڑوانے والے کو مجرم ٹھہرایا ہے۔ مولوی ثاقب تو چار سال جیل کاٹ کا ولی بن گیا لیکن یہ سزا اس کو اس کی بے انصافی کی وجہ سے ملی کیونکہ بُرائی میں بھی انصاف کا پیمانہ ہوتا ہے۔ ہمارے ہاں اکیسویں صدی میں نمایاں طور پر تخلیقی فعالیت کا مظاہرہ کیا جاتا ہے، وہ خواہ مرزا اطہر بیگ ہو یا شمس الرحمٰن فاروقی یا حمید شاہد، عاصم بٹ، مستنصر حسین تارڑ، طاہرہ اقبال، آمنہ مفتی، ان سب نے اپنے ناولوں میں جرائم کا ذکر کھل کر کیا ہے جو چھوٹی چھوٹی وجہوں سے ہوتے ہیں۔ معاشرے میں بے انصافی، عدم مساوات، اقدار کا زوال پذیر ہونا شامل ہے۔ ناول نگار ادیب طبقہ کبھی بھی حکمرانوں سے نہیں ڈرا بلکہ خوف خدا ہی ان کا منشا رہا ہے۔ ادیب خواہ ایشیا کا ہو یا یورپ کا ہو یا آسٹریلیا کا ان کی عبارتوں میں خوف نہیں ہوتا جیسے ماریو پوزو نے اپنے ناول "گارڈ فادر" میں پیش کیا ہے۔ "اسی فریب کا نام جمہوریت رکھ دیا گیا جہاں مافیاز، انصاف سمیت سب کچھ خرید سکتے ہیں"۔ یہ الفاظ ماریو پوزو کے جمہوریت کے بارے میں ہیں جس میں جاگیر دار، سرمایہ دار اور مافیاز اکٹھے اسمبلیوں میں بیٹھ کر قانون بناتے ہیں۔ ہمارے ملک میں ہم یہ گھناؤنا کھیل ستر سال سے دیکھ رہے ہیں۔ آگے کب تک چلے جب تک عوام کو تعلیم کے زیور سے پوری طرح آراستہ نہیں کیا جاتا تب جا کر تبدیلی آنا شروع ہو گی صرف تبدیلی کے نعرے سے نہیں۔

ل۔ سہودی کا آپریشن کرانے والا جرم:

اس ناول کی ہیروئن سہودی ہے۔ یہ ایک مضبوط کردار ہے جو نواب خان تھانیدار کی اکلوتی بیٹی ہے۔ پیسے کی ریل پیل ہونے سے دنیا کا ہر اچھا بُرا کام بچپن میں ہی کر لیا تھا۔ دلیر اتنی کہ باپ سے بھی دو دو ہاتھ کر لیتی ہے۔ اس کی شادی ناول کے ہیرو دلدار سے اس کا باپ زبردستی کروا دیتا ہے اور بچے یعنی اپنے نواسے، نواسیوں کو دیکھنا چاہتا ہے۔ بیٹی کی رائے ماں باپ کے بارے میں کبھی اچھی نہیں رہی۔ وہ کہتی تھی باپ نے تو اپنے کیے کی سزا پائی پر ماں نے دل پر پتھر رکھ کے ہاتھ میں تسبیح لے کر گزار دی۔ سہودی کا یہ کہنا کہ باپ نے تو جرم کیا پر ماں کو ساری عمر خاوند کے بغیر رکھ کر اس سے بڑا جُرم کیا گیا۔ وہ انسان نہیں تھی کہ تھانیدار کے تین منزلہ گھر میں نوٹوں کے ساتھ کھیلے جو سراسر حرام کی کمائی ہے۔ کیوں نہ اس نے دوسری شادی کر کے انسانوں کی طرح رہنا سیکھا۔ کیا اسلام میں یہ جائز ہے۔ کیوں اس نے اپنی ساری عمر تسبیح پکڑ کر اپنے جذبات کی قربانی دی۔ باپ بیٹی آپس میں لڑ رہے ہیں۔ باپ عاق کرنے اور بھوکا مرنے کی دھمکی دے رہا ہے پر بیٹی باپ سے دو دو ہاتھ کرتی ہے۔ کہتی ہے کہ تم مجھے بدمعاش کہہ رہا ہے۔ کبھی بدمعاش عورت بھوکی مری ہے۔ وہ ہمیشہ کوئی نہ کوئی دھندہ کر لیتی ہے۔ باپ کو یہ دھمکی دیتی ہے کہ آرمائشیں صرف شریف زادیوں کے لیے ہوتی ہیں۔ میں لائل پور یا لاہور چلی جاؤں گی وہاں دھندے والی عورت کی دہاڑی مزدور سے کہیں زیادہ ہے۔ باپ گولی مارنے اور خودکشی کرنے جیسی دھمکیاں دے رہا تھا۔ ماں ان دونوں سے کہہ رہی ہے کہ میرا معاملہ خدا پر ہے۔ آپ دونوں باپ بیٹی لڑ مرو۔ بیٹی کا یہ کہنا کہ خاندانی منصوبہ بندی والی سفینہ اگر نہ ہوتی تو اب تک ابا بغیر داماد کے نانا بن گئے ہوتے۔ کیونکہ وہ ہی مجھے اسقاط حمل کی گولیاں دیتی تھی۔ اپنے خاوند سے کہہ رہی ہے کہ میرا آپریشن کروا دیں تاکہ میں بچے پیدا نہ کر سکوں۔ میں فلاحی ادارہ بنا کر یتیموں کے بچوں کی ماں بننا چاہتی ہوں۔ کل میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی اس نے کہا کہ آپریشن کرنا بڑا گناہ اور جرم ہے۔ میں غیر قانونی کام نہیں کر سکتی۔ اپنے خاوند کو ساتھ لاؤ فارم پُر کرو تاکہ میں قانونی کاروائی سے بچ سکوں۔ اس غیر قانونی کام کو کس طرح ناول نگار نے بیان کیا ہے:

> ”اگلے روز ہولی فیملی کی ماہر گائناکالوجسٹ نے بعد از شام اپنے ذاتی کلینک میں آپریشن کر دیا۔ اس سے قبل میں نے سہودی کو اس انتہائی اقدام سے باز رکھنے کی اپنی سی سعی کر دیکھی تھی۔ اس کو دلائل سے قائل کرتا رہا کہ باپ سے انتقام لینے کی خاطر اس حد تک نہ جائے جہاں سے واپسی ممکن نہ رہے۔ کل کو وہ پچھتائے گی مگر ضد پوری کر کے رہی“۔ (۳۲)

عورت کو بانجھ کر دینا کتنا بڑا جُرم ہے کیونکہ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے عورت کو تخلیق انسانیت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کو اس حق سے محروم کرنا قتل سے بڑا جرم ہے۔ ہمارے سماج میں ایسی وارداتیں اور جرائم کثرت سے ہوتے رہتے ہیں۔ اکثر دھندہ کرنے والی عورتیں آپریشن کروا کے اس صلاحیت سے محروم ہو کر کھل کر دھندہ کرتی ہیں کہ نہ رہے بانس نہ بجے بانسری۔ ناول میں وہ عورت پھر اپنے خاوند سے طلاق لے کر یتیم اور بے سہارا انسانوں کے لیے فلاحی ادارہ کھول لیتی ہے اور خود مائی پکھیاں والی سرکار بن جاتی ہے۔ یہ تھانے دار کی بیٹی سہودی کی کہانی تھی جس نے اپنی مرضی سے سارے کام کیے۔ اگر ہم بانو قدسیہ کے ناول "راجہ گدھ" کا مطالعہ کریں تو بانو آپا نے اپنے اس ناول میں صاف لکھا ہے کہ حرام کی کمائی سے پلنے والا جسم ویسی ہی حرکتیں کرے گا یعنی جینز میں حرام شامل ہو کر اپنا اثر دکھاتا ہے۔ اسلام میں رزق حلال پر زور دیا گیا ہے۔ صرف یہ نہیں کہ روپے پر رزق حلال عین عبادت لکھنے سے رزق حلال نہیں ہو جاتا۔ جب تک جائز طریقے سے نہ کمایا جائے۔ اردو ناول نگاروں کے ہاں ایسی تحریریں ہمیں بکثرت ملیں گی کہ رزق حلال ہی ہمارا مقصود ہونا چاہیے۔ محنت ہی کسی فرد اور قوم کو آگے لے کر جاتی ہے نا کہ پرائی دولت سے جو محنت سے نہیں کمائی جاتی۔

م۔ پراچہ کا بہانہ اور غیر اخلاقی قتل:

ناول میں ایک کردار پراچہ کا ہے جو اپنے آزاد خیالات کی وجہ سے اپنے ہم جماعتوں میں مشہور تھا۔ ایم اے اسلامیات اور لٹریچر میں ماسٹر کیا تھا۔ ناولوں کے ہیرو کے دفتر کا ملازم تھا۔ وہ کہتا تھا کہ ایک ہی مذہب ہے وہ ہے انسانیت کا مذہب۔ انسان دوسرے انسان کے حقوق کا خیال رکھے۔ اس کے درد کو اپنا درد سمجھے، بے ایمانی سے پرہیز کرے۔ چھٹی کے دن دوستوں کے ساتھ کیرم بورڈ اور تاش کی بازی لگاتا۔ مولوی نہال الدین کے ساتھ مذہبی بحث کرتا، پھر دلائل پر دلائل دیئے جاتا۔ مولوی صاحب کو جب کوئی جواب نہ بن پڑتا تھا تو وہ اسے کافر اور الحادی کہتا کہ تم دشمن کے ایجنڈے پر کام کر رہے ہو۔ پراچہ یہ کہتا کہ پوری قوم غربت کی وجہ سے جنسی مریض بن گئی ہے۔ پیٹ کی بھوک جسمانی نمود پر اور جنسی بھوک ذہنی صلاحیتوں کو نگل جاتی ہے۔ جس کا دعویٰ بھی تھا کہ مرد عورت سے یا مرد مرد سے یا عورت عورت سے باہمی رضامندی سے کسی سے بھی تعلق قائم کر سکتے ہیں۔ ان پر ریاست کی طرف سے پابندی لگانا حرام ہے۔ اس سے جنسی جرائم میں اضافہ ہوتا ہے اور لوگوں کی سوچ ناف کے نیچے سے اوپر نہیں جاتی۔ اس نے مثالیں دے دے کر انتہا کر دی اور انتہائی شرمناک اخلاقی جرائم کی طرف توجہ دلائی۔ جو کچھ دن پہلے شہر کی ایک مشہور شخصیت کے برادرِ نسبتی اپنی سگی بھانجی کو اغوا کر کے لے گیا۔ گرفتار ہونے پر اس نے واشگاف الفاظ میں اقبال جرم کرتے ہوئے تسلیم کیا کہ حدِ بلوغت کو چھوتے ہی

وہ اس روش پر گامزن ہو گئے تھے بلکہ وہ یہاں تک کہتا کہ کم سنی میں میرے ساتھ حیوانیت کا کھیل کھیلا گیا تھا۔ کبھی مولوی نہال الدین سے کہتا کہ آپ حلفیہ بیان دیں کہ آپ کے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔ آپ تو اپنے ہی کزن کی ہوس کا نشانہ بنتے رہے ہو۔ سب دوست اس کی بات پر مسکرا دیتے لیکن مولوی مغلظات کہنا شروع ہو جاتا اور محفل برخاست کرنی پڑتی۔ ہم قریبی دوست اس کو اچھی طرح جانتے تھے کہ بعض خامیوں کے باوجود وہ ایک اچھا انسان تھا۔ اس میں شخصی خوبیاں بے پناہ تھیں۔ دھوکہ دہی سے کوئی دس پیسے کی حقیر ترین رقم بھی اس سے ہتھیانے کی کوشش کرتا تو وہ بڑی سختی سے پیش آتا۔ اس کے برعکس کسی مفلوک الحال محنت کش کو رائج الوقت ایک ڈیڑھ روپے معاوضہ ادا کرنے کی بجائے اس پر جیب خالی کر دیا کرتا۔ اس کردار کی موت کے منظر کو ناول نگار نے اس طرح پیش کیا ہے جو کہ بڑی دردناک ہے :

> ”عوام اکائیوں میں بٹ گئے تھے۔ انسان ہی انسان کا دشمن ہو گیا۔ ایسی ایسی عصبیتیں اور نفرتیں ابھر آئیں جن کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ انتہا پسند طبقات باقاعدہ ایک دوسرے کے مقابل صف آرا ہو گئے۔ عسکری تنظیمیں قائم کر لی گئیں جو مخالف نظریات اور عقائد رکھنے والوں پر حملہ آور ہوتیں۔ دہشت گردی کی وارداتیں روزمرہ کا معمول بن گئیں۔ عام نہتے شہری عبادت گاہوں اور عوامی مقامات پر نشانہ بننے لگے۔ سرکاری، نجی اداروں اور گلی محلوں میں بھی امن سکون نہ رہا۔ پرامن شہری تازہ ہوا کے ایک سانس کو ترس گئے۔ مجھ پر ہمہ وقت حبس دم کی کیفیت طاری ہوئی۔ انھی پراچہ کو اس کے فلیٹ میں کسی انتہا پسند تنظیم نے موت کے گھاٹ اتار دیا اور اسی کے خون سے کمرے کی دیوار پر لکھے گئے چند الفاظ کا مفہوم بڑا واضح تھا“۔ [۳۳]

محمد الیاس نے ہمارے ملک میں ضیاء الحق کے مارشل لاء کے بعد کے حالات کا جائزہ اپنے ناول میں بڑے اچھے انداز سے پیش کیا ہے کہ اس سے پہلے ایوب خان اور بھٹو دور میں محرم کے دوران سنی عقیدے کے لوگ اپنے اہل تشیع بھائیوں کے لیے پانی کی سبیلیں لگاتے تھے۔ ہر جگہ سماجی اقدار کا پاس کیا جاتا تھا کہ یکدم ان روایات کو خیرباد کہہ دیا گیا اور شدت پسند غالب آ گئے۔ وہ زور سے دوسرے کا عقیدہ تبدیل کرنے کے حامی تھے۔ خیالات کے باغی کو معافی مانگنے پر اللہ غفور الرحیم معاف کر دیتا ہے لیکن دنیا کا عام چھوٹا صاحب اقتدار طبقہ معاف نہیں کرتا۔ یہ وہ معاشرے کے اخلاقی جرائم ہیں جو ہماری زندگی کا اب بھی معمول ہیں۔ ہم چھوٹی چھوٹی باتوں میں آ کر قتل تک بھی کر جاتے ہیں کیونکہ جس مذہب کی آڑ میں یہ کرتے ہیں وہ ان جرائم کی اجازت نہیں دیتا۔ ادیب نے ہماری اس مجرمانہ حس کو بیدار کیا ہے کہ برداشت معاشرے میں توازن کی نشانی ہوتی ہے جبکہ

عدم برداشت تمام اخلاقی بیماریوں اور جرائم کی جڑ ہے۔ ہر جگہ جھگڑا ہی عدم برداشت کا ہے۔ جس قوم نے برداشت کو سیکھا وہ گروہ نہیں رہی قوم بن گئی۔ جو عدم برداشت پر کاربند ہیں وہ گروہ ہیں۔ اس ناول میں بے چینی، اضطراب، خوف، دہشت اور قتل و غارت کا محرک ہماری عدم برداشت کو ٹھہرایا گیا ہے جو کہ ایک اخلاقی جرم ہے۔ اسلام صبر کا درس دیتا ہے قرآن پاک میں ۷۰ سے زائد مقامات پر صبر کا ذکر فرمایا گیا ہے۔ صبر سے انسان کو سیلف کنٹرول حاصل ہوتا ہے۔ سیلف کنٹرول کا مقصد ہی اپنی خودی کو گرفت میں لینا ہے۔ اسی خودی کی اہمیت کو شاعر مشرق علامہ اقبال یوں بیان کرتے ہیں:

اس قوم کو شمشیر کی حاجت نہیں رہتی
ہو جس کے جوانوں کی خودی صورت فولاد
نا چیز جہاں مہ و پروین تیرے آگے
وہ عالم مجبور ہے توعالم آزاد
موجوں کی تپش کیا ہے فقط ذوقِ طلب ہے
پنہاں جو صدف میں ہے وہ دولت ہے خدا داد
شاہیں کبھی پرواز سے تھک کر نہیں گرتا
پر دم ہے اگر تو تو نہیں خطرہ افتاد(۳۴)

عدم برداشت کا الٹ برداشت یا سیلف کنٹرول ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو سیلف کنٹرول کی طاقت دے رکھی ہے۔ انسان اپنی سوچ، عمل، عادات پر پورا اختیار رکھتا ہے۔ لوگوں کی اکثریت دھوکے میں زندگی گزار دیتی ہے۔ جن چیزوں پر اختیار نہیں انہیں ٹھیک کرنے کے لیے مچلتی رہتی ہے۔ جس پر پورا حق یعنی "خود" پر حاصل ہوتا ہے۔ اس پر کوئی دھیان نہیں دیتی۔ معاشرے میں زیادہ سر اٹھانے والے جرائم اور ان کے نتیجے میں ہونے والی تباہیوں کی اصل وجہ لوگوں میں سیلف کنٹرول کا نہ پایا جانا ہے جس نے انہیں جذباتی، خود غرض، حاسد، بے صبر، حریص، ظالم، بے ایمان، ڈاکو، قاتل بنا ڈالا ہے۔ لوگ انتقامی کاروائی کے لیے ہر وقت کمر بستہ رہتے ہیں۔ ناول نگار نے انہی لطیف جذبات کو کنٹرول کرنے کا مشورہ دیا ہے جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتے۔

ن۔ حاجی دین محمد آڑھتی کے اخلاقی جرائم:

سہودی جب مائی پکھیاں والی بن گئی تو اس نے اپنے ہاں غریب بچوں اور بچیوں کے لیے لنگر خانہ اور مدرسہ کھول لیا جہاں بچوں کی تعلیم، علاج، رہنے کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود تھی۔ وہاں پر مائی بھاگاں بھی

رہتی تھی جسے عورتوں کی انچارج بنایا تھا۔ مائی پکھیاں والی کو اس پر بڑا اعتماد تھا۔ وہ کہتی تھی کہ باجی ہی ہمارا مائی باپ ہے۔ یہاں آنے سے پہلے ہماری حالت بڑی اچھی نہیں تھی۔ ہر کوئی مجرم آ کر ہماری بہو بیٹیوں کی عزت سے کھیل جاتا تھا۔ گاؤں کا نمبر دار ہمیں گھر بلا کر کہتا ہے کہ ووٹ پر مہر کسی اور کو لگائی تو تمہاری لڑکیوں کو اٹھا کر لے جائے گا۔ ہم اپنے سارے شناختی کارڈ ممبر کو جمع کرا دیتے تا کہ کل کلاں ہم پر شک نہ کرے۔ اسی دن ہمارے گھر راشن بھیج دیتا۔ ہم غریب لوگ روٹی کے بھوکے ہیں جہاں بے انتہا غریبی ہو، ہر وقت بھوک ستائے اور روٹی کی فکر لگی رہے وہاں غیرت کوئی نہیں ہوتی۔ امیر لوگ شوق سے بُرے کام کرتے ہیں اور ہم مجبوری سے۔ یہ تھا ناول میں مائی بھاگاں کا کردار۔ اگلا کردار حاجی دین محمد آڑھتی ہے جس کی آڑھت کنک منڈی میں تھی۔ وہ ہول سیل کا کاروبار کرتا تھا۔ اس نے اپنے پاس صرف جوان لڑکیاں دالیں صاف کرنے اور گندم کی صفائی کے لیے رکھی ہوئی تھیں۔ حاجی روز کسی نہ کسی لڑکی کی ڈیوٹی اپنے ساتھ لگواتا۔ اگر کوئی لڑکی انکار کرتی تو اس کی چھٹی کروا دیتا۔ مجبوراً لڑکیاں اس کے ساتھ بُرے کام کرنے کے لیے مجبور تھیں۔ حاجی صاحب کی منڈی میں بڑی عزت تھی لیکن تھا ایک نمبر کا حرامی۔ محمد الیاس نے اس کردار کی تصویر کشی ان الفاظ میں کی ہے:

> ”میں ابھی بارہ تیرہ برس کی تھی۔ میری ماں بھر جوان ہم عورتیں لڑکیاں حاجی دین محمد کی آڑھت پر دانے، دالیں اور ہر جنس ”اچھی“ کیا کرتی تھیں۔ سارا دن کنکری، روڑی، الابلا چُن چُن کے ہماری آنکھوں میں رڑک ہونے لگ جاتی۔ رب سونے کا حکم کہ مزدور کو اس کی حلال مزدوری بغیر ظلم و زیادتی کیے دے دو مگر حاجی کو کسی کسی جوش چڑھ جاتا۔ جو عورت نہ مانتی اس کو اگلے روز کام پر آنے سے منع کر دیتا۔ آپ بتائیں سرکار اتنی مجبوریاں ہیں۔ ہم عورتیں کیا کرتیں؟ ہم کھیتوں میں، باغوں میں، منڈیوں میں، گھروں میں، جہاں جہاں مزدوری کرنے گئیں کوئی نہ کوئی بری نیت والا ٹکرا ہی گیا“۔(۳۵)

یہاں پر محمد الیاس نے اخلاقی جرائم کی عکاسی بڑے اچھے انداز سے کی ہے کہ غریب عورتیں اگر کسی کے گھر میں کام کریں تب ان کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ آئے روز ہم اخبارات اور ٹی وی پر دیکھتے ہیں کہ گھریلو ملازمہ زیادتی کے بعد قتل ہو گئی بعد میں غریب نادار لوگوں کو پیسے دے کر صلح پر راضی کر لیا جاتا ہے۔ یہ جرائم اس لیے نہیں رکتے کہ سزا ہی بہت کم ملتی ہے۔ اگر غریب عورتیں کھیتوں میں کام کریں تو جاگیر دار اپنی ہوس کا نشانہ بناتے ہیں۔ جاگیر دار جاگیر کی طرح ہر ہاری عورت کو اپنی ملکیت سمجھتا ہے۔ باغوں اور منڈیوں میں کام کرنے والی عورتوں کو آڑھتی اپنی منکوحہ سمجھتے ہیں۔ یہ معاشرتی جہالت ہے کیونکہ اکثر ایسے کیس غربت کی وجہ

سے رپورٹ نہیں ہوتے۔ اگر ہوتے بھی ہیں تو سزا نہیں ملتی۔ عورت اگر مزدوری کرتی ہو تو وہاں بھی ان کی عزت محفوظ نہیں۔ اگر معاشرے سے جرم ختم کرنے ہیں تو ہمیں اپنے نظام انصاف کو مضبوط کرنا ہو گا۔ غربت کو ختم کرنا ہو گا، تعلیم کو عام کرنا ہو گا، تب جا کر ہمارا معاشرہ ترقی کرے گا۔ ناول کا مقصد معاشرے کو اچھی راہ دکھانا ہے نہ کہ تنقید کرنا۔ کیوں کہ جو چیزیں جرائم کا اسباب اور محرک بنیں وہ ناول نگار کے ہاں غربت اور مجبوری تھی۔ دوسری نظام عدل پر سوالیہ نشان تھا کہ آخر ایسا کیوں ہے۔ یہاں آ کر ہمیں محمد الیاس ایک منجھے ہوئے لکھاری نظر آتے ہیں۔

و۔ ضلع دار کے ہاتھوں دائی کا قتل:

ناول میں ایک کردار ضلع دار کا ہے جو کہ کسی زمانے میں ناول کے مرکزی کردار دلدار کے پڑوس میں رہتے تھے۔ ان کی بیٹی ثریا جو پچھلے پچاس برسوں سے کنواری بیٹھی تھی۔ بچپن میں یعنی انٹر کالج دور سے ہی آنکھوں آنکھوں میں دلدار کو دل دے بیٹھی تھی۔ آتے جاتے نگاہ پڑ جاتی تو دل ہی دل میں خیالات مچلنے لگتے لیکن اظہار محبت کی نوبت کبھی نہیں آئی۔ ایک دن اس کا ایک میسج ناول کے ہیرو کو آیا کہ میں گزشتہ رات سے آپ سے رابطہ کرنے کی کوشش کر رہی ہوں اس لیے میں نے یہ پیغام واٹس اَپ سے دیا ہے۔ ہم نے بہترین زندگی گزاری اور محبت کی لاج رکھ لی یعنی اس کا اظہار کسی دوسرے سے نہ کیا۔ میرے رشتے ایک سے بڑھ کر ایک آئے لیکن تیری محبت میں سب کو ٹھکرا دیا۔ اب میں بوڑھی ہو گئی ہوں۔ جب مجھے پتہ چلا کہ آپ ہمارے گھر آ رہے ہیں تو گویا خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ آج میں آپ پر وہ راز بھی کھول دیتی ہوں جو برسوں سے چھپا ہوا تھا۔ ہم صرف دو بہن بھائی ہیں میں بھائی سے نو سال چھوٹی ہوں گھر میں کسی چیز کی کمی نہ تھی بلکہ ہر چیز کی بہتات تھی۔ میں اپنی آبائی حویلی میں پیدا ہوئی تو دائی کی اطلاع کے بعد میرے والد نے داعی کو پتھر سے کچل دیا۔ اس کے کپڑوں میں پیسے اور زیور چھپا کر حویلی کے پاس گہری کھائی میں رات کو ہی پھینک دیا تاکہ وہ میرے خواجہ سرا ہونے کا راز گاؤں میں نہ فاش کر دے۔ ساتھ ماں کو دھمکی دی کہ اگر آپ نے یہ راز فاش کیا تو آپ کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔ ماں ڈر کے مارے سہم گئی۔ باپ نے یہ بھی کیا کہ ایک بیٹا میرا پہلے بھی ہے آئندہ میں بچہ پیدا نہیں کروں گا تاکہ تمھاری توجہ اس آنے والی مخلوق سے ہٹ نہ جائے۔ تیری توجہ صرف ثریا پر ہونی چاہیے۔ اس غیر اخلاقی جرم کے منظر کو محمد الیاس نے اس طرح بیان کیا ہے:

"بھائی کی پیدائش کے ۹ سال بعد اپنی آبائی حویلی میں پیدا ہوئی۔ دائی نے اماں کو بتایا کہ اللہ نے آسمان سے حوا کا بچہ بھیج دیا ہے مگر وہ لڑکا ہے نہ لڑکی۔ اماں نے ابا جان کو اندر بلالیا اور روتے ہوئے دائی والی بات بتادی۔ ابا نے پتھر سے دائی کا سر پھوڑ دیا۔ سونے کے زیورات اور بہت سارے کرنسی نوٹ بوڑھی دائی کے لباس میں چھپا دیئے۔ اس کو پیٹھ پر لادا اور گاؤں کے راستے پرلے جاکر گہری کھائی میں لڑھکا دیا"۔(۳۶)

یہ جرم کا واقعہ جس کا ذکر ناول نگار نے اپنے ہاں کیا ہے اپنی مثال آپ ہے کہ مجرم نے جرم کر کے خود ہی جس کا قاتل تھا، معاف کر دیا الٹا اس کو پیسے اور زیور بھی دے دیئے۔ محمد الیاس نے یہاں پر فیودر دستو ئفیسکی کے تجربات کی طرح تجربہ کیا ہے جس طرح انہوں نے برادرز کرمازوٗف اور جرم و سزا میں کیا ہے کہ قاتل مقتول کے ساتھ ہمدردی دکھا رہا ہے۔ ہمارے معاشرے میں ایسے ہی ہوتا ہے یہ اس کی ہلکی سی تصویر ہے۔ بعض ایسے سیاسی قتل جیسے کراچی کے عمران فاروق کے قاتل ہی اس کے کفن دفن کا بندوبست کر رہے تھے اور اس کی بیوی کو یہ دھمکی بھی دی کہ ہم خود ہی اس معاملے کو ہینڈل کرلیں گے۔ آپ نے بس چپ رہنا ہے ورنہ آپ کو بھی گولی مار دی جائے گی۔ ناول نگار تو واقعے کو پیش کرتا ہے آگے معاشرے کا کام ہے کہ وہ اس سے عبرت حاصل کریں۔ یہی ایک صلہ ہوتا ہے ناول نگار کا۔ حکومت کو چاہیے کہ تعلیم کو مفت کرے تاکہ معاشرے میں شعور آئے اور معاشرہ جرائم سے پاک ہو۔

حوالہ جات

۱۔ شیدائی یوسف، پروفیسر، مطالعہ اخلاقیات، عزیز پبلشرز، اردو بازار، لاہور، ۱۹۸۳ء، ص ۱۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۹

۳۔ الجاحظ، کتاب القیان، (مترجم)، خالد لطیف، کلاسیک پبلی کیشنز، مال روڈ، لاہور، ۲۰۰۳ء، ص ۵

۴۔ سید احمد دہلوی، مولوی، فرہنگ آصفیہ، سنگ میل پبلی کیشنز، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۲ء، ص ۲۴۹

۵۔ منٹو، سعادت حسن کے مضامین، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۶ء، ص ۱۱۰

۶۔ فتح پوری، نیاز، ترغیبات جنسی یا شہوانی، آواز اشاعت گھر، لاہور، ۲۰۰۴ء، ص ۱۰

۷۔ بٹ، محمد احسن، (مترجم)، اے ہسٹری آف پراسٹی ٹیوشن (جسم فروشی کی تاریخ)، لاہور، نگارشات پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء، ص ۴۰

۸۔ Larry. J.Siegel, Ph.D, Wordsworth Balmont USA. 2000, P.431

۹۔ جاوید یونس، کنجری کا پل، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، جولائی ۲۰۱۱ء، ص ۲۵

۱۰۔ ایضاً، ص ۸۷

۱۱۔ ایضاً، ص ۹۹

۱۲۔ ایضاً، ص ۹

۱۳۔ ایضاً، ص ۱۰۶

۱۴۔ الیگزینڈر کیرن، یاما، طوائف، (مترجم)، ن۔م۔راشد، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۵ء، ص ۳۸

۱۵۔ جاوید یونس، کنجری کا پل، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۱ء، ص ۱۳۰ تا ۱۳۱

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۴۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۵۲

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۶۷ تا ۱۶۸

۱۹۔ ایضاً، ص ۱۸۵

۲۰۔ ایلف شفق، چالیس چراغ عشق کے، (مترجم)، ہما میر، جمہوری پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۳۷

۲۱۔ شیخ محمد اکرام، رودِ کوثر، سروسز بک کلب، جی ایچ کیو، راولپنڈی ۲۰۰۳ء، ص ۴۱۱

۲۲۔ نسیم انجم، نرک، میڈیا گرافکس، کراچی ۲۰۰۷ء، ص ۳۴

۲۳۔ ایضاً، ص ۴۲

۲۴۔ ایضاً، ص ۶۳

۲۵۔ ایضاً، ص ۶۷

۲۶۔ ایضاً، ص ۶۹
۲۷۔ محمد الیاس، حبس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۳۵
۲۸۔ ایضاً، ص ۳۳
۲۹۔ ایضاً، ص ۱۵۲ تا ۱۵۳
۳۰۔ گورکی، میکسم، ماں، دارالاشاعت ترقی ماسکو، روس، اشاعت ن۔ د، ص ۴۸۴
۳۱۔ محمد الیاس، حبس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۸
۳۲۔ ایضاً، ص ۲۴۵
۳۳۔ ایضاً، ص ۳۹۰
۳۴۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص ۲۷
۳۵۔ ایضاً، ص ۴۱۳
۳۶۔ ایضاً، ص ۴۶۴ تا ۴۶۵

باب پنجم:

منتخب اردو ناولوں میں سیاسی اور جنگی جرائم کی پیش کش

جنگی جرائم کی مختصر تاریخ:

انسانوں کے درمیان جنگوں کے آغاز کے ساتھ ہی جنگی جرائم کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ جب سے دنیا میں گروہی زندگی کا آغاز ہوا ہے تب سے ایک گروہ دوسرے گروہ کے ساتھ جنگ کرتا آیا ہے۔ ایک قبیلہ اگر دوسرے قبیلے کا بندہ قتل کرتا تو دوسرا قبیلہ بھی کوشش کرتا کہ مقتول کا بدلہ قتل کی صورت میں لیا جائے۔ زیادہ تر صلح لین دین کے معاملے پر ختم ہو جاتی۔ وقت کے ساتھ جنگوں میں تبدیلی آتی گئی، لوگوں نے ترقی کی اور صلح کا طریقہ کار تبدیل ہوتا گیا۔ اس سے پہلے حملہ آور مردوں کو قتل کر کے عورتوں اور بچوں کو غلام بنا لیتے اور مفتوحہ علاقے کے وسائل لوٹ لیتے۔ اسلام پہلا مذہب ہے جس نے سب سے پہلے مفتوحہ علاقے کی عوام کے جان و مال کو تحفظ دیا۔ اسلام کے ابتدائی دس سالوں میں ۲۷ غزوات اور ۵۶ سریات ہوئے جن میں مسلمان شہداء کی تعداد ۲۴۳ اور ۴۶۲ کفار جہنم واصل ہوئے، یہ کل تعداد ۷۰۵ بنتی ہے۔ پورا خطہ عرب مسلمان ہوا، دنیا کی تاریخ کی ایک زبردست مثال ہے۔ اسلام نے جنگ کے جو اصول ۱۴۰۰ء سال پہلے مقرر کیے آج کی مہذب دنیا بھی انھیں اصولوں کے مطابق قانون بنا رہی ہے یعنی دورانِ جنگ قیدیوں کا خیال رکھنا، بچوں، عورتوں اور بوڑھوں کو تحفظ دینا، شہری املاک، فصلوں کو تحفظ دینا، پھل دار درخت اور پانی کو نقصان سے بچانا شامل ہے۔

پہلی جنگِ عظیم ۱۹۱۴ء تا ۱۹۱۸ء، دوسری جنگِ عظیم ۱۹۳۹ء تا ۱۹۴۵ء میں پوری دنیا میں کروڑوں لوگ قتل ہوئے۔ دنیا نے ایٹم بم کی تباہی دیکھی۔ اقوامِ عالم نے سوچا کہ یہ کب تک ایسا ہو گا۔ ۱۹۴۵ء میں اقوامِ متحدہ کی بنیاد رکھی گئی۔ ۱۹۴۹ء میں جنیوا معاہدہ ہوا جس میں دنیا کے ۱۶۰ ممالک نے دستخط کیے۔ جنگی جرائم کی تعریف کی گئی۔ جنگی جرائم کیا ہیں ان کو وضاحت کی گئی۔

۱۔ غیر فوجی افراد کا قتل عام کرنا۔

۲۔ شہری آبادی کا قتلِ عام کرنا۔

۳۔ نسل کشی کرنا۔

۴۔ مزدوری کرانے کے لئے جبری بھرتی کرنا۔

۵۔ عورتوں کی آبروریزی کرنا۔

۶۔ ہسپتالوں اور سکولوں پر بمباری کرنا۔

۷۔ جنگ زدہ علاقے میں انسانوں کے ساتھ بدترین انسانی سلوک کرنا۔[1]

عالمی فوجی عدالت جو کہ ہالینڈ کے شہر ہیگ میں ۱۹۹۸ء میں قائم کی گئی۔ ۲۰۰۲ء میں سب سے پہلے یوگوسلاویہ اور روانڈا کے جنگی مجرموں کو سزا دے چکی ہے لیکن بڑے جنگی مجرم جس میں امریکہ اور اسرائیل سرِفہرست ہے عدالت کو مانتے ہی نہیں، نہ اس کے قوانین پر عمل کرتے ہیں۔ ان جنگی جرائم میں شامل جرائم یہ ہیں جن کے لیے یہ خصوصی طور پر عدالت قائم کی گئی۔

۱۔ نسل کشی۔

۲۔ انسانیت کے خلاف جرائم۔

۳۔ جارحیت کا جرم۔

۴۔ کسی معاہدے کی خلاف ورزی کرنا۔

۵۔ ایسے لوگ جو جنگ میں شریک نہ ہوں ان پر ظلم ڈھانا۔

۶۔ جنگی قیدیوں پر ظلم کرنا اور ان کے حقوق کا خیال نہ رکھنا۔

۷۔ ممنوعہ ہتھیاروں کا استعمال کرنا۔[2]

افغانستان میں اقوامِ عالم اور خاص طور پر امریکی جنگی جرائم اور فلسطین میں اسرائیل جرائم پر آج تک کوئی جنگی ٹریبونل نہیں بنا کیونکہ یہ طاقتور ممالک ہیں اور باقی دنیا پر اپنا اثرِ رسوخ استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جنگی جرائم پر باقی دنیا زبانی مذمت سے کام لیتی ہے۔

سیاسی جرائم تین قسم کے ہوتے ہیں ایک جس کا حکومت کے قائم شدہ قانون کے خلاف بغاوت، سورش یا سازش، ملک کے خلاف جاسوسی، سرکاری املاک کی توڑ پھوڑ۔ دوسرے وہ جرائم جن کا تعلق عام قانون کی خلاف ورزی ہو مثلاً جعلی کرنسی چھاپ کر ملکی خزانے کو نقصان پہنچانا، اسمگلنگ، ناجائز درآمد، برآمد کرنا، ٹیکس کی چوری، کالا دھندہ، چور بازاری وغیرہ۔ یہ سب جرائم ایسے ہیں جو ملک کو اجتماعی طور پر نقصان پہنچاتے ہیں۔ سیاسی جرائم کی تیسری قسم کا تعلق ملک کی نظریاتی سرحدوں کی خلاف ورزی ہے۔ مثال کے طور پر اشتراکی ممالک جیسا کہ روس، چین وغیرہ میں جمہوریت کی تبلیغ کرنا یا امریکہ، برطانیہ میں اشتراکی اصولوں کا پرچار کیا جائے تو

حکومتیں ایسے افراد کے خلاف غداری یا بغاوت کے تحت مقدمہ چلاتی ہیں یا منتخب حکومت پر شب خون مار کر اقتدار پر قبضہ کیا جائے۔ یہ بھی آرٹیکل چھے کے تحت آتا ہے جو کہ ایک سیاسی جرم ہے۔

جنگی جرائم سے مراد یہ ہے کہ دوران جنگ کوئی بھی دشمن کا فوجی یا گارڈ شکست کھانے کے بعد گرفتار ہو جائے تو اس کے حقوق کا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اقوام متحدہ کے تحت ہونے والے جنیوا معاہدہ ۱۹۴۹ء کے تحت ایسا کرنے کا پابند ہے۔ اس اصولوں کی پاسداری نہ کرنا جنگی جرائم میں آتا ہے جس کی سزا عمر قید یا موت ہے۔

اردو ناول نگاروں نے افغان جنگ پر بہت کچھ لکھا ہے۔ ان میں سرفراز بیگ کا "پس آئینہ"، شفق کا ناول "بادل"، اکرام بریلوی کا "حسرت تعمیر"، مشرف عالم ذوقی کا "آتش رفتہ کے چراغ" مستنصر حسین تارڑ کا قلعہ جنگی شامل ہیں۔ اس کے علاوہ بھی انگریزی اور اردو ناول نگاروں نے افغان جنگ کے دوران امریکی جنگی جرائم پر لکھا ہے جو اس نے افغانیوں کے ساتھ کیے۔ میں نے اپنے چار منتخب ناولوں میں جنگی اور سیاسی جرائم پر بحث کی ہے۔ ناولوں میں اسمگلنگ، لاقانونیت، آئین کی موت پر بحث کی گئی ہے۔ سب سے پہلے ان میں جنگی جرائم پر بحث کی گئی ہے جو درج ذیل ہے:

الف۔ ناول "قلعہ جنگی" میں جنگی جرائم:

مستنصر حسین تارڑ اردو کے ممتاز ادیب ہیں۔ ان کے سفر نامے اور ناول اپنی مثال آپ ہیں۔ ناول کا خمیر زیادہ تر مقامی مٹی سے اٹھاتے ہیں۔ ان کا ناول "قلعہ جنگی" ۲۰۰۲ء میں منظر عام پر آیا۔ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور نے اسے شائع کیا۔ اس ناول کا موضوع افغان جنگ اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل ہیں جنھوں نے پاکستان اور افغانستان کو براہ راست متاثر کیا۔ اس المیے کو انھوں نے سات کرداروں کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ یہ تمام کردار جو کہ دنیا کے مختلف ممالک سے تعلق رکھتے تھے، قید ہو کر "مزار شریف" کے مشہور "قلعہ جنگی" میں پہنچتے ہیں۔ ناول کا لوکیل اسی " قلعہ جنگی "کا تہہ خانہ ہے۔ میرا موضوع صرف اس ناول میں پائے جانے والے جنگی جرائم کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینا ہے۔ اس جنگ میں امریکہ، شمالی اتحاد، امریکی اتحادی اور دوسری طرف طالبان دنیا بھر سے آئے ہوئے ہیں جہادی مسلمان اور پاکستان سے جہاد کی غرض سے پہنچنے والے لوگ تھے۔ زیادہ تر جنگی جرائم کا ارتکاب امریکہ، اس کی اتحادی افواج اور شمالی اتحاد کے کمانڈروں نے کیا۔ ۲۱۶ صفحات مشتمل اس ناول کا آغاز ہی ان جنگی جرائم سے پردہ اٹھاتا ہے جو امریکیوں نے افغانستان کے عوام خصوصاً جو بچوں اور عورتوں پر کیے:

"ان افغان بچوں کے نام جو بارودی سرنگوں کا شکار ہو کر اپاہج ہو گئے اور جو کسی فٹ بال میچ میں کھلاڑی نہیں ہوسکتے صرف گول کیپر ہوسکتے ہیں"۔ (۳)

اردو ادب میں افغان جنگ پر نسبتاً کم لکھا گیا ہے لیکن جو لکھا گیا وہ کھل کر لکھا گیا ہے۔ غالباً دوسرے ناولوں جن میں اکرام بریلوی کا ساتواں ناول "حسرت تعمیر" ۲۰۰۶ء میں منظر عام پر آیا۔ شفق کا ناول "بادل"، سرفراز بیگ کا "پس آئینہ" ۲۰۱۳ء، سلمان عبد الصمد کا ناول "لفظوں کا لہو" ۲۰۱۶ء، مشرف عالم ذوقی کا ناول "آتش رفتہ کے سراغ" ۲۰۱۰ء کا دوسرا حصّہ شامل ہیں۔ انگریزی ادب میں بھی ان پر بہت لکھا گیا ہے۔ لیکن مستنصر حسین تارڑ کا ناول "قلعہ جنگی" امریکہ اوران کے اتحادیوں کے ان جنگی جرائم سے پردہ اٹھاتا ہے جو دنیا کو پتہ تو تھا لیکن وہ اس پر بات کرنے سے گریز کرتے تھے۔ مزار شریف سوویت یونین کے قبضہ سے لے کر امریکہ کے قبضے تک سوویت اورامریکی نواز حکومتوں کا مضبوط گڑھ رہا ہے۔

آبادی کا زیادہ تر حصّہ ازبک اور تاجک قبائل پر مشتمل ہے۔ ان کی زبان فارسی ہے۔ سوویت یونین کے دور میں اور امریکی ۲۰ سالہ دور میں ان کے اہم کمانڈر عبد الرشید دوستم کی حکومت رہی ہے جو اپنی سفاکی کی وجہ سے مشہور تھا۔ ناول" قلعہ جنگی "اسی کی ریشہ دوانیوں اور جنگی جرائم کا اہم باب ہے جس کو ناول جیسی صنف ادب میں مستنصر حسین تارڑ نے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ جنگ افغانستان میں شمالی اتحاد اور امریکہ کا طالبان پر ظلم و تشدد سفاکی اور بے رحمی، ڈیزی کٹر بموں اور ہتھیار ڈالنے والے افراد کا قتل عام" قلعہ جنگی "کا اہم موضوع ہے۔ اس دنیا میں اگر کوئی ملک دوسرے ملک سے جنگ جیت جاتا ہے تو جنیوا یا بین الاقوامی امن معاہدوں کی پاسداری کرنا پڑتی ہے۔ لیکن یہاں ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ ہتھیار ڈالنے والوں پر ظلم اور قتل جنہوں نے بین الاقوامی قوانین کا احترام بھی نہیں کیا۔ ناول" قلعہ جنگی "کی بنیاد بھی ۲۵۔ نومبر ۲۰۰۱ء سے یکم دسمبر ۲۰۰۱ء تک کے جرائم ہیں جن کا مرتکب امریکہ بہادر اور شمالی اتحاد کے لوگ ہوئے ہیں۔ اوپر سے ہوائی جہاز ڈیزی کٹر بم پھینکتے اور نیچے زمین پر عبد الرشید دوستم کے بھیڑیے نما کارندے لوگوں کو ذبح کرتے تھے اور ان کا خون دیکھ کر اپنا دل بہلاتے تھے۔ طالبان بکھر گئے تھے کچھ نے ایران تو کچھ نے پاکستان میں آکر جان بچائی جو طالبان کے گروہ ان اتحادی افواج کے ہتھے چڑھ گئے ان نوجوانوں پر بہت ظلم ہوا۔ ہوا بند کنٹینروں میں ان کو بند کر کے مارا گیا۔ ان کی خواتین کے اعضاء کاٹ کر ڈھیر لگائے گئے تھے۔ وہ طالبان نوجوان جو شہید کیے گئے ان کے مردہ جسموں میں بارود بھرا جاتا اور پھر آگ لگائی جاتی۔ بارود جب پھٹتا تو لاشیں حرکت میں آتیں تو

عبدالرشید دوستم دیکھ کر خوش ہوتا اور اسے ''طالبان ڈانس'' کا نام دیتا۔ دشت لیلیٰ میں جو ہزاروں پگڑیاں بکھری پڑی تھیں ہفت روزہ ٹائم میگزین نے ٹائٹل پر ان کی پگڑیوں کی تصویر شائع کی۔ اس ناول ''قلعہ جنگی'' میں بھی دہشت لیلیٰ اور بکھری ہوئی پگڑیوں کا ذکر بڑا نمایاں ہے۔ پھر ان پگڑیوں پر ٹائم میگزین نے لکھا کہ (End of the Talban)طالبان کا اختتام ہو گیا ہے۔ دس ہزار کے قریب طالبان اپنے ہی ملک کی جیلوں میں بند کر دیے گئے جو اہم کمانڈر تھے ان کو کیوبا کی بدنامِ زمانہ جیل گوانتاموبے بھیج دیا گیا۔ ان تمام قیدیوں کے حالات کا جائزہ ''قلعہ جنگی'' میں پیش کیا گیا ہے۔ اس ناول کی بدولت ''قلعہ جنگی '' کا خوف ناک واقعہ تاریخ ادب کا ایک حصّہ بن گیا ہے جس طرح ۱۳۔ اپریل ۱۹۱۹ء کو امرتسر جلیاں والا باغ کا واقعہ اردو فکشن کا حصّہ بن جانے کے بعد امر ہو گیا۔ اردو ادب میں افغانستان کے پس منظر میں قابل رشک مواد موجود نہیں ہے لیکن اردو ناول نگاروں نے پھر بھی اس میں خاطر خواہ اضافہ کیا۔ اس کی ایک مثال ''قلعہ جنگی'' ہے۔ ناول کے سات مرکزی کردار ہیں جن میں مرتضیٰ بیگ، ابو طالب چی چی، اللہ بخش، گل شیر، عبدالوہاب، ہاشم میر اور عبدالحمید جانی واکر شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ایک کردار گھوڑے کا بھی ہے۔ کہانی کا آغاز بھی گھوڑے سے ہوتا ہے۔ کہانی کا یہی انوکھا پن اس کو ناول کی شکل میں ڈھالتا ہے۔ یہی سات مرکزی کردار ''قلعہ جنگی'' کے تہہ خانے میں بھوک اور پیاس کی وجہ سے موت انھیں قریب سے نظر آ رہی ہے۔ گھوڑے کے ہنہنانے کی آواز ان میں زندگی کی کرن کی طرح دکھائی دیتی ہے۔ پھر اس کو پکڑنے اور کھانے کے مراحل ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ حلال ہے، کوئی کہتا ہے کہ یہ حرام ہے۔ لیکن یہ گھوڑا مسلسل کہانی کے آگے چلتے ہوئے جزو لاینفک ہے اور فکری اور ذہنی حوالے سے دیکھیں تو یہ گھوڑا ''عورت'' کا روپ دھار لیتا ہے جس کے حلال اور حرام کا فیصلہ کرتے ہوئے چھے کردار اسے برتنے کا فیصلہ کرتے ہیں۔ صرف ایک امریکی کردار عبدالحمید جانی واکر آخری وقت تک اسے استعمال کرنے سے گریز کرتا ہے۔ ان مجاہدین کا تعلق مختلف ممالک سے ہے، ہر ایک کی کہانی الگ ہے کسی کا باپ جرنیل ہے تو کوئی ماں باپ کی اکلوتی اولاد ہے۔ کوئی چیچن باشندہ ہے تو کوئی امریکی اور کوئی برطانیہ کا رہائشی تو کسی کا باپ قبائلی علاقے میں ٹریننگ کیمپ چلاتا ہے۔ ان کرداروں میں مدرسے کے پڑھے لکھے نوجوان اور ''لندن سکول آف اکنامکس'' کے طالب علم تک شامل ہیں۔ یہ لوگ جب دوستم ملیشیا کے سامنے ہتھیار ڈالتے ہیں تو ان کے ساتھ انتہائی غیر انسانی سلوک کیا جاتا ہے۔ اس کی تصویر ناول نگار نے اس طرح ہے کہ کہ قلعہ کے اندر کس طرح ان کی حالت ہے۔ ہیں تو یہ جنگی قیدی:

"دیئے جلانے کون آئے گا بیوقوف مرتضیٰ کا لہجہ انتہائی درشت تھا۔ مردوں اور لاشوں میں فرق ہوتا ہے۔ اللہ بخش ۔۔۔۔۔۔ مردوں کو اعزاز ملتا ہے کفن اور کافور کا ۔۔۔۔۔۔ نہلائی دھلائی اور فاتحہ کا ۔۔۔۔۔۔ کندھے پر اٹھائے جانے کا ۔۔۔۔۔۔ کلمہ شہادت اور آہ وزاری اور بین کا ۔۔۔۔۔۔ اور ایک قبر ملتی ہے اور بند کفن کھول کر اُن کا چہرہ کعبہ کی جانب کیا جاتا ہے۔ مٹی ڈالنے سے پہلے تو ایسے مردوں کے سرہانے جمعراتوں کو چراغ جلتے ہیں ۔۔۔۔۔۔ ہمارے اوپر "قلعہ جنگی" کے ٹیلے پر جو سینکڑوں لاشیں پڑی ہیں، انھیں صرف چاندنی ڈھکتی ہے اور ان کے چہرے کچھ الگ ہو چکے ہیں اور جو ابھی تک جکڑے ہوئے ہیں ان کا منہ کعبے شریف کی جانب نہیں ہے تو ایسی لاوارث لاشوں کی جمعرات نہیں ہوتی"۔(۴)

یہ وہ باتیں ہیں جو سات قیدی آپس میں کر رہے تھے۔ ان لوگوں کو یقین دلایا گیا تھا کہ ہتھیار ڈالنے پر ان سے انسانی سلوک کیا جائے گا۔ لیکن جوں ہی یہ لوگ ہتھیار ڈالتے ہیں ان پر سختیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ ان میں سے بیشتر کے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اور زمین پر اوندھے پڑے خاک چاٹ رہے تھے۔ کچھ کے منہ میں جو سونے کے خول جو دانتوں پر چڑھائے ہوئے تھے انتہائی بے دردی سے کیل اور ہتھوڑے سے جبڑا اکھاڑ کر نکالے گئے تھے۔ دوستم کے فوجی اگر کسی لاش کے گلے میں گرم مفلر ملتا تو وہ بھی اتار لیتے۔ ایک مجاہد جو کہ شہید ہو چکا تھا، کے پاؤں میں مہنگا جوگر تھا وہ بھی اتار لیا گیا۔ امریکی بمباری جو کہ عبدالرشید دوستم کی درخواست پر ہوئی تھی کہ مائی باپ (امریکہ) یہ جنگجو ہمارے قابو میں نہیں آرہے اوپر سے بمباری کرو سو انہوں نے کی۔ سینکڑوں کی تعداد میں لاشیں پڑی ہیں جیسے کسی بے رحم سرجن نے ان کا پوسٹ مارٹم کر کے انہیں ویران جگہ پھینک دیا گیا ہو۔ اس سے بڑھ کر جنگی جرائم اور کیا ہوں گے، کہاں گئے وہ اصول جن کا دنیا کو درس دیا جاتا ہے۔ ناول میں ان جرائم کی داستان کو اس طرح قلم بند کیا گیا ہے، جو ایک اعلیٰ فکشن نگار کا منہ بولتا ثبوت ہے:

"کچھ کی ٹانگیں اور کچھ کے کمر سے اوپر والے دھڑ مٹی میں دفن تھے جیسے وہ ریت میں کھیلتے بچے تھے۔ چھپن چھپائی کھیلتے اپنی ٹانگیں چھپاتے تھے اپنے چہرے روپوش کرتے تھے۔ انہیں انسانی ہاتھوں نے نہیں بی باون طیاروں نے نیم دفن کیا تھا۔ صحن میں جگہ جگہ گہرے گڑھے تھے جیسے وہاں مٹی کے آتش فشاں اُبل کر ٹھنڈے ہو گئے ہوں۔ ایسے گڑھے تخلیق کرنا صرف ڈیزی کٹر ایسے منی ایٹم بم اور بنکر بسٹر کے بس کی بات نہیں"۔(۵)

ناول کے کرداروں کے مکالمے کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ یار یہ لنگڑاتا ہوا گھوڑا اپنے حسین علیہ السلام کی تلاش میں ہے۔ کوئی یہ کہہ رہا ہے کہ مرنے والے کالے، بھورے اور سفید رنگ کے لوگ تھے ان کے سر

پر پگڑیاں بھی ایسی ہی تھیں مگر ڈیزی کٹر بموں نے ان کے اعضاؤں کو کیسے اڑا کر دور کر دیا ہے۔ چاند کی روشنی جب مرے ہوئے چہروں پر پڑتی ہے تو گویا یہ مسکرا رہے ہیں۔ اپنے بے وفا ساتھی طالبان کو کوس رہے ہیں کہ انہوں نے شہر خالی کرنے سے پہلے ہم سے مشورہ تو کیا ہوتا۔ یہاں لاشیں ہی لاشیں ہیں گویا یہاں چوکیدار کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ لاش نے کون سا بھاگ جانا ہوتا ہے۔ اس کا اظہار ناول نگار نے یوں کیا ہے۔

"انہوں نے ہمارے ساتھ مشاورت بھی نہیں کی۔ ہمارے طالبان بھائیوں نے اپنے شمالیوں کے ساتھ قندوز کے بعد ہتھیار ڈال دینے کا معاہدہ کر لیا۔ چی چی بولا اس کے لہجے میں کڑواہٹ تھی"۔ (۶)

یہ تمام جنگی جرائم پورے افغانستان میں جاری تھے لیکن ناول میں صرف مقدس شہر جس کے بارے میں ناول میں بھی لکھا ہے کہ مزار شریف افغانستان کے صوبہ بلخ کا دارالحکومت ہے۔ شہر کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی درگاہ ہے۔ نیلے رنگ کا یہ خوبصورت مزار ہے اور ساتھ نیلے سنگ مرمر کی مسجد ہے جس کے صحن میں روضہ ہے جو کہ سلجوقی (بادشاہ سنجر ۱۱۱۸ء تا ۱۱۵۷ء) نے اس کو تعمیر کیا تھا۔ یہ شہر بزکشی اور جشن نوروز کی وجہ سے بھی بہت مشہور ہیں۔ مزار کے اوپر (آرام گاہ حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالی عنہ) لکھا ہوا ہے لیکن مورخین کے مطابق یہ مزار مشہور بزرگ علی بلخی رحمتہ اللہ علیہ کا ہے جبکہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا مزار نجف عراق میں واقع ہے۔ مارچ ۱۹۹۲ء میں طالبان نے اس شہر پر قبضہ کیا۔ ۲۰۰۱ء میں امریکی بمباری نے شہر کو تباہ کیا پھر دوبارہ عبدالرشید دوستم اس پر قابض ہو گئے لیکن ۲۰۲۱ء کی میں اس کے کمانڈر اسماعیل نے ہتھیار ڈال دیے اور دوبارہ شہر طالبان کے کنٹرول میں چلا گیا۔ طالبان نے سب کو معاف کر دیا۔ دوستم ملک سے فرار ہو گیا۔ ناول میں سوویت افغان وار کا نقشہ کھینچا گیا ہے کہ کس طرح امریکی اسلحہ ڈالروں سے ہر ایک نے اپنی تجوریاں بھریں۔ کس طرح اسلحہ سے بھرے ہوئے کنٹینرز کراچی سے ننگرہار تک جاتے تھے۔ ڈالر اور ریال کی پیٹیاں ہر وقت ان کے پاس رہتی تھیں۔ گاڑیاں، اسلحہ اور سٹنگر میزائل ان کی ملکیت تھے۔ اس زمانے میں سیٹنگرز میزائل پر ایک لاکھ روپے خرچہ آتا تھا جبکہ یہ میزائل کروڑوں کے ہیلی کاپیٹر اور بمبار طیارے کو گرا دیتا تھا۔ یہ لوگ ان میزائلوں کو دوسرے ممالک کو بیچ بھی دیتے تھے۔ جس طرح انہوں نے ایران کو سولہ میزائل فروخت کر دیے تھے تو امریکہ بہت ناراض ہوا۔ ناول میں اس بات کا اظہار اس طرح ہے:

"ایک سٹنگر کو بیچنے سے دو تین فیکٹریاں خریدی جا سکتی تھیں"۔ (۷)

یہ تھا ذکر جو کہ ناول نگار نے افغان اور سویت وار کا کیا ہے کہ کس طرح ان لوگوں نے پیسہ کمایا اور اسلحہ بیچنے جیسے جرائم کیے۔ قلعہ جنگی میں مصنف نے اس جرم سے پردہ بھی ہٹایا ہے کہ ہمارے مذہبی ٹھیکیداروں نے کس طرح مرنے کے لیے کچی عمر کے لوگوں کو جہاد کے نام پر اکسایا۔ سویت جنگ کے دوران اسلام کی مقدس جہادی روح کو عالمی طاقتوں نے جدید مہارت سے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اسامہ بن لادن (۱۹۵۷ء-۲۰۱۱ء) اور دنیا بھر سے مجاہدین اکٹھے کیے۔ جب خود سپر پاور بن گیا تو وہی لوگ مجرم ٹھہرے۔ افغانستان کی دھرتی کو میدان جنگ بنانے والے اپنی خالص جنگیں دوسروں کی سرزمین پر لڑتے رہے اور زمین کے اپنے بیٹے ہجرت پر مجبور ہو کر لاوارث قرار پائے۔ اس ناول میں جنگی جرائم کا سبب وہ عالمی طاقتیں ہیں جو دوسرے ممالک کے معاملات میں مداخلت کو جرم قرار دیتے ہیں۔ اگر دوسروں کے معاملات میں مداخلت جرم ہے تو دوسرے ممالک کے لوگوں کا پرائی زمیں پر جنگ لڑنا تو ناقابل معافی جرم ہے۔ ایسی چیز کو ناول میں جرم قرار دیا گیا ہے۔ پھر انہی لوگوں یعنی اسامہ بن لادن اس کی تنظیم "القاعدہ" کو ختم کرنے کے لیے یہ جنگی جرائم کیے گئے تاکہ دوسرے مسلم ممالک عبرت حاصل کریں اور ان کی طاقت سے ڈر جائیں۔ انہی جذبات کی عکاسی ناول میں نظر آتی ہے کہ اصل مجرم کون ہے :

> "ان میں سے جو سرحد پار سے آئے تھے اور صرف تلواروں سے مسلح تھے اور انہیں اس جذبے سے سرشار کیا گیا تھا کہ اگر ایمان مضبوط ہو تو کفر کو تلوار سے بھی زیر کیا جاسکتا ہے لیکن کفر تھا کہ آسمانوں پر ہی اڑان کر کے چلا جاتا تھا۔ نیچے آتا تو وہ اس پر وار کر کے اپنے ایمان کی پختگی کا مظاہرہ کرتے ۔۔۔۔۔۔۔ مومن تو بے تیغ بھی لڑ سکتا تھا۔ ان کے پاس پھر زنگ آلود تلواریں تھیں"۔ (۸)

اصل مجرم وہ مولوی تھے جن کے وعظ سے متاثر ہو کر یہ لوگ جہاد کے لیے گئے تھے۔ وہ بھی نہتے۔ پاکستان میں مولوی حضرات جیسا مرضی فتویٰ دیں کوئی ان کو پوچھنے والا نہیں۔ یہ لوگ مذہب کی آڑ میں غیر قانونی کام کرتے ہیں۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خان کے مطابق جو وہ "قلعہ جنگی" کے بارے میں کہتے ہیں، یہ سیاسی رجحان کا ناول ہے۔ یہاں کئی سوالات اٹھائے گئے ہیں جیسے جہاد کا مستقبل؟ کون صحیح ہے، کون غلط؟ عوام کو سزا کیوں ملتی ہے؟ جنگ کا نتیجہ کیا ہے؟ بڑی طاقتوں کے کھیل میں اصل نقصان کس کا ہوتا ہے؟ اس قسم کی جنگ کی ہولناکی اور بھرپور انفرادی واجتماعی المیے! تارڑ نے ایک بڑے کرب کے واقعات کو آشکار کیا ہے۔

ب۔ افغانستان میں مغربی افواج کے جنگی جرائم:

۲۰۰۱ء میں افغانستان پر قبضے کے بعد امریکہ اور اس کے اتحادی نیٹو اور دوسرے چالیس ممالک کے فوجی جو امریکی سربراہی میں کام کر رہے تھے۔ انہوں نے بے گناہ افغانیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ جہاں بھی طالبان کے نام پر آپریشن کیا جاتا طالبان تو بھاگ جاتے لیکن بے گناہ شہری خصوصاً عورتیں اور بچے امریکی ڈرون حملوں اور ہوائی بمباری کا نشانہ بنتے۔ عالمی میڈیا بھی ان کے غیر انسانی رویے اور جھوٹ کو ظاہر کرنا شروع ہو گیا جس سے تشویش بڑھتی گئی کہ نام تو طالبان کا لیا جاتا ہے لیکن مرنے والے عام لوگ ہی ہوتے ہیں۔ میں اپنے اس مقالے میں صرف آسٹریلوی ماہر عمرانیات ڈاکٹر سمنتھا کی تحقیقی رپورٹ کو عیاں کروں گا جس نے صرف اپنے ہم وطن سپاہیوں کے جنگی جرائم سے پردہ اٹھایا ہے۔وہ ستمبر ۲۰۱۵ء میں افغانستان پہنچتی ہے۔ اپنے نوجوانوں اور فوجی افسروں کے انٹرویو کرتی ہیں کیونکہ افغانستان میں امریکہ اور برطانیہ کے بعد زیادہ فوج آسٹریلیا کی موجود تھی۔ عام طور پر دنیا میں امریکہ، برطانیہ، کینیڈا اور آسٹریلیا یکساں پالیسیاں اپناتے ہیں۔ ۲۰۰۱ء سے لے کر ۲۰۲۱ء تک آسٹریلیا کے ۲۶ ہزار فوجی افغانستان میں موجود تھے۔ یہ امریکہ کی عسکری تاریخ کی لمبی ترین جنگ تھی۔ دوران تحقیق محققہ کے سامنے ایسے پہلو بھی آئے جو بڑے خوفناک، سنگین اور غیر انسانی تھے۔ کئی ہم وطن سپاہی امریکی اور برطانوی فوجیوں کی طرح افغان شہریوں پر تشدد کرتے تھے۔ اس نے ڈیڑھ برس میں تقریباً سو سے زیادہ افسروں اور جوانوں سے انٹرویو کیے۔ انہوں نے اپنی رپورٹ مکمل کر کے کیمیل جو کہ آسٹریلوی آرمی چیف تھے ان کو بھیج دی۔ ایک کاپی اس نے انسپکٹر جنرل آف دی آسٹریلین ڈیفنس فورس پال بریٹن (Paul Breraton) کو دی کہ اس بات کی تحقیق کی جائے کہ ہمارے فوجی افغانستان میں غیر انسانی سلوک کر رہے ہیں جو کہ جنگی جرائم میں آتا ہے۔ پال بریٹین نے دلچسپی لے کر انکوائری کرائی اور رپورٹ اخبارات کو بھی دے دی۔ رپورٹ کے چند پہلوؤں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے کیونکہ پوری رپورٹ بہت لمبی ہے جس کو مقالے میں سمونا ممکن نہیں ہے۔ رپورٹ میں پہلی بات بہت سے مغربی ممالک کے فوجی بشمول آسٹریلیاں، افغانستان پہنچ کر نسل پرست، متعصب، مسلم دشمن اور ظالم بن گئے۔ انھیں جب بھی موقع ملا انہوں نے عام انسانوں کے ساتھ وحشیانہ اور ظالمانہ سلوک کیا۔ ان کو سرِ عام تشدد کا نشانہ بنایا جاتا۔ ایسی بے حسی دکھائی کہ افغان بچوں پر بھی رحم نہیں کھایا۔ انہیں قتل کر کے ہی دم لیا۔ غرض کہ افغانستان میں نام نہاد مہذب و تعلیم یافتہ مغربی فوجیوں نے اپنے جنگی جرائم سے شیطان کو بھی شرما دیا۔ جن افغان لوگوں کو یہ

حکومت میں لے کر آئے وہ انتہائی کرپٹ تھے۔ اپنے لوگوں کا خون بہانے میں انھیں لذت آتی تھی۔ جیسا کہ عبدالرشید دوستم اور ان کے اتحادی اشرف غنی، امر صالح، اسماعیل خان شامل تھے۔ وہ کروڑوں روپے خود کھا گئے۔ عوامی فلاح و بہبود کے لیے کچھ نہیں کیا۔ ڈاکٹر سمنتھا نے لکھا کہ اکثر ایسا ہوتا کہ مغربی فوج کا کوئی دستہ افغان گاؤں کو گھیر لیتا پھر گھر گھر تلاشی لیتے۔ سب مردوں اور لڑکوں کو علیحدہ کر کے رسیوں سے باندھا جاتا ساتھ ساتھ مار پیٹ بھی جاری رہتی۔ یہ کئی کئی دن تک سلسلہ جاری رہتا۔ جب افواج کے گاؤں سے رخصت ہونے کا وقت آتا تو فوجی تمام مردوں اور لڑکوں کو گولیاں مار دیتے۔ جب خواتین وہاں پہنچتیں تو ان کو اپنے پیاروں کی لاشیں ہی ملتیں۔ مقتولین کے ہاتھ پاؤں تو بندھے ہوتے اور عموماً گلے بھی کاٹ دیے جاتے۔ وہی جرائم جو قلعہ جنگی میں دکھائے گئے ہیں، ایک نوجوان فوجی نے ڈاکٹر سمنتھا کو بتایا کہ ایک بار اسپیشل فورسز کے جوانوں نے دو افغان لڑکوں کو پکڑ لیا۔ ان دونوں کی عمریں تیرہ اور چودہ سال ہوں گی۔ جوانوں نے تلاشی لی پھر ان کو طالبان کا مخبر قرار دیا گیا۔ اس بات کا ان کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا چنانچہ سب کے سامنے ان لڑکوں کے گلے خنجروں سے کاٹ دیئے گئے۔ یہ امریکی اور مغربی فوجی تھے۔ ان کے وہاں سے جانے کے بعد آسٹریلوی فوجیوں کو گند صاف کرنا پڑا۔ آسٹریلوی فوجی نے مزید بتایا کہ افغان بچوں کی لاشیں اور جسمانی اعضاء کو قریب دریا میں پھینک دیا گیا۔ آسٹریلیا کے مشہور اخبار "دی ایج" کو انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ:

"میرے لیے پریشان کن بات یہ تھی کہ افغانوں کے ساتھ یہ سب کچھ بڑے منظم طریقے سے ۲۰۰۱ء سے لے کر ۲۰۱۴ء تک مسلسل جاری ہے۔"(۹)

کوئی انسانی حقوق کی تنظیم ان کے خلاف آواز نہیں اٹھا رہی تھی۔ پہلے نوجوان فوجی انٹرویو سے گھبراتے تھے کہ ان کے آفیسر ان کو نوکری سے نکال دیں گے۔ اگر انہوں نے کسی کے ساتھ ایسی سچی بات کر دی۔ ڈاکٹر سمنتھا نے کہا کہ میرے لیے یہ حیران کن اور رونے والی بات تھی کہ جن لوگوں کو ہم دیوتا سمجھتے ہیں وہی جنگی مجرم ہیں۔ کیا یہ امریکیوں کی طرح وحشی ہو گئے ہیں جو انسان کو گوشت کی طرح کاٹ رہے ہیں۔ ایک فوجی افسر نے بتایا کہ "قلعہ جنگی "مزار شریف میں امریکی فوجیوں نے ہم سے بھی زیادہ ظلم کیے تھے جن کو سنا کر افسر بھی روتا تھا۔ مزید کئی افسروں نے بتایا کہ مغربی افواج افغانستان میں امن نہیں جنگی جرائم انجام دے رہے ہیں۔ مغربی و آسٹریلوی فوج کے جنگی جرائم کی ایک طویل کہانی ہے پھر یہ کہ کوئی اکیلا فوجی یا مخصوص فوج نے یہ کام نہیں کیا بلکہ تمام مغربی فورسز کے یہ مشترکہ جنگی جرائم ہیں۔ بے گناہ شہریوں کا قتل عام، قتل کرنے کے بعد ان پر اسلحہ رکھ دیا جاتا کہ یہ لوگ دہشت گرد ہیں۔ امریکی صدر ٹرمپ کی حکومت تمام ان تحقیقات میں رکاوٹ بن گئی تھی۔ آسٹریلوی جنرل کیمبل نے معافی مانگی۔ برطانوی میجر جو کافی عرصہ تک افغانستان میں تعینات رہا۔

اس کا نام تھا کرس گرین(Chris Green) جو کہ ضلع ہلمز میں تعینات رہا اس کا کہنا ہے کہ افغانستان میں تشدد اور قتل وغارت گری کے کلچر کو امریکی فوجیوں نے رواج دیا کیونکہ امریکی وہاں لیڈر تھے ان کی دیکھا دیکھی دوسری افواج نے بھی اس منفی کلچر کو اختیار کیا۔ وہ اس بات کو درست سمجھتے ہیں کہ افغانستان کی جنگ کا کوئی مقصد نہیں تھا۔ وہ لوگ بے گناہ تھے یہی خیالات برطانوی ملٹری انٹیلیجنس آفیسر فرینک لیڈووج (Frank Ledwidge)جو افغانستان، عراق اور لیبیا میں بھی تعینات رہا اس کا کہنا تھا کہ جتنا ظلم افغانیوں پر ہوا اتنا کسی قوم پر نہیں ہوا۔ اس میں مغربی افواج اوروار لارڈز زیادہ ملوث تھے۔ لیکن ظلم کی ایک حد ہوتی ہے۔ ۱۵۔ اگست ۲۰۲۱ء کو دوبارہ طالبان نے افغانستان کا کنٹرول سنبھال لیا اور سب دشمنوں کو معاف کر دیا۔ وہ بھی امریکیوں کا قتل عام کر سکتے تھے۔ جب امریکی آخری جہاز فوجیوں کو کابل ایئرپورٹ سے لے کر نکلا تو امریکی فوجیوں نے خوشی کے نہ نعرے لگائے۔ دراصل وہ اپنے سیاستدانوں کو مجرم خیال کرتے تھے جو ان سے ایسے کام کراتے تھے۔ ناول میں اصل مجرم امریکی سیاستدان ہیں، فوج نہیں ہے۔ فوج صرف جرائم کا محرک بنی تھی۔ "امریکہ ۸۶ ارب ڈالر کا اسلحہ چھوڑ کر بھاگ گیا لیکن ان کے جنگی جرائم کو مستنصر حسین تارڑ نے ناول کی صورت میں قلم بند کے اردو ادب میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے۔ عیسائی طاقتوں کو جب بھی موقع ملا انہوں نے بڑے ظلم سے دوسروں کا قتل عام کیا ہے۔ جیسا کہ وہ "بیسویں صدی کی ایک عظیم عیسائی طاقت" کی فوجوں نے منچوریا کے مقام پر بلاگو ویشنگ (Blagoyestaohenx) پر پانچ ہزار چینی مردوں، عورتوں اور بچوں کا قتل عام کیا وہ محتاج بیان نہیں"۔(۸)

جبکہ مسلمانوں کو ایسے کاموں سے منع کیا گیا ہے نا ہی ان کے عہد میں ناجائز قتل عام ہوا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو فوج بازنطینیوں کے خلاف روانہ کی اس سے مخاطب ہو کر آپ نے فرمایا:

> "ہمیں جو گزند پہنچائے گئے ہیں ان کا انتقام لیتے وقت ایسے بے ضرر لوگوں کو تنگ نہ کرنا جو اپنے گھروں میں خلوت نشین ہیں۔ طبقۂ اناث کی کمزوری کا لحاظ رکھنا، دودھ پیتے بچوں اور صاحب فراش بیماروں کو تکلیف نہ دینا، جو لوگ تمہارے مقابلہ پر نہ آئیں ان کے مکانوں کو مسمار نہ کرنا۔ ان کے ذریعہ معاش اور ان کے پھل دار درختوں کو تباہ نہ کرنا اور کھجور کے درختوں کو ہاتھ نہ لگانا"۔(۱۰)

اسی طرح جب حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ نے اپنے آقا صلی اللہ علیہ وسلم کی تتبع میں اپنے سردار کو یہ ہدایات دیں: "اے یزید اپنے لوگوں پر ظلم و ستم نہ کرنا اور پریشان نہ کرنا بلکہ اپنے تمام معاملات میں ان کا مشورہ لینا اور وہی کرنا جو حق اور مبنی بر انصاف ہو، کیوں کہ جو لوگ ایسا نہیں کرتے ان کے کاموں میں کبھی برکت نہیں ہوتی۔ جب دشمن تمہارے سامنے آئے تو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرنا اور اسے پیٹھ نہ دکھانا اور اگر

تمہیں فتح نصیب ہو تو چھوٹے بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا، کھجور کے درختوں کو تباہ نہ کرنا اور غلے کے کھیتوں کو نہ جلانا۔ کوئی ثمر دار درخت نہ کاٹنا اور مویشیوں کو کوئی گزند نہ پہنچانا۔ الاّ یہ کہ تم انہیں خوراک کے لیے ذبح کرو۔ جب تم کوئی معاہدہ یا پیمان کرو تو اس پر قائم رہو اور اپنا قول پورا کرو۔ جب تم آگے بڑھو گے تو تمہیں کچھ ایسے دین دار لوگ ملیں گے جو راہب خانوں میں رہتے ہیں۔ انہوں نے خدا کی بندگی کا یہی طریقہ اختیار کیا ہے۔ ان سے تعرض نہ کرنا اور نہ انہیں قتل کرنا اور نہ ان کے راہب خانوں کو مسمار کرنا"۔ یہ تھے وہ الفاظ جو خلیفہ اوّل نے یزید بن ابوسفیان کو مہم بازنطین پر روانہ کرتے وقت ارشاد فرمائے[۱۰]۔ ان دونوں کا مقابلہ اگر اسرائیلی پیغمبر کے الفاظ سے کیجیے جو بائبل میں کتاب اسیموئیل اور حزقی ایل میں ہیں۔

> "رب الافواج یوں فرماتا ہے کہ مجھے اس کا خیال ہے کہ عمالیق نے اسرائیل سے کیا کیا اور جب یہ مصر سے نکل آئے تو وہ راہ میں ان کا مخالف ہو کر آیا۔ سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور جو کچھ ان کا ہے سب کو بالکل نابود کر دے اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت۔ ننھے بچے اور شیر خوار۔ گائے بیل اور بھیڑ، بکریاں، اونٹ اور گدھے سب کو قتل کر ڈال"۔[۱۱]

> "تم بوڑھوں اور جوانوں اور لڑکیوں ننھے بچوں اور عورتوں کو بالکل مار ڈالو لیکن جن پر نشان ہے ان میں سے کسی کے پاس نہ جاؤ اور میرے مقدس سے شروع کرو۔ تب انہوں نے ان بزرگوں سے جو ہیکل کے سامنے تھے شروع کیا"۔[۱۲]

ان چیزوں کا تقابل اس لیے کیا گیا ہے کہ مسلمانوں نے تاریخ میں جب بھی کسی قوم پر فتح حاصل کی ان کا پورا پورا خیال رکھا خواہ وہ صلاح الدین ایوبی ہو یا محمد بن قاسم لیکن اس کے مقابلے میں عیسائیوں اور دوسری قوموں نے جب بھی فتح حاصل کی قتل وغارت گری کا بازار گرم کیا جس کی مثال اس قلعہ جنگی میں ہمیں ملتی ہے۔ بار بار وعدہ خلافیاں ان کا معمول تھیں۔ طالبان کے پاکستان میں سفیر ملا عبدالسلام ضعیف نے اپنی کتاب "مائی لائف ود طالبان" جس کو نیویارک، کولمبیا یونیورسٹی پریس نے ۲۰۱۰ء میں شائع کیا۔ اس بات کا اعتراف کرتے ہیں اور " قلعہ جنگی " کے سانحے کے بارے میں لکھتے ہیں کہ:

> "بہت سے قیدیوں نے مجھے اپنی سرگزشت سنائی جب وہ گوانتاموبے جیل میں جب وہ میرے ساتھ والے پنجروں میں قید تھے۔ یمن کے مختار اور تاجکستان کے یوسف اس وقت قندوز کے علاقے "قلعہ جنگی" میں قید تھے۔ جب طالبان لڑاکوں کے ایک بڑے گروہ شمالی اتحاد کی ازبک کے گھیرے کے آنے کے بعد ہتھیار ڈال دیے۔ ان کا خیال تھا کہ ان کے ہتھیار ڈالنے کی شرائط طے ہو چکی ہیں اور ان کو نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ لیکن ازبک

لڑاکوں نے اپنے وعدے فراموش کر دیے۔ طالبان کو مارا پیٹا گیا اور کئی پر تشدد کیا یا یا انہیں قتل کر دیا گیا۔ ان کو سینکڑوں کی تعداد میں دھاتی کنٹینروں میں ٹھونس دیا گیا۔ ان میں سے کئی قیدی شدید زخمی بھی تھے۔ قلعہ جنگی میں کئی قیدیوں کو ایک دوسرے پر پھینکا گیا، پھر مارا گیا۔ ان کو ایک دوسرے سے لڑنے پر مجبور کیا گیا۔ ان کو کھانے پینے کے لیے کچھ نہ دیا۔ یہ وہ جنگی جرائم ہیں جن کی روداد ان جنگی قیدیوں نے سنائی ہے جن پر یہ بیتی تھی کہ کس طرح ازبک ملیشیا جو کہ عبدالرشید دوستم کی ذاتی فوج تھی نے کیے۔"(۱۳)

اس چیز کے برعکس جب ۱۵۔ اگست ۲۰۲۱ء کو طالبان مزار شریف کو فتح کیا تو ہر بندے کو معاف کر دیا گیا۔ ان کے گورنر اسماعیل نے ہتھیار ڈال دیے۔ عبدالرشید دوستم اپنا ہیلی کاپٹر لے کر ازبکستان بھاگ گیا لیکن طالبان نے اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے سب کو معاف کیا اور ان کے ساتھ نیک سلوک کیا۔ طالبان نے جنگی جرائم سے مکمل پرہیز کیا جو کہ دنیا میں ایک مثال ہے۔ ناول "قلعہ جنگی" میں کہانی کبھی آپ بیتی تو کبھی جنگی صورتحال کا نقشہ پیش کرتی نظر آتی ہے۔ اس کش مکش میں اس کا تجسس انتہا درجے کو چھونا شروع کرتا ہے۔ جب عبدالرشید دوستم "قلعہ جنگی" میں قدم رکھا ہے۔ ایک خوف کا ماحول ہے کوئی بھی قیدی تہہ خانے سے اپنی کلاشنکوف سے اس کا خاتمہ کر سکتا تھا لیکن اس کے خاتمے سے ناول کے انوکھے پن پر اثر پڑتا تھا، جو کہ ناول کا ایک حصّہ ہوتا ہے۔ اس خوف کے ماحول کی تصویر اس طرح مستنصر حسین تارڑ نے اتاری ہے۔ کچھ دیر بعد وہ تقریباً لڑھکتا ہوا تہہ خانے میں آگرا۔ یار ادھر تو دوستم سیر کرتا ہے، دوستم؟ تقریباً سب نے جو بول سکتے تھے یک زبان ہو کر کہا: گھنی ابروں اور گھنگھریالے بالوں والا رشید دوستم؟ ہاشم میر کی آواز میں ایک خفیف سا خوف تھا۔ یارا جو کبھی روسیوں کے خلاف لڑتا تھا اب اس کا ساتھ دے رہا ہے۔ کیا تمہیں یقین ہے؟ میں نے اس کو پہچان لیا ہے یارا۔۔۔۔۔۔ وہی تھا اس کے ساتھ کچھ لوگ ہے۔۔۔۔۔۔ سیر کرتا ہے خانہ خراب پہلے سوچا اس کو شوٹ کرتا ہے، پھر سوچا فائر کا ڈز مز سن کر سب ادھر کو دوڑ آئے گا اور ہم سب خواہ مخواہ مارا جائے گا۔ اس کا ایک کردار عبدالوہاب کا ہے جو سعودی شاہی خاندان کا فرد ہے۔ یہ عبدالوہاب انگلینڈ میں کیمبرج یونیورسٹی میں داخلہ لیتا ہے۔ اس کی عادتیں باقی عربوں کی طرح کاروں، اعلیٰ شراب اور خوبصورت عورتوں سے نہیں ہے۔ اگرچہ اس کا والد ہر روز اپنی حرم سرا میں ایک خوبصورت لڑکی کو لے کر آتا ہے اور کئی کئی جائز و ناجائز بچوں کا باپ بنتا ہے۔ باپ کی اس خصوصی مہم میں اس کے ہرکارے ہر قیمت پر اس کی ان مجرمانہ خواہشات کو پورا کرتے ہیں۔

ان تمام عیاشیوں کو دیکھ کر ہی عبد الوہاب بڑا ہوا تھا لیکن وہ کڑھتا ہے کہ ہمارے لوگ تیل کی دولت سے عیاشی کر رہے ہیں لیکن امریکہ نے عملاً ہمیں اپنا غلام بنایا ہوا ہے۔ امریکہ کا سب سے بڑا ہوائی اڈا سعودی عرب میں ہے جہاں سے امریکی جہاز افغانستان اور عراق میں پر بلا روک ٹوک بمباری کرتے ہیں۔ ہمارے کندھے پر بیٹھ کر ہمارے ہی مسلمان بھائیوں کو بارود سے اڑایا جا رہا ہے۔ جب روس نے افغانستان پر قبضہ کیا تھا تو عربوں کے ساتھ یہ بھی جذبہ جہاد سے سرشار جدید ہتھیاروں سے لیس ہو کر پاکستان میں ڈیرے ڈال دیے۔ جب امریکیوں کا مشن مکمل ہوا۔ روس نے ہار مان کر افغانستان کو چھوڑ دیا تو یہی جہادی لوگ جیسا کہ اسامہ بن لادن اور دوسرے جہادی دہشت گرد قرار پائے۔ اب یہ بھی قلعہ جنگی میں قید دوسرے قیدیوں کے ساتھ تکالیف برداشت کر رہا ہے اور امریکیوں کے ظلم کا شکار ہو رہا ہے۔ امریکی اور ازبک ہیں کہ انسان کو انسان ہی نہیں سمجھتے۔ کوئی قانون، کوئی اخلاق ان کے نزدیک ہے ہی نہیں۔ بس ایک انتقام ہے کہ مارو ان کو یہ دہشت گرد ہیں اور خود درندے اور جنگی جرائم کرنے والے۔ امریکہ اور اسرائیل دنیا کے سب سے بڑے جنگی جرائم کے مجرم ہیں۔ اقوام عالم اور بالخصوص مسلمانوں کو ان کے خلاف متحد ہونا چاہیے۔

ج۔ سید کاشف رضا کا ناول (چار درویش اور ایک کچھوا) میں سیاسی جرائم کی پیش کش

i۔ بینظیر بھٹو کے قافلے کارساز پر دہشت گردوں کا حملہ:

چار درویش ایک کچھوا سید کاشف رضا کا بہترین ناول ہے جس میں دہشت گردی اور دوسرے بڑے بڑے جرائم جن میں مذہبی دہشت گردی، قتل وغارت اور زنا شامل ہیں۔ ناول کی ابتدا جاوید اقبال کے کردار سے ہوتی ہے جو صحافی اور ساتھ اس کے زرینہ جو کہ اس کے پڑوس میں رہتی ہے۔ اس میں دلچسپی لیتا ہے۔ یہ صحافی ۱۸۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء کو کراچی کارساز میں ہونے والے بم دھماکوں کی کوریج کرتا ہے جو بینظیر بھٹو کی دبئی سے واپسی پر استقبالی جلوس میں دہشت گردوں نے کیے تھے۔ یہ لوگ اپنی محبوب قائد کا دیدار کرنے آئے تھے تو یکے بعد دیگرے دو بڑے بم دھماکے ہوئے۔ بے نظیر بھٹو کی کراچی ایئرپورٹ آمد سے بہت پہلے سے اس کے استقبال کی لائیو کوریج جاری تھی۔ جاوید اقبال کی صحافی دوست مشعال بھی اس کوریج میں شامل تھی۔ اتنے میں مقامی رپورٹر ذوالفقار نے فون پر بتایا کہ زور دار دھماکہ ہوا ہے۔ شائد بی بی کے قافلے کو کسی دہشت گرد نے ٹارگٹ کیا ہے۔ ذوالفقار اس وقت قافلے کے قریب ہوٹل پر چائے پی رہا تھا۔ ابھی ذوالفقار اور جاوید اقبال کی

کال جاری تھی کہ دوسرا دھماکہ ہو گیا۔ لرزتی ہوئی آواز میں ذوالفقار نے کہا کہ استاد دوسرا دھماکہ ہوا ہے۔ عین بی بی کی گاڑی کے قریب لگ رہا ہے۔ جاوید نیوز روم دفتر سے جلدی سے نیچے آیا۔ اس نے گاڑی میں بیٹھے ہوئے ڈرائیور اور کیمرہ مین کو کہا کہ بی بی کے قافلے میں دھماکے ہوئے ہیں جلدی سے وہاں لائیو کوریج کے لیے چلو۔ کچھ ہی منٹ کے بعد میڈیا کی گاڑی سمیت جاوید اقبال کارساز میں دھماکوں کی جگہ کھڑا تھا۔ وہاں منظر ہی کچھ عجیب سا تھا۔ ہر طرف لاشے ہی لاشے پڑے تھے۔ ایک طرف بینظیر بھٹو کا ٹرک کھڑا تھا جس کے اوپر کھڑے ہو کر وہ اپنے کارکنوں کے نعروں کا ہاتھ ہلا کر جواب دے رہی تھی۔ اتنے میں تیزی سے ایک پیجیرو میں چھوٹی چھوٹی داڑھی والا سفید کپڑوں میں ملبوس شخص گزرا جو کہ غالباً ذوالفقار مرزا تھا۔ سڑک کے کنارے گھاس پر ایک شخص کراہ رہا تھا۔ بظاہر اس کو سنگین زخم نہیں تھا لیکن اس کی سانسیں رُک رُک کر چل رہی تھیں۔ اس منظر کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے:

> ”ہجوم چھٹ چکا تھا لیکن سڑک پر جو منظر اس کی آنکھیں دیکھ رہی تھیں وہ بیان سے باہر تھا۔ رات کی ٹھنڈک سے خنک سڑک پر ہر طرف آدمی بکھرے ہوئے پڑے تھے اور پھٹی پھٹی نظروں سے کبھی اپنے چاروں طرف اور کبھی اوپر آپ کو دیکھ رہے تھے۔۔۔۔۔۔ پھر دوسرے دھماکوں میں جاں بحق ہونے والوں کا خیال آیا۔ مجھے یاد آیا کہ ایک علامہ بھی بم دھماکے میں جاں بحق ہوئے تھے۔ ان کے جسم پر زخم کا کوئی واضح نشان نہیں تھا۔ اس طرح نشتر پارک دھماکے میں جاں بحق ہونے والے جن افراد کی لاشیں میں نے دیکھی تھیں ان میں سے کچھ کے جسم پر صرف ایک آدھ چھرے کا نشان تھا اور ان کے جسم سے خون بھی زیادہ نہیں نکلا تھا۔ شاید دھماکے کی دھمک سے دور جا گرنے والوں کی حرکت قلب اس سے بری طرح متاثر ہوئی ہو“۔ [۱۴]

یہ وہ دہشتگردی جیسے جرائم ہیں جن کو ملک مخالف قوتوں نے پاکستان کے خلاف استعمال کیا۔ اس وقت امریکہ افغانستان میں اپنی دہشت گردی کی نام نہاد جنگ لڑ رہا تھا اور تمام پاکستان مخالف قوتیں جن میں اسرائیل اور بھارت شامل تھے زمینی مدد انھیں افغان حکمرانوں کی حاصل تھی۔ پاکستان میں دھماکے پے دھماکے کرا رہے تھے۔ یہ کسی بھی جلسہ یا عوامی مقامات کو نشانہ بناتے تھے۔ ساتھ یہ لوگ قانون نافذ کرنے والے اداروں پر بھی بھرپور حملے کر رہے تھے۔ ان کی ایک ہلکی سی جھلک کاشف رضا نے بیان کی ہے۔ ناول چوں کہ زندگی کے تمام واقعات کو پیش کرتا ہے۔ ایک واقعے کی کڑی کو دوسرے سے ملاتا ہے۔ معاشرے کی تصویر پیش کرتا ہے۔

کارساز دھماکے بھی ہماری تاریخ کا سیاہ باب تھے جن کو دہشتگردی نے سرخ کر دیا تھا۔ اس کو ناول میں اچھے طریقے سے پیش کیا گیا ہے۔

اب کہانی صحافی جاوید اقبال کے عشق سے پروان چڑھتی ہے جو اپنی پڑوسن زرینہ میں دلچسپی لیتا ہے۔ جاوید اقبال کی دوستی بہت سی عورتوں سے رہی اور بہت سی لڑکیاں بھی اس پر مہربان تھیں۔ وہ ہر لڑکی سے محبت کو نظم کی طرح کسی شاعر کی طرح لکھتا۔ اس کی ڈائری میں بہت سی عورتوں کے نمبر تھے۔ کسی کو اس نے بہن بنایا تھا تو کسی کو الّو بنایا تھا۔ ایک ہندی فلموں کی اداکارہ کرینہ کپور کا بڑا فین تھا۔ اس کی دیو قامت تصاویر کو اس نے اپنے کمرے کی زینت بنایا تھا۔ اب صحافی اور دوست مشعال جو کبھی چوڑی دار پاجامہ تو کبھی جینز پہنتی تھی، پر اپنی نظریں گاڑھے ہوئے ہے۔ لیکن اس کی زیادہ دلچسپی صادق عرف ککی بھائی کی بیوی زرینہ میں ہے۔ ادھر صادق عرف ککی بھائی کو عجیب طرح طرح کے خواب آرہے ہوتے ہیں۔ کبھی اسے بے نظیر کے قافلے پر دہشت گردانہ حملے کی تصویر سامنے آتی ہے، کبھی کوئی بیل اس کو مارنے کے لئے دوڑ رہا ہے۔ صحافی مشعال ایک خبر بریک کرتی ہے جس میں ایک شخص نے چھے خواتین کو اسلحے کے زور پر یرغمال بنا رکھا ہے اور باری باری ایک ایک کو اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے۔ اس واقعے کی تصویر کاشف رضا نے اپنے ناول میں یوں کھینچی ہے:

> ”بیپر کے دوران وہ شخص خاتون کا نام اس کی ولدیت کے ساتھ بتاتا تھا اور پھر اپنی کارروائی شروع کر دیتا تھا۔ بیک گراونڈ میں اس خاتون کی کراہوں کی آواز آتی اور پھر مشعال کی چلاتی ہوئی آواز جس میں کہہ رہی ہوتی دیکھیے: ناظرین آپ سب کے سامنے پاکستان کی ایک بیٹی کا ریپ ہو رہا ہے۔ لیکن حکومت یا قانون نافذ کرنے والے اداروں کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگ رہی اور اس حوا کی بیٹی کو بچانے اب تک کوئی اس مقام پر نہیں پہنچا ہے۔ ناظرین آپ اپنی ٹیلی ویژن سکرین پر سن سکتے ہیں کہ اس وقت پاکستان کی اس بیٹی کے ساتھ سرعام زیادتی کی جارہی ہے“۔[۱۵]

ناول نگار کے مطابق جرم ٹیلی ویژن پر بیٹھی اینکر کا ہے جو اس خبر کو لائیو چلارہی ہے ناکہ وہ لڑکیاں جن کے ساتھ زیادتی کی جارہی ہے۔ پھر یہاں آن لائن ایک عالمِ دین کی خدمات بھی حاصل کی گئی ہیں جو اس آدمی کو سمجھا رہا ہے ادھر وہ مشعال جلا کر اس زیادتی کرنے والے بندے سے پوچھتی ہے کہ آپ سرِعام زیادتی کر رہے ہیں آپ کا مطالبہ کیا ہے لیکن وہ آدمی یہ کہتا ہے کہ میرا مطالبہ یہ ہے کہ ابھی وزیراعظم ٹی وی پر آکر اعلان کریں کہ ملک میں شریعت نافذ کر دی گئی ہے۔ مشعال پوچھتی ہے کہ اس وقت جو آپ کر رہے ہیں اور ساتھ ہی

ریاست کی رٹ کو چیلنج کر رہے ہیں کیا یہ عین شریعت کے مطابق ہے یہ تو ہٹ دھرمی اور جرم ہے بلکہ سیاسی جرم بھی ہے کیونکہ اس میں براہ راست ریاست کو آپ ملوث کر رہے ہیں۔ غلط کام سے صحیح کام کیسے ہو سکتے ہیں۔ آپ سرینڈر کریں اور اپنے آپ کو قانون کے حوالے کریں۔ لیکن مجرم کا مطالبہ ہے کہ پہلے شریعت نافذ کریں پھر مجھے چاہے پھانسی پر لٹکا دیں۔ وہ ایک خاتون کو چھوڑ کر دوسری کو دبوچ لیتا ہے۔ لیکن اپنا جرم بالکل نہیں چھوڑتا۔ مولانا تاج الدین حیدری صاحب بھی اس کو یہ کہتے ہیں کہ جناب پہلے آپ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کریں پھر آپ کا مطالبہ دیکھا جائے گا۔ آپ خدا کا خوف کریں بے گناہ عورتوں کا استحصال بند کریں۔ اللہ کے وعدے پر ایمان رکھیں اور یہ خیال کریں کہ دنیا کے مقابلے میں آخرت میں زیادہ خوبصورت عورتیں ملیں گی۔ شریعت کے نفاذ کا آپ کا مطالبہ درست ہے لیکن طریقہ کار غلط ہے۔ لال مسجد والوں کا مطالبہ بھی درست تھا لیکن طریقہ کار غلط اور دوسری تنظیمیں جیسے تحریک لبیک پاکستان ہے جو جگہ جگہ راستے روک کر بیٹھ جاتے ہیں وہ تو سراسر غلط ہیں۔ دیکھیں آپ حکومت کی رٹ کو چیلنج نہ کریں۔ اپنے آپ پر رحم کریں اور دوسری عورتوں پر بھی جن کو آپ نے یرغمال بنایا ہے چھوڑ دیں۔

یہ روز مرہ کے وہ واقعات ہیں جو ہمارے ہاں اکثر رونما ہوتے ہیں۔ نام نہاد قسم کے لوگ اور تنظیمیں ایسی ایسی حرکتیں کرتی ہیں کہ خدا پناہ اور اس کو شریعت کا نام رہے ہوتے ہیں۔ کاشف رضا کی نظر اپنے ارد گرد کافی مضبوط ہے اور وہ معاشرے کا صحیح ترجمان ہے۔ ان جرائم کا انہوں نے ذکر کیا ہے جس کو لوگ ثواب سمجھ کر کرتے ہیں حالانکہ یہ مت بھولیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رحمت اللعالمین تھے۔ رحمت المسلمین نہیں تھے۔ ان کو لوگوں کا اسلام ایسے ہی ہے جیسے چار سو سال پہلے یورپ میں اہل کلیسا کرتے تھے۔ کسی نے مسیح کو خدا نہ مانا تو اس کو آگ لگا دی اور زندہ جلا دیا۔ ہمارے ہاں آج کل ایسے واقعے جو سنگین جرائم ہیں کثرت سے ہو رہے ہیں۔ ناول نگار نے ان جرائم کا ذکر کر کے ان کی مذمت کی ہے نہ کہ حوصلہ افزائی۔ پڑھنے والوں کے لیے رہنمائی ہے ان جرائم سے بچنے کی۔

ii۔ پاکستان میں مارشل لاؤں کی تاریخ اور آمروں کے غیر قانونی کام:

کاشف رضا نے اپنے اس ناول میں پاکستان میں ہونے والے سنگین سیاسی جرائم کے واقعات کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے کیوں کہ مارشل لا بھی ایک سیاسی جرم ہے۔ اقبال جو کہ ناول کا اہم کردار ہے اس کی والدہ سلطانہ جو آفتاب اقبال دوسرے کردار کی سوتیلی ماں ہے۔ اس کے باپ اقبال محمد خان کو یہ کہتی ہے کہ میں ضرور

یہ سوچتی ہوں کہ اگر بینظیر بھٹو لیاقت باغ جلسے کے بعد کارکنوں کے نعروں کا جواب نہ دیتی نہ اپنی گاڑی سے باہر سر نکالتی تو وہ بچ سکتی تھی۔ لیکن جرائم پیشہ سیاستدانوں کو یہ منظور نہ تھا۔ وہ اپنے دکھوں کو سیاسی دکھوں کے ساتھ جوڑتی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ بینظیر بھٹو کو لینڈ کروزر کا لیور لگا تھا لیکن دھماکا بھی تو ہوا تھا نا۔ میں سوچتی ہوں کاش بینظیر نے لال مسجد کے معاملے پر مشرف کا ساتھ نہ دیا ہوتا اور نہ ہی فاروق لغاری کو اپنا صدر بنایا ہوتا۔ پھر میں سوچتی ہوں کہ پاکستان کی پوری تاریخ ایسی ہے۔ اسکندر مرزا نے ایوب خان کو اختیار نہ دیئے تو اس نے مارشل لگا دیا، / زوالفقار علی بھٹو نے گیارہ جرنیلوں کو سپر سیڈ کر کے ضیاء الحق کو چیف آف آرمی سٹاف نہ بنایا ہوتا، نہ نواز شریف تین سینئر جرنیلوں کو سپر سیڈ کر کے پرویز مشرف کو آرمی چیف بناتے نہ پاکستان میں آئین کے ساتھ کھلواڑ ہوتا۔ ۱۹۵۱ء میں لیاقت باغ میں لیاقت علی خان کا قتل ہی شاید مارشل لاز کا دروازہ کھولنے کے لیے کیا تھا۔ اگر نہرو ۱۹۳۷ء میں مسلمانوں کو اقتدار میں شامل کر لیتے اور اپنے اندر کا خبث باطن ظاہر نہ کرتے تو مسلمان ۱۹۴۰ء کی قرارداد پیش ہی نہ کرتے کہ مسلمانوں کے لیے الگ ریاست چاہیے۔ اگر ۱۷۵۷ء کو میر جعفر انگریز کا ساتھ نہ دیتا تو انگریز برصغیر میں اپنے قدم جما ہی نہیں سکتے تھے۔ ابدالی نے دہلی پر حملہ کر کے سب کچھ لوٹا۔ اور نگزیب عالمگیر نے دکن کو فتح کرتے کرتے الٹا ہندوستان کا خزانہ خالی کر دیا جس سے دکن تو فتح ہو گیا لیکن ہندوستان مسلمانون کے ہاتھ سے جاتا رہا۔ کاش جہانگیر نے انگریزوں کو ۱۶۰۰ء میں تجارتی اجازت نامہ نہ دیا ہوتا۔ کاشف رضا نے اپنی بات کو قصے کی شکل میں دہرایا ہے اور ہمارے سیاسی جرائم کا نقشہ کھینچا ہے:

> ”اگر وہ اپنے آخری دن (بینظیر بھٹو) اپنا سر لینڈ کروزر کی چھت سے باہر نہ نکالتی تو بچ جاتی کیونکہ گاڑی کے اندر موجود اس کے کسی ساتھی کے جسم پر خراش تک نہیں آئی تھی۔ اس کے جسم پر زخم کا صرف ایک نشان پایا گیا تھا۔ اس کے سر کی ایک جانب زخم تھا جو امکانی طور پر پستول کا نہیں تھا۔ پستول چلانے والے کی دوسری گولی بھی ضائع کی گئی تھی۔۔۔۔۔ اگر اس نے پاکستان آنے کا مشرف کا مشورہ قبول کر لیا ہوتا۔ اگر اس نے فاروق لغاری کو صدر پاکستان نہ بنایا ہوتا، اگر اس نے ۲۰۰۲ء میں مشرف سے ڈیل کر لی ہوتی۔۔۔۔۔ لیکن دیکھا جائے تو پاکستان کی پوری تاریخ ہی Had it been اور Had it not been جیسے اتفاقات سے بھری پڑی ہے۔ اگر بھٹو گیارہ جرنیلوں کو سپر سیڈ کر کے ضیاء الحق کو آرمی چیف نہ بناتا، اگر بھٹو شیخ مجیب الرحمن کو پاکستان کا وزیر اعظم تسلیم کرنے پر تیار ہو جاتا“۔(۱۶)

یہ تھے وہ سیاسی جرائم جن کو کھل کر ناول کے پیرائے میں کاشف رضانے پیش کیا ہے اور کردار میں سلطانہ کو استعمال کیا ہے۔ یہاں پر ناول نگار ۱۹۴۱ء میں لکھی جانے والی ایک کہانی کا ذکر کرتا ہے جس کو خورخے لوئیس بورجنیس نے لکھا تھا۔ "دا گارڈن آف فورکنگ پاتھس" جس کا ترجمہ "گھومتے گھماتے راستوں کا باغ" ہے یہ تہہ دار کہانی ہے جس میں ایک بہت بڑا سیاسی جرم جاسوسی ہے جس کی سزا موت ہے۔ یہ کہانی ڈاکٹر بوسن کی ہے جو کہ ایک چینی ڈاکٹر ہے اس کے دستخط ثبت ہیں۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران جرمنوں نے اس ڈاکٹر کو برطانیہ میں جاسوسی کے لیے رکھا تھا۔ ڈاکٹر لوئیس کو ایک دن یہ پتا چل جاتا ہے کہ مجھے برطانیہ کی خفیہ ایجنسی ایم آئی فائیو کا ایک اہلکار اس تک پہنچ چکا ہے لیکن ایک آخری جاسوسی کرنی باقی ہے جو کہ اپنی گرفتاری سے پہلے کرنا چاہتا ہوں۔ برطانیہ میں توپ خانے کا ایک ذخیرہ ہے جس کے بارے میں جرمنوں کو بتانا چاہتا ہوں تاکہ وہ ہوائی بمباری کر کے اس کو ختم کردیں۔ جس جگہ یہ ذخیرہ ہے وہاں پر ایک ماہر چینیات ڈاکٹر سٹیفن البرٹ رہتا ہے جس کا کام صرف ناول لکھنا اور کہانیاں لکھنا ہے۔ ناول کی پیچیدگیوں کو کس طرح بھول بھلیوں میں داخل کرتا ہے۔ وہ تجربات کرتا رہتا ہے مگر ہوا یہ کہ ڈاکٹر لوئیس اس کے پاس یعنی ڈاکٹر سٹیفن کے ہاں جاتا ہے اور اسے یہ بتاتا ہے کہ جو کام آپ چینی ناولوں پر بھول بھلیوں والا کر رہے ہیں۔ میں اور میرے دادا یہ کام پہلے کر چکے ہیں۔ یعنی چینی ناول میں کثرت زمان و مکان نہیں ہوتے۔ نہ ہی کئی راستے ایک وقت میں بیان کرتے ہیں بلکہ وہ راستے وقت کے آگے تک پھیلے ہوتے ہیں۔ آخر میں وہ یہ بتاتا ہے کہ میں چینی پروفیسر اس کو دو راستوں سے ملنے کے لئے آیا ہوں۔ ایک یعنی دوستی کا راستہ اور دوسرا دشمنی کا راستہ۔ ڈاکٹر البرٹ کہتا ہے کہ میرا نقطہ نظر بھی یہی تھا لیکن اتنے میں لوئیس ڈاکٹر البرٹ کو پستول نکال کر گولی مار دیتا ہے۔ یہ بورجنس کی کہانی کے بیان کرنے کا مقصد چائنہ کی ابھرتی ہوئی مستقبل کی طاقت کو دکھا رہا ہے جو ایک تجارتی راستے اور دوسری ہتھیار بنانے کی رفتار کو جس تیزی سے کر رہا ہے آخر کار وہ پرانے عالمی جاگیر دار امریکہ کو گولی مار دے گا اور خود سپر پاور بن جائے گا۔

iii۔ حافظ برکت اللہ شاہین کا اقبال عرف بالے کو دہشت گرد بنانا:

سید کاشف رضا نے ایک کردار حافظ برکت اللہ شاہین کا شامل کیا ہے جو کمسن یعنی بیس سال کی عمر میں گھر سے بھاگے ہوئے لڑکوں کو وزیرستان میں ٹریننگ دے کر جنت کا لالچ دیتا اور دہشت گردوں کو مالی امداد بھی لوگوں سے چندہ اکٹھا کر کے دیتا ہے۔ ناول میں ایک کردار بالا ہے جو اپنے دوست رفیق کو غیرت کے نام پر شک کی بنا پر قتل کر کے حافظ برکت اللہ شاہین کے پاس چلا جاتا ہے۔ حافظ شاہین اسے پہلے یہ کہتا ہے کہ بہت زیادہ بچے میرے پاس جہاد کی غرض سے گھر بار چھوڑ کر آتے ہیں لیکن جب جہاد کی سختیاں برداشت نہیں کر پاتے تو واپسی کی راہ لیتے ہیں۔ لیکن بالا اسے کہتا ہے کہ تم مجھے اپنی امیدوں پر پورا پاؤ گے پھر جب اسے اخبار کے ذریعے

یہ خبر ملتی ہے کہ بالا اپنے دوست کو شک کی بنا پر قتل کر کے بھاگا ہوا ہے تو وہ بہت خوش ہوتا ہے کہ اب بالا میرے جال سے بچ نہیں سکے گا۔ کیوں کہ اس کو پولیس کے پکڑنے کا بھی ڈر ہے۔ پولیس نے اس کے باپ شوکت علی کو پہلے ہی گرفتار کر لیا تھا۔ حافظ برکت اللہ نے اقبال عرف بالے کو اپنے دوست فتح دین کے حوالے کر دیا۔ جس نے بالے کو میانوالی کندیاں کے راستے سے میر انشاہ پہنچا دیا۔ وہاں پر اس کی ملاقات نوجوان جنگجو محمد خان سے کرائی۔ صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر محمد خان کے ساتھی اور بالا سب اکٹھے باہر گئے وہاں پر ایک قبرستان تھا جس میں نوجوانوں اور بچوں کی قبریں تھیں۔ ہر فرد کے کندھے پر بندوق تھی۔ وہاں قبرستان میں ان کے گائیڈ محسود جان نے بالے سمیت سب لوگوں کو بتایا کہ یہ سب قبریں مجاہدین کی ہیں۔ یہ لوگ امریکی ڈرون حملوں میں مارے گئے تھے ساتھ یہ بے گناہ بچے بھی ہیں جن کو ابھی زندگی کی بہاروں کو دیکھنا تھا۔ یہ معصوم جنت میں آرام کر رہے ہیں۔ بالا جوش سے بولا کہ میرا دل کر رہا ہے کہ میں ان معصوم لوگوں کے قاتلوں کو بم سے اڑا دوں لیکن محسود جان نے کہا کہ وہ وقت ضرور آئے گا میرے مجاہد بھائی ہمارے غدار حکمران خود امریکہ کو دعوت دیتے ہیں کہ آؤ ڈرون حملے کر کے ہمارے بندوں کو مارو۔ مشرف بولتا ہے بینظیر بھٹو بھی بولتی ہے امریکہ کو کہ ایسا کرو پھر سب مجاہد حکمرانوں کو برا بھلا کہتے ہیں اور انتقام لینے کی قسمیں کھاتے ہیں۔ دوسرے دن سے بالے کی ٹریننگ شروع ہو جاتی ہے۔ بالا بندوق چلانے، گرنیڈ پھینکنے، نشانہ باندھنے کے سب طریقے بڑی ہنر مندی سے سیکھ جاتا ہے۔ یہاں پر ہر روز ایک قاری حسن درس و تدریس کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ قاری حسین کا ساتھ استاد عبد العزیز دیتے ہیں جو قرآن پاک کی وہ آیات ان کو بتاتے ہیں جو صرف جہاد و قتال کے متعلق ہیں۔ زیادہ زور تقدیر پر دیا جاتا ہے۔ قاری صاحب کہتے ہیں کہ تم میں سے کوئی کسان کا بیٹا ہے تو کوئی قصائی کا، کوئی چرواہے کا، تو کوئی موچی کا بیٹا۔ اللہ سبحانہ و تعالیٰ نے تم کو بھی قصائی، چرواہا اور موچی بننے کے لیے پیدا کیا ہے۔ تم لوگ جہاں بھی پیدا ہوئے ہو۔ آج اللہ سبحانہ و تعالیٰ تم سے کوئی بڑا کام لینا چاہ رہا ہے۔ تم لوگوں کو جنت کا اعلیٰ مقام دینا چاہ رہا ہے۔ جس کی تمنا ہر مسلمان کرتا ہے۔ اس کے الفاظ کی تصویر کاشف رضا نے ان الفاظ میں اتاری ہے :

> ''کیا انسان اپنی تقدیر کو بدلنے پر قادر ہے؟ کیا پاکستان کے نظام میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کسی کسان کا بیٹا گھاس نہ کاٹے، کسی چرواہے کا بیٹا بھیڑ بکریاں نہ چرائے، کسی قصائی کا بیٹا جانور ذبح نہ کرے۔ کسی موچی کا بیٹا جوتے نہ گانٹھے؟------بالے کے ذہن میں اپنے گاؤں کی کچھ مثالیں آ رہی تھیں جنھوں نے تعلیم حاصل کر کے اپنے آباواجداد کے پیشے سے پیچھا چھڑایا تھا------لیکن جب اس نے باقی لڑکوں کو اونچی آواز میں نہیں کہتے سنا تو ان کی

آواز میں آواز ملادی۔۔۔۔۔۔ کیا تم نے کبھی سوچا کہ تم مشرف کا، بے نظیر کا تختہ الٹ سکتے ہو؟۔۔۔۔۔۔ سب ممکن ہے، سب ممکن ہے۔ لیکن اس میں رکاوٹ ہے تمہارا ارادہ۔ تم سب کا مالک کون ہے؟ اللہ تعالیٰ سورۃ بقرہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "ومن لناس من یشریٰ نفسر ابتغاء مرضات اللہ ، واللہ رؤف بلعباد"۔ تم میں سے کون ہے جو اللہ کی خوشنودی کے لیے خود کو بیچ دے اور اللہ اپنے بندوں کے لیے بہت رحم کرنے والا ہے۔ "خود کو پورے کا پورا بیچ دو"۔(۱۷)

آگے چل کر قاری صاحب کہتا ہے کہ مجاہد و خود کو پورے کا پورا اللہ تعالیٰ کو بیچ دو۔ یہ سارا جسم، چہرہ، بازو، آنکھیں، سینہ، پیٹ، سر، ٹانگیں، آنکھیں، دل، دماغ اللہ تعالیٰ سے بہتر کوئی خریدار نہیں ہے۔ یہ وہ باتیں ہیں جو دہشت گرد تیار کرنے والے افراد نوجوانوں کو سکھاتے ہیں۔ ان کی برین واش کرتے ہیں کہ مشرف، بینظیر، نواز شریف سب کو دین کی خاطر اڑا دو۔ خود بھی اُڑ جاؤ تاکہ تم کو جنت ملے۔ یہ ریاست کی رٹ کو چیلنج کرنے والے دہشت گرد اور ان کے اساتذہ جو غیر ملکی پیسے سے ملک میں دہشت گردانہ کارروائیاں کرتے ہیں۔ بے گناہ افراد کا قتل عام ان کا مقصد حیات ہوتا ہے۔ دراصل ایجنڈا کسی اور کا ہوتا ہے، عمل درآمد یہ کرتے ہیں۔ کاشف رضا نے اسی دہشت گردی کی مذمت کی ہے جو اسلام کو بدنام کرتے ہیں اور ساتھ ملکی استحکام کو بھی داؤ پر لگاتے ہیں۔ جہاد کا حکم صرف ریاست دے سکتی ہے۔ اصل میں یہی جرائم پیشہ لوگ ہیں، جو بڑے طریقے سے دین کے نام پر لوگوں پر اور ریاست پر ظلم کرتے ہیں۔ ان کے کالے کرتوت کاشف رضا نے اس طرح بیان کیے ہیں:

"میں سوچتا ہوں کہ بڑے اور ذہین مجرموں میں بھی ایک کہانی کار چھپا ہوتا ہے۔ وہ اپنے جرم کا پلاٹ ایک ذہین کہانی کار کی طرح تیار کرتے ہیں۔ جیسے قاری کہانی کار کو فالو کرتا ہے اسی طرح مجرم کے ذہن کے کسی نہ کسی کونے میں کھوجی بھی ضرور ہوتے ہیں جو اس کے جرم کی کھوج لگانے کی کوشش کریں گے۔۔۔۔۔۔ بڑے مجرموں میں کہانیوں کے مختلف سرے آپس میں ملانے کی خوب صلاحیت ہوتی ہے۔ مثلاً ایسے مجرم کے بارے میں آپ کیا کہیں گے جس نے اپنے کسی دوست کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑے عرصے سے سوچ رکھا ہے لیکن اس پر عمل درآمد نہیں کر پا رہا۔۔۔۔۔۔ جس شخص نے بھی اسے تازہ دھمکی دی ہو۔ یوں کہانی شروع ہو جاتی ہے جس کا مقتول کی کہانی سے سرا اصل مجرم نے جوڑا تھا۔ قاری حسین ایک ایسا ہی کہانی کار تھا"۔(۱۸)

دو وقت کی روٹی کی محتاج ہماری نوجوان نسل ان جرائم پیشہ قاریوں کے ہتھے چڑھ جاتی ہے پھر آئے روز پشاور، کوئٹہ، کراچی، لاہور اور اسلام آباد میں دھماکے ہوتے ہیں۔ قاری حسین بے نظیر بھٹو کو مارنے کا منصوبہ بنا کر خود کش جیکٹس بالے اور دوسرے چار لڑکوں کو دے کر کارساز کراچی میں بم دھماکے کراتے ہیں لیکن بالے کے بم نہیں پھٹتے۔ باقی بچ جانے والے لڑکوں کو پولیس مقابلے میں مار دیتی ہے جبکہ بالا تائب ہو کر بچ نکلتا ہے اور نارمل اپنی زندگی گزارنا چاہتا ہے لیکن تمام کاموں کے پیچھے اس کی ماں کا ہاتھ ہے جس نے اس کی تربیت ٹھیک نہیں کی۔ وہ کہتا ہے کہ میں سب سے پہلے اپنی ماں کو گولی ماروں گا۔ یہاں ناول نگار کے نزدیک اصل مجرم ماں ہے جس کی تربیت سے بالا دہشت گرد بنا۔ بالا محمد اقبال خان کی عالمگیر بی بی سے ناجائز اولاد ہے اور اس کا اس کو بھی پتہ چل گیا تھا۔ اس لیے وہ اس گناہ کا بدلہ اپنی ماں سے لینا چاہتا تھا، حالانکہ خود کو وہ نارمل کرنے کے لیے سوچتا بھی ہے۔ ناول کی کہانی میں محمد اقبال خان تحصیل داراس کا بیٹا جاوید اقبال، پھر اس کا سوتیلا بھائی پروفیسر آفتاب اقبال، سلمٰی، زرینہ، امتہ الکریم ان کی والدہ اور عالمگیر بی بی جیسے اہم کرداروں کے گرد گھومتی ہے۔ کھچوے کا کردار علامتی سا ہے لیکن وہ سرِ عام گالیاں نکالتا ہے۔ لیکن سچ بولتا ہے۔ ایک مافوق الفطرت کردار ہے۔ کہانی میں زنا، دہشتگردی، مذہبی انتہا پسندی، مارشل لاء جیسے جرائم شامل ہیں، جن کو کاشف رضا نے خوش خوش اسلوبی سے نبھایا ہے۔ میرے مقالے کا تعلق صرف اس کے سیاسی عزائم کے سبب اور محرکات تک محدود ہے۔ جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔

د۔ محمد الیاس کے ناول "برف" میں سیاسی جرائم:

محمد الیاس عصر حاضر کے بہترین ناول نگار ہیں۔ معاشرے میں رونما ہونے والے واقعات اور مسائل کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کے زیادہ تر ناول سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور نے شائع کیے ہیں۔ میرے مقالے میں ان کے ناول "برف" کے اندر پائے جانے والے سیاسی جرائم کے اسباب و محرکات کا جائزہ لینا ہے۔ "برف" ناول اَسی کی دہائی سے شروع ہوتا ہے اور نائن الیون کے سانحے کے چند سال بعد تک پھیلا ہوا ہے۔ ناول کثیر الموضوعاتی ہے۔ ناول میں مزاحمت کا عنصر بہت زیادہ ہے۔ اس میں دہشت گردی، جہاد کشمیر، اسمگلنگ، وائٹ کالر کرائم، معاشرے میں پائی جانے والی توہم پرستی، خود کش حملے شامل ہیں۔ اس ناول کی کردار نگاری محمد الیاس کی فنی مہارت کا ثبوت ہے۔ کرداروں میں شیخ نورالسلام، چوہدری بدر سوڈیا، مولانا عمر فاروق، مولانا عبدالجبار، فخری، ظفری، سائیں ٹلی والا، مس فہمیدہ، راجا، ضیاء، زبیدہ، زینت بی بی، گدھا بانکا شامل ہیں۔ ناول میں قتل، اسباب قتل، بیرون ملک اسمگلنگ، فراڈ، دھوکہ دہی، جعلی ویزے بنانے اور دہشت گردی کے اسباب

کو بڑی عمدہ مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ بھارتی فورسز پر مجاہدین کے حملے، بھارتی فوج کے کشمیری مسلمانوں پر وحشیانہ مظالم، معصوم کنواری عورتوں کی عصمت دری، نوجوانوں کا بہیمانہ قتل جیسے جرائم کی پیشکش بڑے اچھے انداز سے کی گئی ہے۔

i۔ عسکری تنظیموں کے مابین خون ریز تصادم:

ناول میں جہاد کشمیر کا ذکر اور عسکری تنظیموں کے درمیان خون ریز تصادم کا حال بیان کیا گیا ہے۔ ناول کا ایک کردار ظفر ہے جو ناول کا ہیرو بھی ہے۔ ناول کی ہیروئن فخر النساء کی شادی عمر فاروق نامی نام نہاد مجاہد سے ہوتی ہے جو جہاد کے نام پر دھبہ بھی ہے۔ اسی دکھ کو برداشت نہ کرتے ہوئے ظفر جہاد کشمیر میں برسرپیکار ایک تنظیم میں شامل ہو کر آزاد کشمیر کے کیمپ میں پہنچ جاتا ہے۔ وہاں آکر وہ ماحول کو دیکھتا ہے کہ بعض تنظیمیں جہاد کشمیر میں مشنری جذبے سے خلوص نیت سے مصروف عمل تھیں۔ تو بعض زبانی جمع خرچ کرتے ہوئے اس مقدس فریضے سے وابستہ کھڑے مخلص افراد کو محض دھوکا دے رہی تھیں۔ ان میں مسلک ازم اور فرقہ پرست گروہ حاوی تھے۔ ایک دوسرے کے خلاف مخاصمانہ لٹریچر چھاپنے اور وال چاکنگ کے علاوہ تقریریں اور بحث و مباحثے تک محدود تھے۔ تاہم ان کا غلغلہ زیادہ تھا اور پاکستان کے مختلف علاقوں سے پولیس کو مطلوب فرقہ واریت کے جنون میں مبتلا مفروروں نے بھی ان کاغذی تنظیموں میں محفوظ پناہ لے رکھی تھی۔ آزاد کشمیر کی کچھ خاص جگہیں جن میں سہنسہ اور سرساوہ میں قائم کیمپوں کا تعلق مختلف تنظیموں سے تھا۔ ظفر کے کیمپ میں پہنچنے سے پہلے انھیں کیمپوں میں موجود دو تنظیموں کا آپس میں خون ریز تصادم ہو چکا تھا۔ جس میں جدید ترین آتشیں اسلحہ کا استعمال کھلے عام ہوا تھا۔ کچھ لڑکے زخمی ہوئے، فضا ابھی تک کشیدہ تھی۔ مقامی لوگ مجاہدین کے ان سیاہ کارناموں سے خاصے نالاں تھے۔ رائے عامہ عسکریت پسندوں کے خلاف ہو رہی تھی۔ زیادہ تر لوگوں کا خیال تھا کہ ریاست کے پُرامن ماحول کو خراب کیا جا رہا ہے۔ گویا جرائم پیشہ عناصر کی مذموم کارروائیاں منفی اثرات مرتب کر رہی تھیں۔ آزادیٔ کشمیر کی خاطر جان و مال اور مستقبل کی قربانیاں دینے والے مجاہدین اوران کے قائدین کے کارنامے دھندلا رہے تھے۔ ناول میں یہ وہ جھگڑے بتائے جا رہے ہیں جو صرف مسلک کی پیداوار ہیں جس کے نتیجے میں جرائم پیشہ لوگ اپنا مسلک دوسرے پر زبردستی ٹھونسنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ ہمارے جرائم پیشہ افراد ہماری پولیس کو مطلوب ہیں اور بے گناہ لوگوں کو قتل کر کے ریاست کو بھی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ناول کے ہیرو ظفر کو بڑی حیرت ہو رہی ہے کہ کیمپوں میں بارود اور اسلحہ کا ڈھیر ہو رہا ہے۔ ڈمی تنظیمیں اور ان کے حاشیہ نشین قائدین بڑے طمطراق سے رہ رہے ہیں۔ موٹر سائیکل، جیپ، گاڑیاں، سیکورٹی کے لیے نوعمر

جہاد سے سرشار مجاہدین بطور سیکورٹی گارڈ ان کے آگے پیچھے پھر رہے ہیں گویا کہ یہ جہاد نہیں پروٹوکول سے شاہانہ زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کا نقشہ محمد الیاس نے یوں کھینچا ہے:

> ''جیپ گاڑیاں، کاریں اور موٹر سائیکل رکھے ہوئے ہیں اور جرائم پیشہ گینگز کا تاثر اُبھرنے لگا ہے۔ قیمتی اور جدید اسلحہ جرائم پیشہ عناصر کے ہاتھوں فروخت کر دیا جاتا ہے۔ کئی قائدین کی اپنی اولادیں ملک کی اعلیٰ یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم ہیں تو بعض کی بیرون ملک اور پھر ان کے حواری اور باڈی گارڈز تنظیم پر بڑا بھاری مالی بوجھ بنے ہوئے ہیں۔ اعلیٰ خوراکیں کھا کھا کر ان کے جسموں پر چربی کی تہیں چڑھنے لگی ہیں۔ محض دکھاوے کے لیے کمانڈوز کی سی جیکٹ پہن لیتے ہیں''۔(۱۹)

ناول میں محمد الیاس نے ملک کے مختلف گروہوں کے جرائم پیشہ افراد جو فرقہ واریت میں ملوث تھے۔ ان کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح جہاد جیسے مقدس پیشے کو بدنام کر رہے ہیں۔ لوگ ان کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ لیکن چند مفاد پرستوں کی وجہ سے تحریک آزادی کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ یہ لوگ چندے کے پیسے مزے کر رہے ہیں۔ پنجاب میں یہ لوگ مختلف تھانوں میں مطلوب ہیں لیکن آزاد کشمیر کے کیمپوں میں ان کی عزت کمانڈروں جیسی ہو رہی ہے۔ وہاں ان کی شکلیں ایسی ہیں کہ سر اور داڑھی کے بال بڑھا رکھے ہیں اور دوسروں پر خواہ مخواہ دہشت کی علامت بنے ہوئے ہیں۔ یہ دکھاوے کے سورما ہیں۔ ان میں سے ابھی تک کسی نے مقبوضہ کشمیر کی حدود میں قدم بھی نہیں رکھا۔ صرف تقریریں، نعرے اور چندہ اکٹھا کرنے پر زور دیا جا رہا ہے۔ اصل میں یہ وہ گروہ جو جرائم پیشہ ہے اور ناول میں محمد الیاس نے ان کے مذموم چہروں سے پردہ اٹھایا ہے۔ ناول کے مرکزی کردار ظفر نے جب اپنی آنکھوں سے یہ حال دیکھا تو وہ حیران رہ گیا کہ یہ لوگ شہروں میں مشہور جگہوں پر جلسہ کرتے ہیں جن میں قائدین اور حریت پسندوں کی شرکت ان کی عظمت میں زمین و آسمان کے قلابے ملاتے ہیں اور گمان یہ گزرتا ہے کہ کوئی قرون اولیٰ کے کسی فاتح کی آمد جلسے میں ہوئی چاہتی ہے۔ قائدین کی آمد پر اندھا دھند فائرنگ کرتے ہیں۔ الٹا پولیس فورس کو ڈرپوک اور نکمے کہہ کر پکارتے ہیں۔ کشمیر میں ان لوگوں کی کوئی جنگی حکمت عملی نظر نہیں آتی الٹا یہ لوگ پاکستانی سرحد سے ہی تھوڑا اندر کر کے بی ایس ایف کو نشانہ بناتے ہیں جس سے دو چار انڈین فوجی مر گئے تو اس کو اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم نہیں کہ ان کی اس حرکت کی وجہ سے یہ لوگ مقبوضہ کشمیر کے اندر مسلمانوں کے لیے مشکلات پیدا کرتے ہیں۔ انڈین فوجی بے گناہ کشمیریوں کو بدلے میں شہید کرتے ہیں۔ عورتوں کی عصمت دری کرتے ہیں۔ یہ اس جرم کا ردعمل ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔ اگر یہ واقعی مجاہد ہیں تو اندر جا کر گھاٹ لگا کر ان کا زیادہ نقصان کریں جہاں آبادی بالکل کم ہو تاکہ مقامی لوگوں پر ان کی وجہ سے آفت نہ آئے۔ اس کی تصویر کشی ناول میں اس انداز میں کی گئی ہے:

"فوج نے چھوٹی سی آبادی کو گھیر کر ساری خواتین کو ایک طرف اور مردوں کو دوسری طرف جمع کر کے بُری طرح زدوکوب کیا۔ خواتین کی بے حرمتی کی۔ بوڑھوں کی داڑھیاں نوچ ڈالیں اور چند نوجوان جو آبادی میں موجود تھے، گرفتار کر لیے گئے۔ گھر گھر تلاشی کے دوران ایسی لوٹ مار مچائی کہ ایک وقت کا راشن بھی باقی نہ چھوڑا۔ چار جوان جو گرفتار ہوئے چند روز بعد ان کی لاشیں جنگل سے ملیں"۔ (۲۰)

ناول کا ہیرو ظفر جب اس منظر کو دیکھتا ہے تو اس کا کلیجہ پھٹتا ہے کہ یہ جہادی نہیں فسادی ہیں کیونکہ ان کی وجہ سے نہتے کشمیری مسلمانوں پر آفت آتی ہے۔ یہاں پاکستان میں کیمپوں کے اندر یہ لوگ جدید اسلحے سے ہوائی فائرنگ کرتے ہیں۔ بکرے پکتے ہیں ڈرائی فروٹ منوں کے حساب سے کھایا جاتا ہے اور بہادری کے کارنامے اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ دشمن کسی بھی وقت مرغا بن کر کہے گا حضور ہمیں چھوڑ دیں۔ یہ لیجیے آزادی کا پروانہ اور جلسوں میں عالمی طاقتوں کو بھی واشگاف الفاظ میں الٹی میٹم دے دیتے ہیں کہ اگلی باری تیری آرہی ہے۔ تو شیطان ہے۔ مسلم اُمّہ کو بُری نظر سے دیکھا تو تیری آنکھ پھوڑ دی جائے گی۔ ناول کا ہیرو ان جرائم پیشہ عناصر کی تقریریں سن کر چکرا جاتا ہے۔ وہ یہ دیکھ کر سخت غصے میں ہے کہ آزاد کشمیر کے ہر شہر کے نزدیک پہاڑوں میں پاکستان اور پڑوسی ملک سے آئے ہوئے اچھے اور بُرے ہر قماش کے لوگ مقیم ہیں۔ آزاد کشمیر میں روزِ اوّل سے قائم فرقہ وارانہ ہم آہنگی کی فضا بھی مکدر ہونے لگی۔ فرقہ پرست جنونیوں کے علاوہ جرائم پیشہ عناصر بھی جعلی تنظیموں میں شامل تھے۔ جن میں کئی ایک چوریوں، ڈکیتیوں اور غیر اخلاقی جرائم کا ارتکاب کر رہے تھے۔ شواہد سے پتہ چل رہا تھا کہ ملک کے دیگر حصّوں سے گاڑیاں اور موٹر سائیکل چوری کر کے آزاد کشمیر لائے جا رہے ہیں اور نام نہاد عسکری تنظیموں کے کمانڈروں کے زیر استعمال ہیں۔ یہ جہاد ہو رہا ہے یا جرائم پیشہ افراد کی عیاشی کا سامان۔

ii۔ اسمگلنگ:

ناول میں ایک کردار زبیر کا ہے جو فخر النساء سے شادی کرتا ہے۔ جرائم پیشہ ہے اور شراب کا رسیا ہے۔ فخر النساء کو لے کر کشمیر میں آجاتا ہے۔ وہاں انڈین بارڈر کے نزدیک چودھری سلطان کا مہمان بن جاتا ہے۔ وہ دراصل شراب اور سونے کا اسمگلر ہے اور سرحد پار سے اسمگلنگ کرتا ہے۔ افسر شاہی سے اس کے بڑے رابطے ہیں۔ پاکستان سے اسے اسمگلنگ کے لیے مال زبیر فراہم کرتا ہے۔ پھر یہ مال براستہ کشمیر مقبوضہ کشمیر سے ہندوستان جاتا ہے اور وہاں کا مال ادھر پاکستان میں آتا ہے۔ اسمگلنگ ایک سیاسی جرم ہے کیونکہ اس سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔ یہ لوگ ملک میں مصنوعی قلت پیدا کر کے لوگوں کو بعد میں وہی چیز مہنگے داموں فروخت

کرتے ہیں۔ ڈالر اپنے اکاؤنٹ میں رکھتے ہیں جبکہ اپنے روپے پر بھروسہ نہیں کرتے۔ ان سمگلروں کے کاموں کا جائزہ ناول نگار نے اس طرح لیا ہے۔ یہاں پر اسمگلنگ کا سبب غربت اور مال بنانا دکھایا گیا ہے :

> ”نہیں قطعاً کوئی مسئلہ نہیں اور بہت سی جگہیں ہیں۔ آج رات کسی بھی وقت خچروں پر مال آئے گا۔ کیپٹن اعجاز نے کیپٹن سوہنا سنگھ سے بات کرلی ہے۔ بکروالوں کے آٹھ دس خچر ہوں گے، لیکن وہ کوٹھی کے پچھواڑے سے آئیں گے۔ انھیں راستے کا پتہ ہے۔ فرنٹ سے یہ کوٹھی دومنزلہ ہے لیکن پیچھے سے چھ منزلوں پر مشتمل ہے۔ چاچا دو چار جماعتیں پڑھا ہوا ہے اور میرے کوڈ سمجھتا ہے۔ حالات کا جائزہ لے کر میں اسلم کو سگنل دوں گا تو وہ پانچ چھ چکر لگا کر مال اُٹھالے گا“۔(۲۱)

یہاں اسمگلنگ کا طریقہ یہ بتایا گیا ہے کہ دوران اسمگلنگ پہلے سرحد کے ایک طرف سے فائر ہوتا ہے، پھر دونوں طرف سے فائرنگ شروع ہو جاتی ہے تو اسمگلروں کو پتہ چل جاتا ہے کہ سامان اس بار چلا گیا ہے اور ہمارا سامان اندر آگیا ہے۔ زبیر باتوں باتوں میں فخر لنساء کو کہہ رہا ہے کہ دیکھنا کتنی جلدی میرا یہ ہیروئن کا کاروبار بمبئی اور یورپ تک پھیل جائے گا۔ اب تو یہ صرف دوملکوں میں ہے۔ میرا ایک جاننے والا بابا راولپنڈی میں ٹھیا لگاتا تھا۔ پھر اس نے ہیروئن کا کاروبار کیا اور اب وہ ایک ارب پتی آدمی بن گیا ہے۔ سارے بڑے لوگ دھندہ کرتے ہیں۔ ہم کرلیں گے تو کون سی قیامت آئے گی۔ کوئی بھی بڑا کام ہو رسک تو لینا پڑتا ہے۔ آگے چل کا ناول نگار کہتا ہے کہ اصل ڈاکو چور تو حکومتی ایوانوں میں بیٹھے ہیں جو ہر چیز اور جرم کے مہاڈاکو ہیں۔ وہی قانون بناتے ہیں اور انہی کے پاس قومی خزانے کی کنجیاں ہیں۔ حلف تو اللہ تعالیٰ کے کو حاضر ناظر جان کر کرتے ہیں لیکن پھر کروڑوں عوام پر اپنے پالتو ڈاکوؤں کے ذریعے حکومت کرتے ہیں ملاحظہ کریں:

> ”یہاں کوئی ڈاکو نہیں۔ اصل ڈاکو تو حکومتی ایوانوں میں رہتے ہیں۔ مہاڈاکو دارالحکومت میں بڑے طنطنے سے براجمان ہیں۔ اللہ کو حاضر ناظر جان کر اُٹھایا ہوا حلف بڑی ڈھٹائی سے توڑ ڈالا اور شب خون مار کر کروڑوں عوام کی منشا کے خلاف ان کے سروں پر مسلط ہو گیا۔ قومی خزانے پر قابض ہوا اور اپنے گینگ کے ساتھی ڈاکوؤں میں لٹاتا رہا ہے۔ کمر توڑ مہنگائی پر بیان دیتا ہے کہ ”آٹا مہنگا ہو گیا تو کیا مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی خود اس کے حواری دنیا بھر کی آسائشیں بے دریغ سمیٹ رہے ہیں لیکن بھوکے عوام کو جہاد میں جھونکا جا رہا ہے تاکہ مسلم دنیا کی قیادت کرنے کا خواب شرمندہ تعبیر ہو۔ پڑوسی ملک میں لڑی گئی سامراج کی جنگ کو اسی لیے مقدس جہاد قرار دیا گیا“۔(۲۲)

ناول میں جرائم کرنے والوں کی سوچ کو سامنے لایا گیا ہے کہ وہ کس طرح بڑوں کو دیکھ کر ایسا بننے کی کوشش کرتے ہیں کہ ایک چھوٹا اسمگلر کس طرح ڈھٹائی سے یہ کہہ رہا ہے کہ ہر طرف چور بازاری ہے اگر میں ایسا کرتا ہوں تو ہمارا بادشاہ بھی چور ہے جو ہر جرم میں سب سے آگے آگے ہے۔ افغانستان میں تو معاشی بدحالی ہے۔ انتظامی ڈھانچہ کمزور ہے، وہاں بیرونی مال کی کھپت کم ہوتی ہے۔ ہمارا سمگلر افغانی تاجر سے مل کر جاپان، روس یورپ سے اشیاء درآمد کرتے ہیں وہ پاکستان میں فروخت کر دیتے ہیں۔ جس سے ٹیکس دینے والے افراد کو نقصان جبکہ ٹیکس چوروں کی چاندی ہو جاتی ہے۔ یہ لوگ اپنے گودام ایسی جگہوں پر بناتے ہیں جہاں دو اضلاع، دو صوبوں یا پاکستان اور آزاد کشمیر کی سرحدیں ملتی ہیں۔ اگر ایک علاقے کی پولیس ان کا پیچھا کرتی ہے تو یہ بھاگ کر ضلع، صوبے یا ملک کی سرحد پار کر جاتے ہیں۔ پولیس کو بھی جل دے جاتے ہیں۔ اسمگلر لوگ ملک کی معاشی کمر توڑ دیتے ہیں جس سے زرِ مبادلہ کم ہو جاتا ہے جس کا خسارہ پورا کرنے کے لیے عالمی مالیاتی اداروں سے سخت شرائط پر قرض حاصل کیا جاتا ہے جس سے مہنگائی کا طوفان آتا ہے۔ عوام پس کر رہ جاتے ہیں۔ ناول نگار بھی معاشرے کا فرد ہوتا ہے۔ مہنگائی کی چکی میں وہ برابر کا پستا ہے۔ آٹا، سبزی اس کو بھی باقی عوام کی طرح مہنگا ملتا ہے۔ اس لیے وہ ہر اس معاشرتی جرائم کو ختم کرنے کا مطالبہ کرے گا جس سے عوام براہ راست زد میں آتے ہوں۔

iii۔ فخر النساء کا زبیر اسمگلر کو قتل کرنا:

"برف" ناول جرائم سے بھرا پڑا ہے۔ اس میں دہشت گردی اور جابجا قتل کے واقعات کا ذکر ہے۔ سب سے زیادہ اور بڑا واقعہ جس میں ناول کے ہیرو ظفر کے ہاتھوں مولوی عمر فاروق کا قتل ہے۔ عمر فاروق کے قتل کے بعد کئی قتل ناول کا حصّہ ہیں لیکن ایک قتل فخر النساء کا اپنے خاوند زبیر کا ہے جو جوا، ہیروئن فروش، اسمگلر اور شراب فروش بھی ہے۔ زبیر دھوکے سے فخری سے شادی کرتا ہے پھر اسے لے کر آزاد کشمیر میں چودھری سلطان جو علاقے کا بڑا اسمگلر بھی ہے اس کا پارٹنر بھی ہے، کے ہاں ہنی مون منانے کے لیے چلا جاتا ہے۔ ساتھ ساتھ اپنا سمگلنگ کا دھندہ بھی کر رہا ہے۔ وہ فخر النساء نے کہا کہ میں بی اے کرنا چاہتی ہوں۔ زبیر اس کا پورا پورا ساتھ دیتا ہے، وہ ہائی سکینڈ ڈویژن میں بی اے کر لیتی ہے۔ زبیر اسے پہلے ریوالور چلانا سکھاتا ہے پھر اس کے بعد اے کے ۴۷ کو چلانا سکھاتا ہے۔ وہ فخری کو یہ بھی بتاتا ہے کہ ایک آنکھ بند کر کے گولی چلائی جائے تاکہ نشانہ خطا نہ ہو۔ ایک دن وہ فخری کو لے کر پہاڑوں میں جاتا ہے۔ ایک بڑا پتھر اٹھا کر یہ کہتا ہے کہ فرض کریں کہ یہ بندے کا سر ہے اور آپ نے نشانہ لے کر فائر کرنا ہے لیکن فائر بار بار خطا ہو جاتا ہے۔ زبیر ہر بار سختی سے پیش آتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ شراب بھی پی رہا ہوتا ہے۔ فخری نے نشانہ باندھا اور ٹرائیگر دبایا۔ یکے بعد دو تین فائر نشست پر لگتے ہیں۔ زبیر خوش ہوتا ہے اور یہ کہتا ہے کہ آپ کی فرسٹ ڈویژن پکی ہو گئی ہے۔ لیکن فائر کیا ہوئے کہ فخری کے دل کی دھڑکن رکنے کا

نام ہی نہیں لے رہی۔ اب زبیر بلندی پر کھڑا ہو جاتا ہے اور فخری کو کہتا ہے کہ میرے سامنے بڑے پتھر پر رکھا ہوا چھوٹا پتھر آپ کا نشانہ ہے۔ نشست باندھ کر پھر اسی طرح فائر کرو۔ فخری نے زبیر کی آواز فائر سنتے ہی پہلے ایک سگنل فائر کیا۔ فائر خطا ہو گیا۔ زبیر سخت ناراضی کا اظہار کرتا ہے پھر اس کو حکم دیتا ہے کہ فائر فخری زبیری کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور کوئی لمحہ ضائع کئے بغیر نالی کا رخ زبیر کی طرف بڑھا دیتی ہے۔ فری ایکشن سے میگزین کی تمام گولیاں زبیر کے سینے میں اتار دیتی ہے۔ زبیر اوندھے منہ ہو کر گہری کھائی میں جا گرتا ہے۔ پہلے تھوڑا سا تڑپا پھر ایک چٹان کی اوٹ میں ساکت ہو گیا۔ فری گھبراہٹ سے پھسل کر نیچے کھائی میں گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے۔ قتل کا سن کر چوہدری سلطان کا دماغ چکرا جاتا ہے کہ میرے علاقے میں میرے گھر کے پاس میرے مہمان کو کسی نے قتل کر دیا ہے۔ میرے لئے ڈوب مرنے کا مقام ہے۔ تھانہ چوکی ساہنی سیکٹر نے رات دن ایک کر دیا۔ علاقے بھر کے چروا ہے اور مشکوک افراد کو مار مار کر بھرکس نکال دی لیکن قاتل کا کوئی پتہ نہیں چلا۔ اس واردات کو ناول نگار محمد الیاس نے اس طرح قلم بند کیا ہے:

> "فری ایکشن کے ذریعے میگزین میں بچی ہوئی تمام گولیاں بوچھاڑ کی صورت میں فائر کر دیں۔ زبیر پیٹھ کے بل کھڈ کے پیندے میں گرا اور پھڑکتے ہوئے لٹو کی طرح تیزی سے گھوم گیا۔ چند لمحے ہی تڑپا تاہم اسی دوران میں جسم ایک چٹان کی اوٹ میں جا کر ساکت ہو گیا"۔ (۲۳)

فخری نے اپنے شوہر زبیر کو کل تیرہ گولیاں ماریں۔ جن کی تصدیق پوسٹ مارٹم رپورٹ میں ہوئی۔ جبکہ فخری پھٹی پھٹی نگاہوں سے ہر ایک کو دیکھتی، سگریٹ مانگتی، کش لگاتی اور یہی کہتی کہ میں چٹان کی طرف دوڑی۔ جب میں نے تڑتڑ گولیاں چلتی دیکھیں۔ کیس کو داخل دفتر کر دیا جاتا ہے۔ کیوں کہ یہ ایک اندھا قتل تھا جس کا کوئی سرا پولیس کو نہیں ملا۔ لیکن قتل تو قتل ہے ایک انسان کا قتل پوری انسانیت کا قتل ہوتا ہے۔ ناول میں زبیر کو اس قدر شرابی اور جرائم پیشہ دکھایا گیا ہے کہ اس کے مرنے پر کسی کو کوئی دکھ نہیں حالانکہ قاتل تو اس کی بیوی ہے۔ اس قتل کا سبب وہ مار پیٹ ہے جو زبیر روز فخر النساء کے ساتھ کرتا تھا۔ زبیر کا اسمگلنگ کا کاروبار پہلے اس کی ماں سلطانہ بیگم سنبھالتی تھی پھر بیٹے کی المناک موت کے بعد وہ بیمار ہو گئی۔ اب کاروبار زبیر کا بہنوئی اور بڑا بھائی چلا رہے تھے۔ کیونکہ شہر میں بڑا منظم جوا خانہ ان کا تھا۔ ان کی ماں کے حکم کے مطابق جوا خانے کا ایک چوتھائی آمدنی کا حصّہ غرباء کے لیے مختص تھا۔ روزانہ غریب، نادار اور بیوہ خواتین کوٹھی میں آجاتیں تو ان

میں رقم تقسیم کر دی جاتی۔ بعض سفید پوش عورتیں رات کے اندھیرے میں آجاتیں تو ان کی ضرورت بھی پوری کر دی جاتیں۔

محمد الیاس نے معاشرے کے جرائم کو بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے اور کرداروں کے چناؤ میں اپنی مہارت کا ثبوت دیا ہے۔ ہمارے شہروں میں بڑے بڑے دستر خوان لگانے والے حضرات جرائم پیشہ ہیں۔ بحریہ دستر خوان والے پر ناجائز لوگوں کی زمینوں پر قبضہ کرنے کا الزام ہے۔ شہر کے جتنے بھی جوا خانے والے ہیں، سب سے زیادہ یہ لوگ دیگیں دیتے ہیں تا کہ ان کے جرائم پر پردہ پڑا رہے اور لوگ انھیں لینڈ مافیا اور منشیات مافیا کی بجائے عوامی شخصیت کہیں۔ ہمارے ہاں ایسے معزز چوروں کی کثرت ہے جن کو ناول نگار نے بے نقاب کیا ہے۔

iv۔ جعلی ویزوں کا کاروبار اور منی لانڈرنگ:

زبیر کے قتل کے بعد فخر النساء بیمار ہو جاتی ہے۔ اس کے والد شیخ نورالسلام اسے لے کر اسلام آباد کے ایک بڑے سائیکالوجسٹ کے پاس آتے ہیں۔ فخر النساء جو کسی زمانے میں سخت پردے کی پابند تھی گلے میں دوپٹہ ڈالا ہوا ہے اور سیاہ زلفیں شانوں پر ڈالے کلینک میں جاتی ہے۔ ڈاکٹر نے کہا کہ ہلکا سا دماغی دباؤ ہے جلد ٹھیک ہو جائے گی۔ کلینک کے باہر آکر ایک خوبصورت عربی حاطب ابن عبادہ سے ان کی ملاقات ہوتی ہے جو اپنی خوبصورت لینڈ کروزر میں آیا ہوا تھا۔ اس نے بتایا کہ میں نے آپ کو مدینہ منورہ میں دیکھا تھا۔ شیخ نورالسلام اسے مل کر بڑے خوش ہوئے۔ پھر عربی حاطب نے بتایا کہ میں فائیو سٹار ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ آپ میرے ساتھ فیملی سمیت کھانا کھائیں۔ کھانا کھانے کے بعد اس نے شیخ السلام کو اپنا کارڈ دیا۔ دو دن کے بعد اعتماد میں لے کر لڑکی کے رشتے کی بات کر دی اور کہا کہ میری پہلی بھی دو بیویاں ہیں لیکن میں انصاف کے ساتھ تیسری بیوی کے نان ونفقہ کا ذمہ لیتا ہوں۔ میرے پاس پیسہ بہت ہے۔ میں نے کرنل قذافی جو لیبیا کے سربراہ ہیں سے کہا ہے کہ آپ پاکستانی بھائیوں کے لیے مجھے کچھ ویزے عطا کر دیں کیونکہ وہ مجھے اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتے ہیں۔ میری والدہ پاکستانی تھیں اور میں اپنے ننھیال کا بھلا کرنا چاہتا ہوں۔ میں صبح کراچی جا رہا ہوں۔ پھر وہاں سے مصر اور لیبیا چلا جاؤں گا کیوں کہ اسلام آباد میں اب میرا کام اس وقت ہو گا جب ویزے لگوانے ہوں گے۔ فخر النساء اور والد شیخ نورالسلام اس عربی سے بڑے متاثر تھے۔ انھوں نے فخر النساء سے پوچھ کر اس کا تیسرا نکاح اس عربی حاطب سے کر دیا۔ دس لاکھ روپے حق مہر بمعہ ایک عدد اسلام آباد میں کوٹھی اوپر سے ہیرے جواہرات اور سونے کے زیورات الگ۔ لیکن وہ تو ایک دھوکے باز آدمی تھا۔ اس کا نام شہزاد عرف منگا تھا۔ کبھی وہ انٹیلی جنس بیورو کا جعلی انسپکٹر تو کبھی وہ اپنا نام چوہدری شہباز خان لکھتا۔ سادہ لوح یورپ پلٹ لوگوں کو لوٹتا اور

بلیک میلنگ جیسے جرائم کرتا تھا۔ وہ ڈاکخانے کا ملازم تھا۔ جعلی مہریں بناتا اور لوگوں کو لوٹتا تھا۔ وہ لوگوں کے خط کھول کر پڑھ لیتا اور حوالہ ہنڈی کے ذریعے رقم بھجوانے گجرات، کھاریاں، جہلم، میرپور، گوجر خان کے لوگوں سے پیسے بٹورتا۔ منگا نے پیسے لینے کے لیے کوڈ ورڈ رکھے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ گجرات میں جرائم پیشہ لوگوں کے ہاں پھنس گیا تو انہوں نے جوتے مار مار کر بھرکس نکال دیا۔ پھر منگا رستم شیر ولی کے نام پر جعل سازیاں کرنا شروع ہو گیا۔ پھر اس نے نیشنل انسٹیٹیوٹ آف ماڈرن لینگویجز سے عربی اور انگریزی زبان میں مہارت حاصل کی اور جہلم کے کچھ نوسربازوں سے مل کر جعلی کرنسی کا کاروبار شروع کر دیا اور بہت جلد اچھا خاصا پیسہ اکٹھا کر لیا۔ پھر منگا نے خان وجاہت علی تبسم کے نام سے شناخت بنائی اور بیرون ملک افرادی قوت کی سپلائی کا لائسنس حاصل کر لیا۔ اس نے لیبیا کا ویزا حاصل کیا تو وہاں سے سچ مچ کے کافی ویزے حاصل کیے۔ اس کے بعد اس نے جعلی ویزوں کے کاروبار میں مہارت پیدا کی۔ کئی لوگ منزل پر پہنچ گئے، کئی راستے میں مارے گئے لیکن صحیح کے ساتھ جعلی ویزے زیادہ ہوتے۔ وہ ایک سفید پوش جرائم پیشہ گروہ کا سربراہ تھا۔ اس کی تصویر ناول نگار نے اس طرح کھینچی ہے :

> "بے شمار غرض مندوں کو جعلی کاغذوں پر باہر بھیج دیا۔ کئی قسمت سے بچ گئے اور منزل پر پہنچ گئے تو بہت سے دھر لیے گئے اور بعض بدقسمت جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ کراچی میں اس نے کئی رہائشیں تبدیلی کیں لیکن خطرہ بڑھتا گیا"۔(۲۴)

اس کے پاس لیبیا کے لیے پانچ سو ہنرمندوں کے ویزوں پر مشتمل دستاویزات کی ایک فائل اس کے پاس تھی۔ اس نے ایجنٹوں کو سو سو ویزے تقسیم کر رکھے تھے۔ آدھے پیسے پہلے لے رکھے تھے۔ آدھے ویزہ لگنے کے بعد جب ان کو پاسپورٹ مل جائے۔ اکثر ایجنٹوں کو دور دراز کے علاقوں سے لیا جاتا تاکہ فراڈ کرنے میں آسانی ہو۔ ایک آزاد کشمیر سے، دوسرا کوہستان، تیسرا مینگورہ، چوتھا سوات، پانچواں ڈیرہ غازی خان سے۔ منگا نے کئی جعلی شناختی کارڈ بنوا رکھے تھے۔ اڑھائی کروڑ روپے وصول کر لیے تھے باقی کے لیے پانچ دن کا ٹائم دے دیا۔ پانچ دنوں کے بعد وہ اسلام آباد سے فرار ہونے کے چکروں میں تھا۔ ایجنٹوں نے اس کو سو سو پاسپورٹ کے پیسے دیے تھے۔ منگا ان سے رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ ہر کوئی حاطب ابن عبادہ المصری سے رابطہ کرتا تھا لیکن وہ منگا رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ ملک یاسین، افضل بٹ، زمین خان سب پریشان تھے کہ اب ہمارے پیسوں اور پاسپورٹ کا کیا ہو گا؟ پھر انہوں نے اس کا پیچھا کر کے اس منگے خان کو گولی مار دی۔ پولیس نے ان سب کو گرفتار کر لیا۔ پانچ سو پاسپورٹ اور جعلی کاغذات کو قبضے میں لے لیا۔ جعلی پاسپورٹ جو پاکستانی سفارتخانے سے حاطب ابن

عباد کے نام سے جاری ہوا تھا۔ اس کو بھی قبضے میں لے لیا۔ فخر النساء کے نام پر حق مہر کے جعلی چیک بھی ملے۔ پولیس نے لینڈ کروزر اور سارا سامان قبضے میں لے کر کارروائی مکمل کی۔ فخر النساء سے اگر کوئی لیڈی پولیس والی تفتیش کرتی تو قارون اور موسیٰؑ کا قصہ چھیڑ دیتی۔ پولیس والوں نے یہ سمجھا کہ یہ عورت تو پاگل ہے۔ منگا کی لاش کو والدین نے لینے سے انکار کر دیا۔ پولیس والوں نے لاوارث قرار دے کر دفن کر دیا۔ اس کو ناول نگار نے یوں بیان کیا ہے:

"اللہ نے جس شخص کو بہت سی غیر معمولی صلاحیتیں عطا کیں، کفران نعمت کا مرتکب ہوا۔
وہ بدنصیب شخص حرام موت مارا گیا۔ پولیس نے منگا خاں عرف شہزاد عالم والد اللہ دتہ
چھوڑے والا قوم دب گر چمرنگ کی فائل بند کر دی۔"(۲۵)

ناول نگار نے ایسے جرائم کا ذکر کیا ہے جس سے ملک کو نقصان ہوتا ہے۔ اس کی بیرون ملک ساکھ خراب ہوتی ہے۔ لوگ اپنے پیاروں کے لیے اور پیارے اپنے گھر والوں کے اچھے دنوں کے لیے زمین، زیورات تک فروخت کر کے بیرون ملک جانے کے لیے ویزے حاصل کرتے ہیں لیکن جب ان کے ساتھ فراڈ ہو جاتا ہے تو اکثر ایران، ترکی کے بارڈر پر یا خلیج اور سعودی عرب کی جیلوں میں پڑے رہتے ہیں اور ان دو نمبر جعلی پاسپورٹ بنانے والوں کو کوستے ہیں۔ اکثر بارڈر سکیورٹی فورس کی فائرنگ سے اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔ گوجرانوالہ، گجرات اور سیالکوٹ کے اکثر لوگ ڈنکی ویزہ پر ایران کا بارڈر پار کر جاتے ہیں۔ ایجنٹ ان کو سنہرے خواب دکھاتے ہیں لیکن بیچ منجدھار چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ پھر نہ تو ان لوگوں کو مقامی زبان آتی ہوتی ہے اور نہ ان کے پاس ڈالر ہوتا ہے جس سے وہ اپنا کام چلا سکیں۔ اکثر ہم آئے روز اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ کنٹینر میں ڈال کر بارڈر کراس کرایا جا رہا تھا کہ لوگ دم گھٹنے سے مر گئے۔ ہمارے عربی بھائی بالخصوص سعودی بڑے ظالم ہیں جو خارجیوں کے ساتھ غیر انسانی سلوک کرتے ہیں۔ ان کے پاسپورٹ، مزدوری بلکہ پیسے دینے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ مجرم تو وہ لوگ ہیں جو یہ جعلی ویزوں کا کاروبار کرتے ہیں۔ ہمارے پاکستانی معاشرے میں ایسے جرائم پر ناول نگار نے تنقید کی ہے کہ کس طرح ایک آدمی نے عربی روپ دھار کر لوگوں کو لوٹا۔ حقیقت میں وہ کچھ بھی نہیں تھا۔ حقیقت میں یہ طنز ہماری کمزور معیشت پر ہے۔ اگر ہمیں یہاں کام ملے تو ہم محنت کریں۔ کیوں غیر ملک میں جا کر مزدوری کریں۔ لیکن ۷۵ سال سے نااہل حکمرانوں نے قرض پر قرض لے کر ملک کی اقتصادی حالت کو بہت کمزور کر دیا ہے جس سے لوگ جائز اور ناجائز طریقے سے بیرون ملک جانے کے لیے جان تک کی بازی لگا دیتے ہیں۔ ہم اپنے گاؤں یا آزاد کشمیر، گجرات، کھاریاں، سیالکوٹ اور گوجرانوالہ کے گاؤں کو دیکھتے ہیں کہ کھیتوں میں عالیشان کوٹھیاں بنی ہوئی ہیں۔ یہ سب بیرون ممالک کام کرنے والے پاکستانیوں کی

محنت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ سالانہ زرِ مبادلہ بھی ۳۰ارب ڈالر کے لگ بھگ ہے لیکن غیر قانونی کام کرنے والے مجرمین کی بھی کمی نہیں جن کا ذکر محمد الیاس نے اپنے ناول میں کیا ہے۔ ایف آئی اے کے ریکارڈ کے مطابق ہر سال جعلی ویزوں کی تعداد لاکھوں میں ہوتی ہے جن میں سرِ فہرست ممالک میں سعودی عرب، یونان، برطانیہ، امریکہ، کینیڈا اور آسٹریلیا ہیں۔ جعلی ویزے سیاسی جرائم میں شمار ہوتے ہیں جن کا ذکر ناول نگار نے کیا ہے اس میں اصل جرم غربت اور بے روزگاری کو قرار دیا ہے۔

v۔ دہشت گردی:

دہشت گردی ایک ایسا موضوع ہے جس پر تقریباً ہر ناول نگار نے لکھا ہے۔ خصوصاً اردو ناول نگاروں نے ہمارا ملک پاکستان گزشتہ دو دہائیوں سے اس لعنت کا شکار ہے۔ اب تک قانون نافذ کرنے والے اداروں اور سول عوام سمیت ۸۰ ہزار جانوں کا ناحق ضیائع ہو چکا ہے۔ دہشت گردی ہے کہ ختم ہونے کا نام نہیں لیتی۔ پاکستان دنیا کا واحد ملک ہے جس نے دہشت گردی پر قابو پایا ہے۔ محمد الیاس کا ناول ''برف'' ایک بہت بڑا ناول ہے۔ اس میں دیگر جرائم کی پیشکش کے علاوہ دہشت گردی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور اس کے اسباب و محرکات کا جائزہ بھی لیا گیا ہے۔ اگرچہ پاکستان میں دہشت گردی کا کی ابتدا نائن الیون کے بعد امریکی جنگ کا حصّہ بننے سے ہوئی۔ جب کہ اس سے پہلے پاکستان میں افغانستان کے راستے انڈین ایجنسی را اور موساد مل کر دہشت گرد کارروائیوں میں ملوث تھے۔ جبکہ اَسی کی دہائی میں روس کی ایجنسی خاد بھی ان کے ساتھ شامل تھی۔ دہشت گردی سے قومیں اور معاشرے تباہ ہو جاتے ہیں۔ ناول زندگی اور سماج کی حقیقتوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ نائن الیون کی وجہ سے جہاں افغانستان پر امریکی بمباری کی صورت میں مسلسل نقصان برداشت کرنا پڑا وہاں پاکستان بھی دہشت گردی کی زد میں رہا۔ پاکستان تو ۱۹۸۰ء سے ہی فرقہ واریت اور دہشت گردی کی لپیٹ میں رہا ہے لیکن نائن الیون کے بعد اس میں شدت آگئی۔ وہی لوگ جو جہادِ کشمیر میں حصّہ لے رہے تھے امریکی ساتھ دینے پر پاکستان مخالف سرگرمیوں میں حصّہ لینے لگے۔ انہوں نے تحریک طالبان پاکستان بنالی جس نے فوج، پولیس، وکلا، ڈاکٹر، علما، سیاستدان، طلباء، سکول، کالج، یونیورسٹی، ہسپتال غرض کہ چوراہوں تک کو خون میں نہلا دیا۔

vi۔ نائن الیون اور دہشت گردی:

سب سے پہلے اس بات کی وضاحت کر لی جائے کہ ناول نگاروں اور پوری دنیا کو جس واقعے نے متاثر کیا وہ کیا ہے جس سے سنگین قسم کی دہشت گردی نے جنم لیا۔ نائن الیون کیا ہے۔ القاعدہ کے کارندوں نے چار تجارتی ہوائی جہازوں کو ہائی جیک کر لیا اور انہیں ۹ ستمبر ۲۰۰۱ء کو نیویارک میں ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور واشنگٹن ڈی سی

میں پینٹا گون سے ٹکرا دیا۔ چوتھا طیارہ شنکس ول پنسلوینا کے ایک میدان میں گر کر تباہ ہو گیا۔ ان واقعات میں تین ہزار کے قریب افراد ہلاک ہوئے۔ اگرچہ افغانستان القاعدہ کا اڈا مانا جاتا ہے لیکن ان ہائی جیکروں میں کوئی بھی افغانی موجود نہیں تھا۔ محمد عطا جو کہ ایک مصری تھا، نے اس گروپ کی قیادت کی تھی اور پندرہ ہائی جیکر سعودی عرب سے آئے تھے۔ اس وقت کے امریکی صدر جارج ڈبلیو بش نے دہشت گردی کے خلاف جنگ جیتنے کا عزم کیا اور بعد میں افغانستان میں القاعدہ اور اسامہ بن لادن کے خلاف کارروائی کا آغاز کر دیا۔ اس کے بعد امریکہ نے ایک قرارداد کے ذریعے نائن الیون کے ذمہ داروں کے خلاف طاقت کے استعمال کی اجازت چاہی جو مل گئی۔ اس مشترکہ قرارداد کے بعد بش انتظامیہ نے اس کو قانونی جواز کے طور پر پیش کیا۔ جو کہ اس نے افغانستان پر حملہ کرنے سے لے کر عدالتی حکم کے بغیر لوگوں کو گوانتاموبے کیوبا کے حراستی کیمپ میں ڈالنے اور دہشت گردی سے نمٹنے کے لیے وسیع پیمانے پر اقدامات کرنے کے لیے کیے۔ امریکہ نے افغانستان میں ڈیزی کٹر بموں اور مہلک ہتھیاروں کا بے دریغ استعمال کیا۔ پاکستان جو ان کا اتحادی تھا اپنے تمام ہوائی اڈے امریکہ کو دے دیے۔ امریکہ نے تحریک طالبان پاکستان کھڑی کر دی جس نے سب سے زیادہ پاکستان کو نقصان پہنچایا۔ قبائلی علاقے ان غیر ملکیوں کی آماجگاہ بن گئے۔ روز خودکش حملے ہونا شروع ہو گئے۔ ۲۰ سالوں میں پاکستان نے لاتعداد بلکہ اَسی ہزار جانوں کا نذرانہ پیش کر کے جنگ جیت لی۔ اس واقعے کو جہاں اردو ناول نگاروں نے پیش کیے اس سے زیادہ مغربی ناول نگاروں نے پیش کیے۔ مغربی ناول نگاروں نے دہشت گردی کو اسلام سے جوڑنا شروع کر دیا۔ جبکہ اردو ناول نگاروں نے امریکہ کو فساد کی جڑ اور برائی کا منبع قرار دیا۔ پوری دنیا میں دہشت گردی کے حوالے سے نت نئے مباحث سامنے آنے لگے۔ اسلام، پاکستان اور مسلمانوں کے حوالے سے منفی پروپیگنڈا کیا جانے لگا۔ ناول جو کی معاشرے کا عکاس ہوتا ہے پوری دنیا نے اس پر کھل کر لکھا۔ انگریزی میں "Fixllin Man" کا DoN Deillo کا The Good Life کا The Zero Tay Mclnery، کا Tese Walter محسن حامد کا ناول The Relctant Fundamantlist جس کا موضوع بھی مسلم جہادی ہیں۔ جس کا مرکزی کردار احمد ایک مصری مسلمان ہے۔ نعیم بیگ کا ناول "ٹرپنگ اسکول" ۲۰۱۰ء میں شائع ہوا جس میں نائن الیون کے بعد پاکستان میں دہشت گردی کے اثرات کا جائزہ ہے۔ اکرام بریلوی کا ناول "حسرت تعمیر" ۲۰۰۶ء میں شائع ہوا۔ اس ناول کی کہانی پاکستان، افغانستان، مشرق وسطیٰ کی سرزمین کا احاطہ کرتی ہے۔ مستنصر حسین تارڑ کا " قلعہ جنگی"، سرفراز بیگ کا ناول "پس آئینہ" ۲۰۱۳ء میں شائع ہوا جس میں بتایا گیا کہ دہشت گرد پاکستان یا مسلمان نہیں امریکہ خود ہے۔ ڈاکٹر احمد صغیر کے مطابق:

> "۱۱ ستمبر ۲۰۰۱ء کو امریکہ کے ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گن پر حملہ ہو جانے کے بعد امریکہ نے افغانستان کو موردِ الزام ٹھہرایا۔ نیٹو اور دوسرے ممالک کی مدد سے اسے تباہ و برباد کر

دیا۔ ملکی اور بین الاقوامی سطح پر جو سازشیں ہو رہی ہیں۔ امریکہ جو ساری دنیا پر تسلط قائم کر ناچاہ رہا ہے اور ملکی سطح پر مسلمانوں کو شک کی نگاہوں سے دیکھا جانا۔ یہ سب ایسے مسائل ہیں جن سے ناول نگار بے حد متاثر ہوئے۔ یہ ناول بھی اسی پسِ منظر میں لکھا گیا۔"(۲۶)

محمد الیاس نے اپنے ناول میں دہشتگردی کا سبب ان لوگوں کو قرار دیا جو پیسہ لے کر ملک دشمن لوگوں کا آلہ کار بن گئے۔ کچھ لوگ فدائین تیار کرنا شروع ہو گئے کیونکہ اس کے بدلے ڈالر ملتے تھے فدائین کی برین واش کر کے ان کے داڑھی اور سر کے بال بڑھا کر ان کو جنت کا ٹکٹ دیا جاتا تھا۔ یہ وہ جرائم ہیں جو سیاسی جرائم کی مد میں آتے ہیں۔ ان کی تصویر محمد الیاس نے یوں اتاری ہے:

"رضوان جیسا مجاہد اپنے بیٹے کو انگلش سکول میں پڑھا رہا ہے اور جنوبی وزیرستان میں بیٹھ کر مقامی ساتھیوں سے فدائین تیار کر رہا ہے اور وہ جو اپنے آپ کو ظفر کا سالار بتا رہا تھا۔ آخری ملاقات میں ہولناک انکشافات کرتا رہا کہ مفلس اور نادار والدین کے نوعمر لڑکے قلیل معاوضے پر حاصل کر کے فدائین تیار کرتا ہے اور معروف مذہبی انتہا پسند عسکری تنظیموں کے ہاتھوں کئی گنا منافع پر فروخت کر دیتا ہے"۔(۲۷)

ناول نگار محمد الیاس کے مطابق اصل مجرم ہماری اعلیٰ قیادت ہے جس نے ایک ٹیلی فون کال پر ملک کی سالمیت کو داؤ پر لگا دیا۔ نہ کہ یہ فدائین اور بے گناہ مرنے والے لوگ۔ ہمارا حکمران اس سازش کا حصّہ بن گیا ہے جو غیروں نے تیار کی ہے اس کے مطابق :

"میں لکڑی چیرنے والی آری کے دندانے خوب تیز کر کے قاری کو دیتا ہوں تو وہ ایک خوبصورت نوعمر لڑکی کی گردن پر چلا دیتا ہے۔ بی بی جان کے خیال میں وہ لڑکی مملکت خداداد بھی ہو سکتی ہے۔ مجھے مشورہ دیں کہ میں آری کے دندان تیز کرنا چھوڑ دوں"۔(۲۸)

ناول میں جو اہم بات بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ بعض لوگ تو واقعی دہشت گرد تھے لیکن بعض کو ویسے ہی دھر لیا گیا کہ ان کا ریکارڈ سابقہ افغان روس وار اور جہاد کشمیر میں رہا ہے۔ لہذا یہ لوگ بھی ٹی ٹی پی کے اہلکار ہیں۔ اس سے پہلے حکومت نے سرِ عام جہاد کشمیر فنڈ جمع کرنے کی اجازت دی تھی لیکن اب اسے ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ناول کا مرکزی کردار شیخ نورالسلام ایسے ہی ایک بندے کو اپنے ہاں ٹھہراتا ہے جس کا نام محمد اکبر ہے۔ امریکہ سے ڈی پورٹ ہو کر آیا ہے اور وہ پکا ہسٹری شیٹر تھا۔ پہلے اس کی داڑھی چھوٹی تھی اب اس نے بڑی کر لی

تھی۔ ملک بھر سے جہاد کی ترغیب دے کر نوجوانوں کو جنوبی وزیرستان کے جارہا تھا جہاں بڑے منظم طریقے سے نوجوانوں کی تربیت کرتا تھا۔ شیخ نورالسلام کا قصور یہ تھا کہ ایجنسیوں نے اس کو شیخ صاحب کی گاڑی میں سفر کرتے دیکھا تھا۔ یہ گوجرانوالہ کا رہنے والا ہے ایجنسیوں کو مطلوب ہے۔ شیخ نورالسلام کی گرفتاری ان لوگوں کو مالی مدد کرنے پر ہوئی تھی۔ اب اس موقعے پر ناول نگار کی رائے یہ ہے :

> ”ویسے یہ سراسر زیادتی ہے۔ اکبر افغانستان اور کشمیر میں جو کچھ کرتا رہا وہ تب قابل ستائش تھا اور اب جرم بن گیا ہے۔ یہ کہاں کا انصاف ہے“۔ [۲۹]

ملک میں افراتفری کے بارے میں ناول نگار نے لکھا ہے کہ ملک کی ایجنسیاں ملک کے لیے کام کر رہی ہیں لیکن بے گناہ لوگوں کو تنگ کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ شیخ نورالسلام ہر وقت یہ سوچتا رہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام پر حاصل کئے گئے ملک میں حکومت اور عوام باہم دست و گریباں ہیں۔ یہ کیسے حکمران ہم پر مسلط ہیں جو دہشت گردی کی تمیز نہیں کر رہے۔ لیکن وہ ملک کے مستقبل سے مایوس نہیں ہے۔ شیخ نورالسلام کے سارے خواب بکھرتے جا رہے ہیں۔ دہشت گردی اپنے عروج پر ہے۔ ملک میں آئے روز دھماکے ہو رہے تھے۔ خود کش بمبار لڑکے اپنے ساتھ بے گناہ شہریوں کے جسم چیتھڑوں میں اڑانے لگے۔ قومی اور عسکری اداروں کے افراد اور پولیس کے افسر اور اہلکار بے دریغ مار دیے جاتے۔ شیخ صاحب نے جہاں تک دین اسلام کو سمجھ رکھا تھا وہ ان تمام دہشت گرد کاروائیوں کو کسی بھی حوالے سے جائز قرار نہیں دے سکتے تھے لیکن ملک میں آئے روز ایسی کاروائیاں ملک دشمن عناصر کے حوصلے بڑھا رہی تھیں۔ آگے چل کر ناول میں ایک خود کش بمبار لڑکے کو سائیں ٹلی والا پکڑ لیتا ہے جو ایک درباری مجمعے میں دھماکہ کرنے کی نیت سے آیا تھا۔ دھماکہ وہ اپنی غربت کی وجہ سے کر رہا ہے کیونکہ اس کو بھیجنے والوں نے اس بمبار کو دس لاکھ روپے دے کر خریدا تھا۔ ایجنساں اس بمبار کے پیچھے ہیں لیکن سائیں ٹلی والا اس کو قابو کر لیتا ہے پھر اس کو پولیس کے حوالے کر دیتا ہے خود انعام لینے کی بجائے شکریہ کہتا ہے کہ ایک فقیر کو عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی انعام قابلِ قبول نہیں۔ سائیں بانکی سرکار کو لے کر جا رہا تھا تو یہ واقعہ پیش آیا :

> ”لڑکے نے مزاحمت کرنا لاحاصل سمجھ لیا تو سائیں کی مدد کے لیے کئی لوگ پہنچ گئے۔ بم ڈسپوزل والوں نے لڑکے کے جسم کی تلاشی لے کر بیلٹ الگ کر لی۔ اس کا دوسرا ساتھی جو پیچھے کور دینے کے لیے آرہا تھا زخمی حالت میں گرفتار ہوا۔ اس نے سائیں کا نشانہ لینے کے لیے ابھی کلاشنکوف سیدھی ہی تھی کہ دائیں بائیں سے فائرنگ کی زد میں آ گیا۔ چند منٹوں

کے اندر اندر پولیس کی گاڑیاں پہنچ گئیں۔ فائرنگ سے زخمی ہونے والا ۲۵ سالہ نوجوان دم توڑ گیا۔ لیکن بمبار لڑکا ہر طرح سے محفوظ رہا۔ اعلیٰ افسر آگے بڑھ کر سائیں کی بہادری اور لاجواب کارکردگی کی توصیف کرنے لگے۔ نوید سنائی کہ اس کو بہت بڑا انعام اور تمغہ دیا جائے گا۔ سائیں پر وجد کی سی کیفیت طاری تھی۔ درود شریف پڑھ کر بولا۔ بس بھئی سخی حاکمو! تمغے اور انعام اپنے پاس رکھو۔ عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو بہت بڑا انعام مل گیا ہے۔ تمہارے پاس فقیر کو دینے کے لیے کچھ نہیں۔ جاؤ اپنا کام کرو"۔ (۳۰)

"ناول نگار کے مطابق جرم وہ لوگ کر رہے ہیں جن کی تربیت میں بگاڑ ہے جو جہاد جیسے مقدس فرض کی آڑ میں مجرم بناتے ہیں۔ درسگاہوں کی تربیت کو درست کرنا لازم ہے۔ بقول علامہ اقبال:

مقصد ہو اگر تربیت لعل بدخشاں
بے سود ہے بھٹکے ہوئے خورشید کا پرتو (۳۱)

ر۔ اشرف شاد کے ناول جج صاحب میں سیاسی جرائم:

i۔ بیرسٹر کرم دیوان کا فوجی آمر کو قانونی صدر بنوانا:

اشرف شاد عصر حاضر کے نمائندہ ناول نگار ہیں، ان کے ناولوں میں "صدر صاحب"، "وزیراعظم صاحب"، "جج صاحب" اور "بے وطن" شامل ہیں۔ ان کے ناول "جج صاحب" میں انھوں نے ان جرائم کی نشاندہی کی ہے جو ہمارے ملک میں شروع سے ہی ہوتے آرہے ہیں۔ یعنی مارشل لاء پر مارشل لاء ملک کی ۵۷ سالہ تاریخ میں ۳۵ سال جرنیلوں کی حکومت کا دور رہا ہے۔ اس ناول میں اشرف شاد نے اس بات سے پردہ اٹھایا ہے کہ فوجی ڈکٹیٹر کو قانون کی قبا ایک جج اور دوسرے وکیل پہناتے ہیں۔ یہاں ناول میں ایک کردار بیرسٹر کرم دیوان کا ہے جس کی فیس کروڑوں روپے میں ہے۔ ناول کی کہانی میں ان کے سیاسی جرائم سے کچھ یوں پردہ اٹھاتا ہے:

"بیرسٹر کرم دیوان کا سب سے بڑا کلائنٹ ملک کا فوجی ڈکٹیٹر تھا اسے پھانسی لگنا چاہیے تھی۔ لیکن دیوان نے اسے آئینی صدر بنا دیا۔ بیرسٹر وسیم شاہ بھی ہر فوجی حکومت کے جوتے صاف کرتا رہا۔ وزیر بنا اور سینٹر بھی۔ دیوان کی طرح وہ بھی معززین کی فہرست میں سب سے اوپر ہے۔ لطیف موسیٰ ملک کے اربوں روپے لوٹنے والے سب سے کرپٹ سیاستدان کا وکیل تھا۔ وہ سب سے بڑے صوبے کا گورنر بنا"۔ (۳۲)

ناول نگار اشرف شاد صاحب نے پاکستانی معاشرے کی حقیقی تصویر کشی کی ہے کیونکہ یہاں پر جو وکیل فوجی ڈکٹیٹر کے حق میں بولتا ہے اسے اٹارنی جنرل یا جج بنا دیا جاتا ہے۔ مشہور زمانہ وکیل شریف الدین پیرزادہ اور جسٹس ملک قیوم کی مثال ہمارے سامنے ہے کہ کس طرح فوجی بھائیوں کا ساتھ دینے والوں کو نوازا جاتا ہے۔ ان کے لیے

کوئی قانون قاعدہ نہیں ہے بس ٹوٹل پورا کرنا ہوتا ہے۔یعنی کل کے جو شیطان تھے آج بھی قابل عزت ہیں۔ اس لیے ہمارا ملک عدل و انصاف کے معاملے میں دوسرے ممالک سے پیچھے ہے۔ کیوں کہ قانون کے رکھوالے ہی قانون کے قاتل بن جاتے ہیں۔ عدلیہ نے ہمیشہ ایوب خان کے دور سے لے کر آج تک صرف ڈکٹیٹروں کا ساتھ دیا ہے۔ نہ عوام کا ساتھ دیا اور نہ ہی قانون کی رکھوالی کی ہے۔ عدلیہ عدل کے لیے ہوتی ہے اگر عدل نہ ہو تو پھر معاشرے میں ہر جگہ بگاڑ نظر آئے گا۔ یہی حال ہمارے معاشرے کا ہے۔ اشرف شاد نے اپنے ناول ''جج صاحب'' میں اس کی ایک ہلکی سی جھلک دکھائی ہے کہ کس طرح آئین کو ناک کی موم بنایا جاتا ہے۔

ii۔ ایڈووکیٹ ظفر اللہ ہاشمی کا طوائفوں کے مقدمے لڑنا:

اشرف شاد نے ایک کردار ایڈووکیٹ ظفر اللہ ہاشمی کا شامل کیا ہے۔ یہ ایک ایسا وکیل ہے جسے ایک سال تک کوئی مقدمہ نہیں ملتا۔ بالآخر وہ ایک طوائف کا مقدمہ لینے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ مقدمے کے پہلے دن مجسٹریٹ بھی ہاشمی سے مکالمہ کرتا ہے کہ آج کل طوائفیں بھی وکیل رکھنے لگی ہیں۔ مجسٹریٹ کے لہجے میں تمسخر تھا۔ لیکن ایڈووکیٹ ہاشمی انتہائی سنجیدگی سے عرض کرتا ہے۔ یور آنر سر! میں ایک ملزمہ کا وکیل ضرور ہوں، لیکن بات یہ ہے کہ حکومت اگر اپنی دلالی کرنے والے وکلا رکھ سکتی ہے تو یہ غریب ملزمہ وکیل نہیں رکھ سکتی۔ جج ٹوک کر کہتا ہے کہ آپ یہ مکالمے ٹی وی ٹاک شوز میں جا کر کریں۔ یہ عدالت ہے لیکن وکیل ہاشمی صاحب عرض کرتے ہیں کہ سر میری موکلہ نور جہاں بنت محمد اقبال بے گناہ ہے۔ آپ اس کا مقدمہ سننے سے پہلے ہی طوائف قرار دے رہے ہیں۔ جج پوچھتا ہے یہ ہوٹل کے کمرے میں کیا کر رہی تھی اور یہ پہلے اپنا بیان دے چکی ہے کہ وہ وہاں بدکاری کر رہی تھی۔ لیکن ہاشمی ایڈووکیٹ نے کہا کہ ہوٹل کے ۲۵ ملازم اس چیز کے گواہ ہیں کہ اس کو دھوکے سے وہاں لایا گیا۔ گواہوں کی لسٹ حاضر ہے اور یہ مقدمہ بھی پینل کوڈ کی دفعہ A-37 کے تحت بالکل نہیں یہ تو مستقبل کے دلالوں اور اڈے والی عورتوں کے خلاف کاٹا جاتا ہے نہ کہ دھوکے سے لائی ہوئی عورت کے خلاف۔ ہوٹل کا مالک بھی اچھی شہرت کا مالک ہے کوئی لفنگا نہیں ہے۔ اتنے میں مجسٹریٹ لڑکی نور جہاں کو کٹہرے میں آنے کا کہتا ہے جو سر تا پا چادر میں لپٹی ہوئی ہے۔ صرف یس سر کہہ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ جج میز پر ہتھوڑا مار کر اس کا کیس داخل دفتر کر کے بَری کر دیتا ہے۔ پھر کیا ہاشمی صاحب جو طوائف کا مقدمہ لڑ رہے تھے اپنا مقدمہ جیت جاتے ہیں اور یہ صرف جھوٹ کی بنا پر جیتا گیا ہے جو کہ ایک جرم تھا۔ یہ ایک سیاسی مقدمہ تھا کیونکہ ریاست کی پولیس اس کی مدعی تھی۔ ناول میں اصل قتل انصاف کا ہوا۔

دوسرا مقدمہ وہ ایک ڈیرہ طوائف آنٹی شمیم کا لیتا ہے۔ جس میں ایک لاکھ روپیہ فیس پیشگی دی تھی اور ایک لاکھ بعد میں دینے کا وعدہ کیا۔ آپا شمیم جو کہ کلفٹن کے پاس گزری کے علاقے میں ایک بڑے سائز کے مکان میں اپنا کاروبار چلاتی تھی۔ گاہک صرف اعلیٰ طبقے کے لوگ تھے۔ مجلسی آداب سے واقف، شیمپو اور صابن کے اشتہاروں میں آنے والی ماڈلوں جیسی لڑکیاں اس کے پاس تھیں۔ رقص و سرور کی محفلیں سجتی تھیں اور شراب کا دور بھی چلتا۔ نئے نئے ماڈل کی گاڑیاں ہر وقت ہاشمی کی موکلہ کے دروازے پر کھڑی نظر آتی تھیں۔ آپا شمیم تھانیدار کو بھتہ دیتی تھی۔ جوں ہی تھانیدار بدلا تو اس نے بھتے کی جگہ لڑکی لینے پر بات کی جو آپا شمیم نے نامنظور کی۔ بس پھر کیا تھا کہ پورے گھر کی لڑکیاں تھانے دار نے آپا شمیم سمیت اُٹھا کر تھانے منتقل کر دیں۔ آپا نے ضمانت پر رہا ہوتے ہی ہاشمی ایڈووکیٹ کو وکیل کیا تھا جو طوائف پیشہ عورتوں کے مقدمے جیتنے میں مشہور ہو گیا تھا۔ ادھر پولیس کی صورت میں ریاست طوائف کے خلاف کھڑی تھی۔ ادھر ہاشمی ایڈووکیٹ یہ عدالت میں ثابت کر رہا تھا کہ یہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی چلاتی ہے اور اس کے پاس جو لڑکیاں ہیں وہ دور دراز علاقوں کی رہنے والی ہیں۔ جنہوں نے اوپر والا پورشن کرائے پر لے رکھا ہے اور یورپ میں وقت کا فرق ہونے کے سبب زیادہ گاہک رات کو اپنا کیس پیش کرتے ہیں۔ ساتھ یہ بھی کہتے ہیں کہ کیس تو ۳۷۱ A-بنتا ہے لیکن یہاں پولیس نے شراب نوشی اور فروخت کا کیس بھی بنا رکھا ہے۔ پولیس کے ساتھ مجسٹریٹ بھی اس میں شامل ہیں جنہوں نے غلط کیس بنایا۔ نوید بٹ ایڈووکیٹ ہر دفعہ ہاشمی کا مخالف ہوتا ہے۔ زور لگاتا کہ آپا شمیم ایک پیشہ ور عورت ہے اور علاقے کے لوگ بھی اس چیز سے واقف ہیں جبکہ مقابلے میں ہاشمی ایڈووکیٹ یہ کہتا ہے کہ جناب میری موکلہ شمیم بنت رحیم داد ایک باعزت خاتون ہے اور یہ اس کا ڈرائیونگ لائسنس ہے۔ ساتھ میں یہ سی ڈی ریکارڈ ہے جس کے مطابق انسپکٹر چانڈیو آپا کے گھر آجا رہا ہے اور یہ عمل اس نے نو دفعہ دہرایا ہے۔ اگر اس نے تفتیش کرنا ہوتی یا گرفتاری ڈالنا ہوتی تو ایک دو بار کافی تھی لیکن یہ نو بار وہاں کیا کرنے جاتے تھے۔ یہ بلیک میل کرنا چاہتا تھا۔ سی کی مدد سے چانڈیو سے عدالت سوال کرے تاکہ سچ اور جھوٹ نکھر کر سامنے آ جائے۔ جج نے سوچا کہ اگر پولیس کی اس ویڈیو کو عدالت چلاتی ہے تو اگر صحافی نے کیچ کر لیا تو پھر پولیس کی تو بے عزتی ہو گی۔ آج کل یہ زیادہ تر شہید بھی ہو رہے ہیں اور دہشت گردی کے خلاف جنگ بھی لڑ رہے ہیں۔ ہاشمی ایڈووکیٹ نے بار بار کھڑے ہو کر کہا کہ جناب چانڈیو نے بدنیتی پر مبنی مقدمہ بنایا تھا۔ میری ملزمہ کو رہا کیا جائے جو کہ ایک باعزت عورت ہے۔ جبکہ نوید بٹ ایڈووکیٹ بار بار یہ کہہ رہا تھا کہ آپا شمیم دھوکہ دے رہی ہے اور بہت بڑی بلیک میلر بھی ہے اگر میڈیا کو پتہ چلا تو یہ خالی ویڈیو میں پتہ نہیں کیا کیا بھر دیں۔ اس ویڈیو کو یہاں ہی تلف کر دیا جائے۔ اس انداز کو ناول نگار نے یوں پیش کیا ہے:

”نوید بٹ نے کھڑے ہو کر شکریہ ادا کیا اور ہاشمی کو فاتحانہ انداز میں دیکھا۔ ہاشمی نے اس وقت سی ڈی توڑ کر اس کے ٹکڑے میز پر پھینک دیے اور دل میں قومی مفاد زندہ باد کا نعرہ لگایا۔ آپا شمیم نے ٹوٹے ہوئے سی ڈی کے ٹکڑے دیکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ نوید بٹ کے برابر بیٹھے ہوئے انسپکٹر چانڈیو کے چہرے پر بھی کچھ رنگ واپس آگیا۔ اسے ڈر تھا کہ سی ڈی میں وہ فوٹیج نہ ہو جس میں اس نے اپنی وردی کی قمیض اور ٹوپی لڑکی کو پہنا کر اس کے ہاتھ میں سرکاری پستول تھما دی تھی“۔ (۳۳)

عدالت ملزمہ کو بری کر کے اس کا مکان اس کو واپس کرتی ہے۔ ساتھ تھانیدار چانڈیو نے مقدمہ واپس لینے میں اپنی عافیت جانی۔ آپا شمیم نے ہاشمی کو کہا کہ سی ڈی تو خالی تھی اگر چل جاتی تو میں پکی ملزمہ ثابت ہو جاتی کیونکہ میں جھوٹی تھی جبکہ ہاشمی صاحب کہتے ہیں کہ کبھی کبھی جھوٹ اور ڈرامہ بھی کرنا پڑتا ہے جو میں نے ایک مجرمہ کو چھڑانے کے لیے کیا۔ مجھے پتا تھا کہ میں اور میری موکلہ جھوٹے ہیں لیکن میری اداکاری نے یہ سارا کام آسان کر دیا۔ عدالت کے بیلف نے اسی شام ہاشمی ایڈووکیٹ کی موجودگی میں سیل توڑ کر مکان آپا شمیم کے حوالے کیا۔ آپا شمیم نے ہاشمی کو آفر کی کہ کچھ ٹھنڈا گرم ہو جائے لیکن اس نے اسے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ فیس میں نے لے لی ہے اور میں جا رہا ہوں۔

iii۔ بیرسٹر کرم دیوان کے سیاسی جرائم:

اشرف شاد نے اپنے ناول میں جو مرکزی کردار شامل کیا ہے وہ ایک جج صاحب ہیں جو کہ پہلے بیرسٹر تھے اور ان کے مقدمات بھی عجیب قسم کے تھے۔ مثلاً ان کے ایک مقدمے کو ناول میں زیر بحث لایا گیا ہے جس میں بیرسٹر کرم دیوان اپنے جھوٹ کے فریب سے حکومت کا کروڑوں روپیہ کا ناحق میں ضائع کرا دیتا ہے اور اس کا فائدہ اس کے کلائنٹ کو ہوتا ہے۔ یہ ایک سیاسی جرم ہے کہ حکومت کو نقصان پہنچاؤ اور حکومت کے ٹھیکیداروں کو فائدہ دو۔ ایک ٹھیکیدار جس نے بحری جہاز سے گندم اتارنے کا ٹھیکہ لے رکھا تھا۔ کراچی پورٹ ٹرسٹ پر مقدمہ کر رکھا ہے تاکہ وہ گندم جہاز سے اتارنے کے نرخ کو ڈبل کر سکے جس سے ٹھیکیدار کو کروڑوں کا فائدہ اور اور حکومت کو نقصان ہوتا تھا۔ بات یہ تھی کہ جہاز کو گوادر کی بندرگاہ پر لایا گیا تھا۔ مزدور کراچی سے اپنی مشینری کے ساتھ آئے تھے۔ ٹھیکیدار کو کرایہ اور گرمی کی وجہ سے مزدور بھی گھنٹہ دو گھنٹہ کام کر کے تھک جاتے تھے۔ کے پی ٹی نے کرایہ کی مد میں ایک ڈالر کا اضافہ کیا تھا جبکہ ٹھیکیدار ۵ ڈالر کے اضافے کا مطالبہ کر رہا تھا۔ ان کا یہ تنازعہ ہائی کورٹ جا پہنچتا ہے۔ ٹھیکیدار کی طرف سے بیرسٹر دیوان اور بیرسٹر اجمل خان کے پی ٹی کی

طرف سے وکالت کر رہے تھے۔ بیرسٹر دیوان نے آٹھ لاکھ روپے کلائنٹ سے فیس لی تھی۔ عدالت میں پیش ہو کر کہتا ہے کہ سر یور آنر گندم اتارنے والی مشین بے کار کھڑی ہے۔ میرے مؤکل کرایہ کی مد میں لاکھوں روپے ادا کر رہے ہیں جبکہ بیرسٹر اجمل خان کہتے ہیں کہ صرف کرایہ کا ریٹ بڑھانے کی خاطر بیرسٹر دیوان عدالت کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے۔ کام ٹھیکیدار اس لیے روک کر بیٹھا ہے کہ کرایہ بڑھایا جائے نہ کہ اس میں کے پی ٹی کا قصور ہے۔ جبکہ کے پی ٹی ٹھیکیدار کا لائسنس منسوخ کرنے کا اختیار رکھتی ہے۔ ادھر بیرسٹر دیوان یہ کہہ رہا ہے کہ جناب ملک میں گندم کا بحران سر اٹھا رہا ہے۔ صوبے گندم سمگلنگ کا الزام ایک دوسرے پر لگا رہے ہیں۔ آپ انسانی بنیادوں پر فیصلہ کریں۔ آخر میں جج دونوں وکلاء صاحبان کی رائے طلب کرتا ہے لیکن بیرسٹر دیوان کبھی کے پی ٹی کے سربراہ کو تو کبھی وزیر خوراک کو عدالت طلب کرنے کا کہتا ہے۔ عدالت دوسرے دن کے لیے برخاست ہوتی ہے تو کے پی ٹی والے رات کو ہی ٹھیکیدار سے صلح کر کے تین ڈالر پر دستخط کر لیتے ہیں۔ وہ بھی ٹھیکیدار کو کروڑوں کا فائدہ تھا جبکہ حکومت کو کروڑوں کا نقصان۔ جج صاحب نے بھی فیصلہ مفاد عامہ میں لکھ دیا لیکن نقصان حکومت کا ہوا۔ یہاں پر ناول میں مجرم وہ لوگ ہیں جنہوں نے سرکاری جیب کروڑوں روپے مفاد عامہ کے نام پر نکلوائے۔ بیرسٹر دیوان کا جج سے مکالمہ ملاحظہ ہو:

> ”می لارڈ! کام رکنے سے پوری سپلائی چین متاثر ہوئی ہے۔ آٹا ملوں تک گندم کا نیا ذخیرہ نہیں پہنچا، تو ملک میں آٹے کی قلت ہو سکتی ہے۔ آٹے کا بحران حکومتیں ہلا دیتا ہے۔ یہ چند تاجروں کے منافعے کا نہیں مفاد عامہ کا معاملہ ہے۔ مفاد عامہ در پیش ہو تو حکومت خاموش تماشائی نہیں رہ سکتی“۔ (۳۴)

ملک میں آئے روز کبھی چینی تو کبھی آٹے کا بحران ہو جاتا ہے۔ کبھی کھاد کا بحران تو کبھی گیس کا بحران سر اٹھانا شروع کر دیتا ہے۔ ۷۵ سال سے ملک میں اشرافیہ اور ذخیرہ اندوز قابض ہیں یا ان کے کارندے حکومت کر رہے ہیں۔ کوئی حکومت بھی انھیں روکنے میں کامیاب نہیں ہوئی۔ ماہرین خوراک کے مطابق ہر بندہ سالانہ اوسطاً ایک سو دس کلو گندم کھاتا ہے۔ باقی گوشت، سبزیاں، چاول، دودھ بھی اس میں شامل ہیں۔ گندم تو ہر بندہ کھاتا ہے۔ زیادہ تر بحران گندم کا ہی سر اٹھاتا ہے۔ زرعی ملک ہونے کے باوجود ہمیں گندم درآمد کرنا پڑتی ہے۔ یہ ہمارے لیے لمحۂ فکریہ ہے۔ اسی چیز کو اشرف شاد صاحب نے ناول میں ان جرائم پیشہ افراد کا ذکر بڑی خوبصورتی سے کیا ہے جو آٹے کے بحران کے ذمہ دار ہیں۔ حکومت بڑے ساہوکاروں سے بلیک میل ہوتی ہے جو کہ ایک

بڑا سیاسی جرم ہے کیوں کہ اس کا براہِ راست تعلق عوام سے ہے جو اس چکی میں پستی ہے۔ اسی چیز کو ناول میں ایک گھناونا جرم قرار دیا ہے۔

iv۔ دستگیر خان اسمگلر کی رہائی:

ناول میں ایک کردار دستگیر خان اسمگلر کا جو کراچی جیل میں قید ہے۔ اسمگلنگ ایک ایسی چیز ہے جس سے ملک میں اشیاء کا بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ اسمگلر چیزوں کی طلب کو دیکھ کر سستے داموں چیزیں لے کر دوسرے ملک میں بیچ دیتے ہیں جس سے چیزوں کا مصنوعی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔ زیادہ تر اشیاء خورد و نوش جیسا کہ ہمارے سرحدی اسمگلر افغانستان میں آٹے کو اسمگل کر دیتے ہیں جس سے بلوچستان اور خیبر پختونخواہ صوبے میں آٹے کا بحران پیدا ہو جاتا ہے جو کہ عوام اور حکومت کے لیے نقصان کا باعث ہے۔ ملک کو زر مبادلہ کا نقصان اٹھانا پڑتا ہے کیونکہ پھر وہی سمگل شدہ چیز مہنگے داموں باہر ملک سے منگوانا پڑتی ہے۔ نوید بٹ، ایڈووکیٹ کا بھائی کراچی جیل سے دستگیر خان کو مل کر آتا ہے۔ ساتھ اس کے نوید بٹ بھی شامل تھا۔ آدھی رقم فیس کی پیشگی وصول کر لی گئی اور آدھی رقم بعد وصول کرنے کا وعدہ ہوا۔ نوید بٹ نے وکیلوں والا ڈائیلاگ بولا کہ رہائی کا کام تو مشکل ہے لیکن ناممکن نہیں۔ پہلے سزا کے خلاف اسے لینا ہے پھر اس کو خارج کرا دینا ہے۔ نوید بٹ قہقہہ لگاتا ہے شاید وہ یہ ڈائیلاگ گاڈ فادر ناول میں جو جرائم پیشہ افراد لگاتے تھے ویسا ہی تھا۔ پہلے دستگیر خان کو دل اور بلڈ پریشر کا مریض ڈکلئیر کرا کے سیدھا جیل سے ہسپتال منتقل کیا۔ پھر وہاں سے رہائی اس کی اگلی منزل تھی۔ اگلی پیشی پر وکیل نے جج صاحب سے کہا کہ دستگیر خان کسٹمز اور انٹی نار کو ٹیکس فورس کے درمیان جھگڑے میں رگڑا کھا رہا ہے۔ دونوں ایجنسیوں کے اپنے اپنے اسمگلر ہیں جن کی یہ حمایت کرتے ہیں۔ آخر میں کسی غریب کو پکڑ کر سزا دلوا دیتے ہیں جبکہ اسمگلر سے مال وصول کر لیتے ہیں۔ یہ وہ سیاسی جرائم ہیں جن سے حکومت کو نقصان ہوتا ہے اسمگلر اور وکلا حضرات اپنے اپنے پیسے کھرے کر کے نظام انصاف کو بھی دھوکہ دے جاتے ہیں حالانکہ دستگیر خان اسمگلنگ کے ٹرک افغانستان سے باونڈڈ ویئر (Bounded Ware) کراچی کی بندرگاہ لاتے ہیں۔ اے این ایف نے اس کا ایک ٹرک پکڑ کر اس سے منشیات برآمد کر لی تھی۔ ڈرائیور کے بیان کے مطابق یہ منشیات دستگیر خان سمگلر کی ملکیت ہیں۔ بعد میں ڈرائیور افغانستان فرار ہو گیا۔ دستگیر خان کے بندوں نے اسے افغانستان سے پکڑ کر پشاور میں مجسٹریٹ کے سامنے پہلے بیان دلوایا پھر کراچی میں عدالت میں آکر اس نے کہا کہ یہ مال دستگیر کا نہیں ہے۔ کسٹمز والے بھی دستگیر کے حامی تھے پھر کیا تھا اسمگلر رہا ہو گیا لیکن ملک کو اربوں کا نقصان ہو گیا۔ دراصل سیاسی جرائم جو کہ حکومت کی طرف سے ہوتے ہیں لیکن دیکھنے میں آیا کہ آج تک ان مجرمین کو پاکستان میں سزا کم ہی ہوئی ہے۔ اس کی رہائی کی تصویر ناول نگار نے اس طرح پیش کی ہے:

> ”عدالت نے اپیل کے فیصلے تک دستگیر خان کو ضمانت پر رہا کرنے کا حکم دیا تھا لیکن شرط یہ رکھی تھی کہ وہ ہر ہفتے تھانے میں حاضری دے گا۔ شاہ صاحب نے نوید بٹ ایڈووکیٹ کو مبارکباد دی جس نے کیس تیار کیا تھا اور نوید بٹ نے ہاشمی کو جس نے عدالت میں کیس لڑا تھا۔ علیم کا خیال غلط نہیں تھا کہ دستگیر دولہا بن کر عدالت سے نکلے۔ اس کے دوست اور رشتے دار ٹرکوں میں سوار ہو کر آئے تھے اور دستگیر خان پھولوں سے لاد دیا تھا“۔ (۳۵)

ہمارے ملک میں جتنا بڑا مجرم ہو اتنے ہی دھوم دھام سے اس کی رہائی پر پھول نچھاور کیے جاتے ہیں۔ میلوں گاڑیوں کی قطاریں اس کے استقبالی قافلے میں ہوتی ہیں۔ پھر وہ مجرم پریس کانفرنس کر کے قانون کا مذاق اڑا رہا ہوتا ہے اور اپنی بے گناہی پیش کر رہا ہوتا ہے۔ جس سے ملکی قرضہ تو دن بدن بڑھ رہا ہے جبکہ جرائم پیشہ لوگ مالدار ہو رہے ہیں۔ ان کی اندرون اور بیرون ملک جائیدادوں کا کوئی شمار نہیں۔ عوام مہنگائی، علاج معالجہ اور روپے کی گرتی ہوئی قدر کی وجہ سے غریب سے غریب تر ہو رہی ہے اور جرائم پیشہ لوگ امیر سے امیر تر ہو رہے ہیں۔

v۔ بدعنوان افسروں کے وائٹ کالر کرائم:

ناول میں ایک کردار ۱۹ گریڈ کا ایک سینیئر بیوروکریٹ جمیل احمد گھانگریو ہے جس نے قومی خزانے سے بدعنوانی کر کے پانچ ارب روپے ہڑپ کیے ہیں۔ فیڈرل کرپشن کورٹ میں اس کے خلاف مقدمہ لگا ہے۔ مقدمے میں بدعنوان افسر کی طرف سے ہاشمی اینڈ صمدانی ایڈووکیٹس کی پوری ٹیم عدالت میں پیش ہے۔ جبکہ انہی وکلاء کا پارٹنر نوید بٹ ایڈووکیٹ حکومت کی طرف سے پیش ہو رہے ہیں۔ ہاشمی ایڈووکیٹ سے جج صاحب نے کہا کہ آپ تو پورا کنبہ لے آئے ہیں جبکہ بٹ صاحب نے تو فلور کراسنگ کر لی ہے۔ نوید بٹ ایڈووکیٹ نے جج صاحب کا شکریہ ادا کیا اور اپنے روسٹرم پر آ کر کہنے لگا کہ سر ملزم جمیل احمد گھانگریو نے پانچ ارب کے سرکاری فنڈز خورد برد کیا ہے۔ ایف آئی اے چھان بین کر رہا ہے لیکن ملزم محکمے اور ایف آئی اے کے ساتھ بالکل تعاون نہیں کر رہا۔ عدالت سے درخواست ہے کہ عدالت ملزم کا چودہ دن کے ریمانڈ پر ایف آئی اے کے حوالے کیا جائے۔ جبکہ ہاشمی صاحب کی طرف سے دلائل دیے جا رہے ہیں کہ میرے مؤکل پر غبن کا الزام ثابت نہیں ہوا جبکہ پراسیکیوشن کو ہدایت کی جائے کہ وہ میرے مؤکل کا احترام ملحوظ رکھیں۔ میرا مؤکل بیمار ہے اور ضمانت کی درخواست کنفرم ہونے کے لیے پیش ہے۔ میرے مؤکل کو شوگر کا مرض لاحق ہے۔ آغا خان ہسپتال کی رپورٹیں درخواست ضمانت کے ساتھ منسلک ہیں۔ استغاثہ اگر چاہے تو عدالت ان کی مرضی سے کے میڈیکل

بورڈ سے جانچ کروا سکتی ہے۔ ایڈووکیٹ راجہ صاحب جو نوید بٹ کی طرف سے تھے، نے کہا کہ ہم ریمانڈ کے دوران ملزم کو ہسپتال میں رکھیں گے جبکہ ہاشمی صاحب کی استعداد ہے کہ میرا موئکل ایک سینئر افسر ہے اور اس کو ہتھکڑی لگا کر ہسپتال میں رکھا تو افسران میں عوام کی عزت کوڑی کی رہ جائے گی۔ یور آنر آپ کو تو پتہ ہے کہ ٹینشن اور اینگزائٹی شوگر کے مریض کے لیے ہتھکڑی کتنی خطرناک ہے۔ جبکہ میں عدالت کو یقین دلاتا ہوں کہ میرا موئکل ایف آئی اے کے ساتھ مکمل تعاون کرے گا۔ جج صاحب نے راجہ ایڈووکیٹ سے پوچھا کہ ملزم کا نام آپ نے ای سی ایل میں ڈلوایا ہے کہ نہیں تاکہ ملزم ضمانت کے دوران بیرون ملک نہ جا سکے۔ راجہ صاحب نے ہاں میں جواب دیا جبکہ ہاشمی صاحب نے کہا کہ ابھی محکمہ جاتی تحقیق ہونا باقی ہے۔ جج صاحب نے افسر کی تین ماہ کی ضمانت کنفرم کر دی اور کیس کو تین ماہ کے لیے ملتوی کر دیا۔ اس کا حال اشرف شاد نے یوں بیان کیا ہے:

> ”عدالت استغاثہ کو ہدایت کرتی ہے کہ وہ تفتیش اور تحقیقاتی رپورٹ مکمل ہوتے ہیں ان کی نقل وکلائے صفائی کو فراہم کرے۔ اگلی پیشی کے لیے تین ماہ بعد کی کوئی تاریخ مقرر کی جائے۔ “Adjourned case” جج نے میز پر تھوڑا مارا“۔(۳۶)

اشرف شاد نے ملک میں عدالتی نظام کے بارے میں کہا ہے کہ ملک میں کروڑوں روپے کی کرپشن کرنے والے حضرات کی ضمانتیں آسانی سے ہو جاتی ہیں۔ جبکہ چند روپے کی کرپشن کرنے والے کی ضمانت سالہا سال نہیں ہوتی۔ یہاں ناول میں ایک اعلیٰ افسر جس نے پانچ ارب روپے کی کرپشن کی ہے ضمانت فوری ہو گئی۔ ملک میں اگر کوئی سرکاری افسر یا سیاستدان کرپشن میں پکڑا جاتا ہے تو جیل کی بجائے سیدھا ہسپتال چلا جاتا ہے۔ وہاں اس کو ڈاکٹر دنیا جہان کی بیماریاں بتا دیتے ہیں۔ یہی لوگ جب باہر آتے ہیں تو ایک دن کے لیے بھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتے۔ جرائم یہ لوگ کرتے ہیں نقصان قوم کو ہوتا ہے جو روز بروز قرضے کی دلدل میں پھنسی جا رہی ہے۔ جس کی قیمت مہنگائی کی صورت میں ادا کرنا پڑتی ہے جو کہ ایک قومی جرم ہے۔ کرپٹ لوگ مہنگے وکیل کرتے ہیں جبکہ حکومتی وکلاء کے دلائل سچے ہونے پر بھی اتنے جاندار نہیں ہوتے کہ وہ حکومتی خزانے کا دفاع کر سکیں جبکہ کرپٹ لوگوں کے وکیل دلائل کے انبار لگا دیتے ہیں اور ضمانت آسانی سے ہو جاتی ہے جیسا کہ میگا کرپشن کیس میں ہوئی ہے۔ پاکستان میں نیب کے اکثر ملزم جیل میں جاتے ہی ہسپتال چلے جاتے ہیں پھر ان کی جیل اسپتال ہی ہوتی ہے۔ اصل جیل نہیں جو ایک جرم ہے۔ قانون نافذ کرنے والے اداروں کو چاہیے کہ وہ اپنی خامیاں درست کریں اور قانون کو ناک کی موم نہ بننے دیں۔ یہاں ناول میں کمزور عدالتی نظام کو مجرم ٹھہرایا گیا ہے۔

vi۔ آئین کی موت:

پارلیمنٹ، عدلیہ اورانتظامیہ کی حدود کو متعین کرنے کا نام آئین ہے ۵۶ کے آئین کی ۲۵۰ شقیں تھیں۔ ۶۲ کے آئین کی ۲۷۵ شقیں اور ۷۳ کے آئین کی ۲۹۷ آرٹیکل یعنی شقیں اور چوبیس ترامیم ہیں۔ ناول کے اس باب کا نام بھی آئین کی موت ہی ہے۔ پاکستان میں آئین کی موت اس دن ہوئی تھی جس دن ملک میں پہلا مارشل لاء لگا تھا اورآئین کو منسوخ کر دیا گیا تھا۔ لیکن یہاں ناول میں مارشل لاء تازہ لگا ہے اور چیف آف آرمی سٹاف نے منتخب حکومت کا تختہ الٹ کرمارشل لانافذ کر دیاہے۔ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کوبرخاست کر دیا ہے۔ اب مقدمہ سپریم کورٹ میں ہے جہاں عام شہریوں اور دوسرے لوگوں نے جن کی سیاسی پارٹیاں ہیں، نے درخواستیں دی ہیں۔ حکومت یعنی فوجی حکومت کی طرف سے بیرسٹر دیوان مارشل لا کے حق میں دلائل دے رہے ہیں جبکہ دوسری طرف سپریم کورٹ میں مخالف وکلا دلائل دے رہے ہیں۔ قوم کی نظریں روزانہ ٹاک شوز اور سپریم کورٹ کی طرف ہیں تاکہ اس عمل کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔ عوام میں سکیورٹی اداروں بالخصوص فوجی ایکشن کے خلاف غم وغصہ پایاجاتاہے کہ حکومت کرناسیاستدانوں کا کام ہے، فوج کا کام صرف ملکی سرحدوں کی حفاظت کرنا ہے۔ حکومت کرنا نہیں ہے۔ عدالت میں بیرسٹر دیوان یہ کہہ رہے ہیں کہ دیکھیں جی ملکی خزانہ خالی ہو گیا تھا جس سے ملک دیوالیہ ہو سکتا تھا۔ سابق حکومت اور وزیراعظم پر کرپشن کے الزامات ہیں۔ جن کی نوعیت بڑی سنگین ہے جبکہ دوسرے مخالف وکلا یہ کہہ رہے ہیں کہ مانتے ہیں کہ حکومت کے خلاف بڑے بڑے مالیاتی اسکینڈل ہیں لیکن آئین کے ساتھ کھلواڑ برداشت نہیں۔اس کو کیوں غیر فعال کیا گیاہے جبکہ بیرسٹر دیوان یہ کہتاہے کہ آئین کے چند حصّے معطل کیے گئے ہیں۔ آئین کو منسوخ ہرگز نہیں کیا گیا۔ مخالف وکلا کا اصرار ہے کہ وزیراعظم وفاقی وزراء اور کابینہ ارکان کو تھوک کے حساب سے گھروں سے اٹھالیا گیاہے۔ نام نہاد فوجی ٹربیونل بنائے گئے ہیں جو ان کی کرپشن کے الزامات کی تحقیق کریں گے۔ یہ سب غیر آئینی اور غیر قانونی ہے۔ فوجی آمر پر آرٹیکل چھ لگتاہے جس کی سزاموت ہے۔ سب سے زیادہ درخواستیں آرٹیکل سکس کے تحت دائر کی گئی تھیں۔ چیف جسٹس نے فل بنچ تشکیل دے دیا تھا تاکہ اس اہم مقدمے کی سماعت کریں۔ ایک جج نے بیرسٹر دیوان کو پوچھا کہ دیوان صاحب آپ آئین کو موت کی سزا کیسے دیں گے؟ پھانسی دے کر یا زہریلا انجیکشن لگا کر۔ بیرسٹر صاحب جواب دیتے ہیں جی جیسا آپ مناسب سمجھیں۔ کاغذ کاٹنے والی مشین سے بھی اور سمندر میں غرق کر کے بھی دے سکتے ہیں۔ چیف جسٹس نے کہا آپ کا موکل آمر تو آئین کو سزائے موت دے چکاہے۔ جس کی سزاصرف موت ہے، موت۔ آپ آرٹیکل چھے کو غور سے پڑھیں۔ جناب آپ مجھے بھی پھانسی لگا سکتے ہیں۔ بیرسٹر دیوان نے کہا۔ ان کی تو ایک طویل فہرست ہے۔ آئین کا خون کرنے

والوں کے مزاروں پر پھولوں کی چادریں چڑھائی جاتی ہیں۔ ایک جج نے بیرسٹر دیوان سے کہا کے آپ کے مطابق قاتل کا سزا سے بچنا دوسرے قاتل کو بے گناہ ثابت نہیں کرتا۔ عاصمہ جیلانی کیس کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ بیرسٹر دیوان نے کہا کہ جناب میں ایسے ججوں کو سلام پیش کرتا ہوں جنہوں نے فوجی حکومت کا حلف نہیں اٹھایا تھا اور استعفیٰ دے دیا تھا۔ جن میں جسٹس سردار اقبال موکل بھی شامل تھے۔ ایسے ججوں نے عدلیہ کا احترام بڑھایا، مراعات اور عہدوں کو ٹھکرادیا۔ لیکن حلف لینے والوں کی وجہ سے عدالتوں کا وجود قائم رہا ورنہ بریگیڈیئر سطح کے آفیسر ہائی کورٹ اور میجر جنرل اور لیفٹیننٹ عہدے کے جرنیل سپریم کورٹ میں جج بن کر بیٹھ جاتے ہیں جس سے عدلیہ کی رہی سہی کسر بھی ختم ہو جاتی۔ ان لوگوں نے اعلیٰ عدالتوں کے نظام انصاف کو ساقط ہونے سے بچالیا ہے۔ بیرسٹر دیوان کے مخالف وکیل فاضل چوہدری جو کہ بر طرف حکومت میں اٹارنی جنرل تھے روسٹرم پر آکر بیرسٹر دیوان کو ٹوکا اور کہا کہ اب کی بات کی جائے گھڑے مردے نہ اکھاڑے جائیں۔ ماضی کے ججوں نے جو کیا وہ تاریخ کا حصّہ ہے۔ آپ اپنی بات کریں کہ ایک ڈکٹیٹر نے کس طرح مختلف حیلوں بہانوں سے ایک منتخب حکومت کو بندوق کے زور سے چلتا کیا جو کہ ایک قابل سزا جرم ہے۔ آپ مجرموں کی وکالت کب تک کرتے رہیں گے۔ دیوان صاحب کہنے لگے می لارڈ میں ایک ہفتے سے مخالف وکلا کے دلائل سن رہا ہوں۔ میں نے ایک بار بھی روسٹرم پر کسی شخص کی توہین نہیں کی۔ میری عدالت سے درخواست ہے کہ مجھے بھی ٹوکے بغیر سنا جائے۔ میرے دلائل ایک ہفتے میں نہیں ایک مہینے میں ختم ہوں گے۔ دوسرے وکلا کو چیف جسٹس نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ مخالف وکیل اپنی کرسی پر بیٹھ گیا۔ چیف جسٹس نے بیرسٹر دیوان کو کہا کہ آپ کہہ رہے تھے فوجی حکومتوں کے حق میں فیصلے دینے والوں کی بدولت ہی آج عدالت عظمیٰ کا وقار برقرار ہے۔ چیف جسٹس کے لہجے میں عجیب قسم کا طنز تھا۔ بیرسٹر دیوان نے کہا کہ فوجی حکومتیں بندوق کے زور پر برسرِ اقتدار آتی ہیں انہیں کوئی بھی قانون بیرکوں میں واپس نہیں بھیج سکتا۔ ان اعلیٰ عدلیہ کے ججوں نے عدالت کے پورے نظام کو منہدم ہونے سے بچایا ورنہ جو طاقت کے زور پر آتا ہے اسے کوئی نہیں روک سکتا۔ سابق ججوں کے مصلحت آمیز رویے نے ادارے کی عظمت کو بچایا ہے وہ بھی کسی تصادم کے بغیر۔ چیف جسٹس نے کہا کہ بیرسٹر دیوان ہمیں دبے الفاظ میں دھمکی دے رہے ہیں۔ بیرسٹر دیوان کہتے ہیں می لارڈ ایسا ہرگز نہیں ہے کوئی جج بتائے کہ کسی کو کسی جرنیل نے فون پر دھمکی لگائی ہو۔ ایسا ہرگز بھی نہیں ہے۔ جرنیل عدالت کا مکمل احترام کرتے ہیں۔ چیف جسٹس نے کہا کہ آپ کا موکل جو کہ آج کل چیف ایگزیکٹو بھی ہے کیا عدالت کے فیصلے کا احترام کرے گا جس نے آئین کا احترام بھی نہیں کیا۔ چیف جسٹس کے ریمارکس سے لگ رہا تھا کہ عدالت عظمیٰ کیسے ایک ایسے شخص کو قانونی پوشاک پہنائے جس نے آئین کو ہی توڑ دیا تھا۔ عدلیہ کیسے اپنے وقار کو مجروح

کر سکتی تھی۔ اب عدالت اس فیصلے پر غور کرتی ہے کہ فوجی حکومت بھی چلتی رہے اور سپریم کورٹ کی عزت پر بھی حرف نہ آئے۔ بیرسٹر دیوان کا یہ کہنا کہ می لارڈ ۱۹۷۳ء کے آئین کے جس حصّے میں آرٹیکل ٦ ہے اس کو معطل کیا جا چکا ہے۔ لہٰذا آرٹیکل ٦ والی درخواستوں کو منسوخ کیا جائے۔ باقی معاملات چلتے رہیں گے جبکہ مخالف وکلا کا یہ کہنا کہ عدالت عظمیٰ اپنے صرف ایک آرڈر سے فوجی حکومت کا خاتمہ کر سکتی ہے اور اسے کرنا چاہیے جسٹس منیر کے نظریہ ضرورت کو اب اکھاڑ پھینکنے کا وقت آ گیا ہے۔ اب عدالت عظمیٰ ایسا گول مول فیصلہ سناتی ہے کہ دونوں طرف کے وکیل اپنی اپنی کامیابی کے نعرے لگا رہے تھے۔ اشرف شاد صاحب نے اس کو ناول میں اس طرح پیش کیا ہے:

> ”چیف جسٹس نے جب سماعت شروع ہوتے ہی اعلان کیا کہ جمہوریت کی بحالی کا معاہدہ طے پا گیا ہے جس کے بعد آئین، پارلیمنٹ اور حکومت کی بحالی کے لیے دائر کردہ درخواستیں واپس لے لی گئی ہیں تو عدالت میں شور مچ گیا تھا۔ آدھے رپورٹرز بیان کا پہلا حصّہ سنتے ہی بریکنگ نیوز دینے عدالت کے کمرے سے دوڑتے ہوئے باہر نکلے تھے۔ چیف جسٹس نے اپنے تفصیلی بیان میں مفاہمت کے عمل کو سراہا“۔(۳۷)

فیصلہ کیا تھا کہ سپریم کورٹ چھے ماہ کے لیے آئین مدون کرنے کے لیے ایک کمیٹی تشکیل دے گئی جو عام انتخابات کرائے گی۔ فوجی حکمران ریفرنڈم کے ذریعے عوامی تائید حاصل کرے گا۔ اس کے لیے حکومت وقت کو تین سال حکمرانی کا وقت دیا گیا ہے۔

ناول میں اسی فیصلے کو افسانوی رنگ دیا گیا ہے جس کو چیف جسٹس ارشاد حسن خان نے سنایا تھا۔ ارشاد حسن خان کے مطابق ہم نے آمر کے پر کاٹ دیے تھے غلط تھا کیوں کہ اس فیصلے میں یہ بھی تھا کہ آمر آئین میں ترمیم بھی کر سکتا ہے تو اس نے اس میں ۳۷ ترامیم کر ڈالیں۔ یہ تھا ایک بہت بڑا سیاسی جرم جس کو ناول کی شکل میں اشرف شاد نے ڈھالا ہے۔ حالانکہ اس وقت کے چیف جسٹس سعید الزماں صدیقی کو حلف کے لیے سپریم کورٹ بلایا ہی نہیں گیا تھا۔ انہوں نے استعفیٰ دے دیا۔ ارشاد حسن خان صاحب نے فوجی حکومت کو قانونی قبا پہنائی اور اپنی اپنی آپ بیتی ”ارشاد نامہ“ میں اس کو ٹھیک کہا۔ لیکن ایسا ہرگز نہیں تھا وہ اقدام غلط تھا، غیر قانونی تھا، تھوڑے عرصے یعنی پانچ سال بعد ملک کے فوجی حکمران نے بیرسٹر دیوان کو سپریم کورٹ کا جج بنا دیا۔ بیرسٹر دیوان اس کمیٹی کا رکن تھا جس نے تین سال میں آئین تیار کرنا تھا۔ اس میں ابھی ایک سال باقی تھا لوگ کہہ رہے تھے کہ ایک سال کی مدت شاہد جسٹس دیوان دس سال میں بدل دے۔ جسٹس دیوان نے چیف

جسٹس بنتے ہی سوموٹو(Suo Moto)ایکشن لے کر حکومت کو نوٹس جاری کیا کہ اگر اس نے آئین تیار نہیں کیا تو عدالت عظمیٰ مزید وقت نہیں دے گی۔ عدالت نے اس معاہدہ کو غیر قانونی قرار دے دیا جو عدلیہ اور حکومت کے درمیان طے پایا تھا۔ پھر کیا تھا صدر پاکستان جو کہ فوجی ڈکٹیٹر تھا نے ملک میں ایمر جنسی نافذ کر کے عدلیہ کے چار ججوں کے علاوہ سب کو برطرف کر دیا۔ اس کا حال اشرف شاد نے یوں لکھا ہے:

"فوجی ایکشن دو دن بعد شروع ہوا تھا۔ رات ۱۲ بجے ایک فوجی دستے نے سپریم کورٹ کو اپنے قبضے میں لے کر اس کے پھاٹک پر تالا لگا دیا۔ عدالت کے چاروں طرف پہرہ لگا دیا گیا تھا۔ چیف جسٹس دیوان کے گھر پر بھی پہرہ تھا کوئی اندر جا سکتا تھا نہ دیوان یا اس کے کسی ملازم کو باہر آنے کی اجازت تھی۔ گھر کے پاس سگنل جام کر دیے گئے تھے۔ دیوان کا رابطہ باہر کی دنیا سے بالکل منقطع تھا۔ صدر کے دستخطوں سے ایک حکم نامہ جاری ہوا تھا"۔ (۳۸)

نئی سپریم کورٹ آگئی اور پرانی کو گھروں کے اندر ہی نظر بند کر دیا گیا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کو اشرف شاد نے بیان کیا ہے کہ کس طرح ۳نومبر ۲۰۰۷ء کو آئین کے ساتھ کھلواڑ کیا گیا ہے۔ پوری دنیا میں پاکستان کی جگ ہنسائی ہوئی۔ عدلیہ زمین بوس ہو گئی۔ ناول میں جسٹس دیوان جو کبھی فوجی حکومت کا حامی تھا اب اس کے آگے روڑے اٹکا رہا تھا۔ اس نے صدر کے اقدامات کے بعد استعفیٰ دے دیا اور دو دن بعد اپنے دوست کے پاس کیوبا چلا جاتا ہے۔ صدر صاحب نے انہیں واپسی اپنا مشیر بنانا چاہا لیکن اس نے معذرت کر لی۔ دیوان صاحب قوم کے ہیرو بن گئے اور اللہ اللہ کرنا شروع کر دیا۔ قوم کو تبلیغ کرنا شروع کر دی۔ ناول کی صورت میں اشرف شاد نے پاکستان میں آئین شکنی کی تاریخ کا ایک واقعہ بیان کیا جو کہ بہت بڑا سیاسی جرم ہے۔ لیکن پاکستان میں آج تک کسی ڈکٹیٹر کو سزا نہیں ہوئی۔ انگلینڈ نے اپنے ڈکٹیٹر کو سزائے موت دی تھی۔ مسولینی اٹالین ڈکٹیٹر کو سزائے موت ہوئی تھی۔ صدام حسین کو سزائے موت ہوئی تھی۔ اگر پاکستان میں ایک کے ساتھ بھی ایسا ہوتا تو کبھی کسی ڈکٹیٹر کو جرات نہ ہوتی کہ وہ آئین شکنی جیسے جرائم کر کے ٹی وی پر آکر میرے عزیز ہم وطنو کہے۔ ناول میں جج صاحب ہیرو ہے اور ڈکٹیٹر مجرم ہے۔ جرم کا سبب ملک میں گرتی ہوئی معیشت اور سیاست دانوں کی کرپشن ہے۔ جبکہ محرک اس کا ڈکٹیٹر ہے۔ مقالے کے آخر میں پیر وارث شاہ جو کہ پنجابی زبان کے عظیم شاعر ہیں اس کے کچھ اشعار کی روشنی میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ انسان دنیا میں جرائم کے اسباب کا محرک بنتا ہے لیکن وہ خود تقدیر کے ہاتھوں میں کھیل رہا ہوتا ہے۔

باغ چھڈ گئے گوپی چند جیے شداد فرعون کہا گیا

نوشیر واں چھڈ بغداد ٹریا اوہ اپنی وار لنگھا گیا

آدم چھڈ بہشت دے باغ نٹھا بُھلے وسرے کنک نوں کھا گیا
فرعون خدا کہائی کے تے موسیٰ نال اشٹنڈ اٹھا گیا
نمرود شداد جہان اتے دوزخ اتے بہشت بنا گیا
قاروں زراں اکٹھیاں میل کے تے بنھ سرے تے پنڈ اٹھا گیا
مال دولتاں حکم تے شان شوکت مکّھا سروں اند لٹا گیا
سلیمان سکندروں لاء سبھے تہاں پواں تے حکم چلا گیا
اوہ وی ایس جہان تے رئیو نہیں جیہڑا آپ خدا کہا گیا
مویا بُختِ نصر جیہڑا چاڑھ ڈولا سچے رب نوں تیر چلا گیا
تیرے جیہاں کیتیاں ہویاں نے تینوں چاء کی باغ دا آ گیا
وارث شاہ اوہ آپ ہے کرن کارن سر بندیاں دے گلہ آ گیا(۳۹)

حوالہ جات

۱۔ Michael Gryant, A Word History of War Crimes, Blooms Bury, London, 2015 P- 139.

۲۔ ایضاً،۱۴۰

۳۔ مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۲ء، ص ۱۳

۴۔ ایضاً، ص ۲۳

۵۔ ایضاً، ص ۵۸

۶۔ ایضاً، ص ۵۲

۷۔ روزنامہ ایکسپریس، سنڈے میگزین، ۲۰ جون ۲۰۲۱ء

۸۔ امیر علی سید ، روح اسلام،(ترجمہ) محمد ہادی حسین، ادارہ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور، ۱۹۸۷ء، ص ۱۸۲تا۱۸۳

۹۔ ایضاً، ص ۱۸۱

۱۰۔ ایضاً، ص ۱۸۲

۱۱۔ کتاب مقدس ا۔ اسموئیل، باب ۱۵، آیت ۲ تا ۳

۱۲۔ کتاب مقدس ۔حزقی ایل۔ باب ۹، آیت۔ ۶

۱۳۔ تارڑ، مستنصر حسین، ”قلعہ جنگی“، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۲ء، ص ۱۸۸

۱۴۔ سید کاشف رضا، چار درویش اور ایک کچھوا، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء، ص ۱۴ تا ۱۵

۱۵۔ ایضاً، ص ۴۰

۱۶۔ ایضاً، ص ۱۱۴ تا ۱۱۵

۱۷۔ ایضاً، ص ۱۷۴ تا ۱۷۵

۱۸۔ ایضاً، ص ۱۷۷ تا ۱۷۸

۱۹۔ محمد الیاس، برف، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور، ۲۰۱۰ء، ص ۱۰۹

۲۰۔ ایضاً، ص ۱۱۰

۲۱۔ ایضاً، ص ۸۰

۲۲۔ ایضاً، ص۸۹

۲۳۔ ایضاً، ص۱۴۶

۲۴۔ ایضاً، ص۲۶۹

۲۵۔ ایضاً، ص۲۷۲

۲۶۔ اشرف کمال، ڈاکٹر، اردو ناول پر نائن الیون کے اثرات، سہ ماہی ادبیات، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، شمارہ جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء، ص۱۰۳

۲۷۔ محمد الیاس، برف، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء، ص۴۵۰

۲۸۔ ایضاً، ص۴۵۱

۲۹۔ ایضاً، ص۴۳۴

۳۰۔ ایضاً، ص۴۹۸

۳۱۔ محمد اقبال، علامہ، کلیات اقبال، شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، ۲۰۰۹ء، ص۸۹

۳۲۔ اشرف شاد، جج صاحب، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء، ص۳۲

۳۳۔ ایضاً، ص۵۲

۳۴۔ ایضاً، ص۶۰

۳۵۔ ایضاً، ص۳۹۷تا۳۹۸

۳۶۔ ایضاً، ص۱۶۰

۳۷۔ ایضاً، ص۵۱۷

۳۸۔ ایضاً، ص۵۴۷

۳۹۔ سید وارث شاہ، ہیر، مولف: عبدالعزیز بیرسٹر ایٹ لاء، الفیصل ناشران کتب، اردو بازار، لاہور، ۲۰۰۱ء، ص۳۹۰

ماحصل

الف۔ مجموعی جائزہ:

ادب میں ناول ہی ایک ایسی صنف ہے جو انسانی ذہن کو بدلتا ہے۔ دنیا میں شاید ہی کسی شخص کو اس بات پر اختلاف ہو کہ دنیا میں مشکل ترین کاموں میں ایک کام کسی کا ذہن بدلنا ہے۔ اس میں دلائل کا انبار ہوتا ہے۔ انسان کسی نہ کسی سماج کا فرد ضرور ہوتا ہے۔ معاشرے میں سیاست، مذہب، معیشت، تعلیم و تربیت کے ادارے موجود ہوتے ہیں جو اس پر گہرا اثر ڈالتے ہیں۔ ناول نے قوموں کی زندگی پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ ناول نگار جب بھی ناول کی اُٹھان کو لے کر چلتا ہے تو وہ ساتھ ساتھ گلی، محلے، گھریلو زندگی میں چلتے پھرتے لوگ، کھیتی باڑی کرتے کسان، گھر کے کام کاج میں مصروف عورتیں، کارخانوں میں کام کرتے مزدور، جرائم پیشہ عناصر، بے رحم سیاست دان، دفاتر میں کام کرتے بابو حتیٰ کہ غلاموں کی طرح معاشرے کے پسے ہوئے طبقات بھی ادب کے موضوعات میں شامل ہوتے ہیں۔ ناول نگار معاشرے کی تصویر کشی کرتا ہے اور اچھے کام کی ترغیب دیتا ہے جبکہ جرائم پیشہ عناصر لوگ ہوں یا مافیا، ان کو بے نقاب کرتا ہے۔ جرم کا سبب بننے والے محرکات کو بیان کرتا ہے۔ میرے موضوع میں لائیڈ اوہلن اور رچرڈ کلووارڈ کے نظریات کی روشنی میں معاشرے میں جرائم کا سبب اور ان کا محرک ناخواندگی اور غربت ہے۔ پوری دنیا میں جہاں دو چیزوں کی کمی ہوگی وہاں جرائم کی شرح زیادہ ہوگی۔ ماحول ایسا ہوگا جو مجرم کو تو تحفظ دیتا ہے لیکن جس پر ظلم ہو اس کے لیے تو عذاب ہے۔ ''جانگلوس'' میں ایسے نظام اور ماحول پر کھل کر تنقید کی گئی ہے جو صرف مجرم کا ساتھ دیتے ہیں اور ان کا بڑا سبب غربت ہے یا تعلیمی پسماندگی۔ ''غلام باغ'' میں معاشرے کا بڑا طبقہ جو کہ مالی لحاظ سے خوشحال ہے کمزور طبقے کا استحصال کر رہا ہے۔ اس کا بڑا سبب غربت اور ناخواندگی ہے۔ ناول ''قید'' میں عورت شروع سے مجرم ہے اور دنیا میں قیدی کی زندگی گزار رہی ہے۔ اس کا بڑا سبب تعلیمی پسماندگی ہے۔ ''العاصفہ'' میں اپنے ہی بڑے لوگ اپنی عیاشی کے لیے اپنوں پر ظلم کر رہے ہیں اور خود ہر قسم کے جرائم میں ملوث ہیں جن کی بڑی وجہ ناخواندگی ہے۔ ''نیلی بار'' اور دھنی بخش کے بیٹے میں جاگیردارانہ نظام جو کسان او رمزدور کے وسائل پر قبضہ کر کے ظلم و جبر سے ان پر حکومت صرف تعلیم اور سرمائے کی وجہ سے کرتا ہے۔ خود تو دونوں چیزوں کو حاصل کرتا ہے جبکہ دوسروں پر پابندی اس لئے ہے کہ وہ اپنے حقوق کا تقاضا نہ کریں۔ ناول ''کنجری کا پل''، ''نرک'' اور ''حبس'' میں صرف

ناخواندگی اور کم علمی کے باعث اخلاقی جرائم جنم لیتے ہیں۔ ناول "برف" میں سیاسی جرائم، اسمگلنگ، قتل وغارت گری صرف پیسے کی وجہ ہے۔ قلعہ جنگی میں جنگی جرائم تیل کی دولت پر قبضہ کرنے اور دوسرے ممالک کے لوگوں کو غلام بنانے اور ناحق مارنے جیسے جرائم کا سبب دولت کا حصول ہے۔ ناول "جج صاحب" میں سیاسی جرائم کا بڑا سبب ناخواندگی ہے۔ عوام کو جب چاہا تحفظ کے نام پر بے وقوف بنالیا۔ حب الوطنی کا درس دے کر ان کے حق پر ڈاکہ ڈال لیا۔ ناول "چار درویش اور ایک کچھوا" میں دہشت گردی صرف غربت کی وجہ سے ہے۔ پیسے سے غریب لوگوں کو خریدا، تربیت دی اور ناحق لوگوں کا خون بہانے جیسے جرائم کئے تاکہ ملک کو کھوکھلا کیا جائے۔ یہ وہ سیاسی جرائم ہیں جو ملک کے خلاف صرف غربت اور تعلیم کی کمی کے سبب ہوتے ہیں۔

باب اوّل میں جرم کی تعریف اور اس کی تاریخ پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے۔ قرآن پاک میں لفظ مجرمین کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ مغربی مفکرین کی آراء نیز جرم کے نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ جرم کے انضباطات یعنی جرم اور نفسیات، جرم اور معاشرہ، جرائم اور مجرم مذہب اور قانون نیز سائنس اور جرم کے تعلق پر بھی بحث کی گئی ہے۔ آخر میں اردو ناولوں میں جرائم کی عکاسی اور ان کے اسباب و محرکات کا مختصر خاکہ پیش کیا گیا ہے۔

دوسرے باب میں سماجی جرائم پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں تین منتخب ناول ہیں جن میں شوکت صدیقی کا "جانگلوس"، عبداللہ حسین کا "قید" اور مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ" ہے۔ جانگلوس میں جیل سے بھاگے ہوئے دو کرداروں کے ذریعے سماجی جرائم سے پردہ چاک کیا گیا ہے۔ دوسرا ناول "قید" ہے جس میں ایک عورت تین قتل کرکے یہ کہہ رہی ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور میں نے یہ قتل انتقام کی آگ میں کیے ہیں۔ ناول کا اصل موضوع وہ گھٹن ہے جس کو قید سے تعبیر کیا گیا ہے۔ تیسرے ناول "غلام باغ" میں سماج کے اندر پائے جانے والے برادری ازم کو بُرائی اور جرائم کی جڑ قرار دیا گیا ہے۔ جعلی پیری مریدی، اسمگلنگ، قتل وغارت جیسے جرائم پر کھل کر بحث کی گئی ہے۔

تیسرا باب جو کہ معاشی جرائم کے متعلق ہے۔ اس میں تین منتخب ناول شامل ہیں جن میں حسن منظر کا "العاصفہ" اور "دھنی بخش کے بیٹے" طاہرہ اقبال کا ناول نیلی بار شامل ہیں۔ "العاصفہ" میں سعودی عرب میں تیل کی دولت پر امریکی اجارہ داری مقامی اور غیر ملکی مزدوروں کا معاشی استحصال دکھایا گیا ہے۔ "دھنی بخش کے بیٹے" میں سندھ کے اندر پائے جانے والے جاگیر دارانہ کلچر میں کسان کے ساتھ معاشی بے انصافی جیسے جرائم کا ذکر ہے جبکہ تیسرے ناول "نیلی بار" میں ہونے والے معاشی جرائم جو کسانوں کے ساتھ ہوتے ہیں ان پر بحث

کی گئی ہے۔ باب چہارم میں اخلاقی جرائم کے متعلق ہے۔ اس میں تین منتخب ناول ہیں جن میں یونس جاوید کا ''کنجری کا پل''، نسیم انجم کا ''نرک'' اور محمد الیاس کا ''حبس'' شامل ہیں۔ ان ناولوں میں عصمت فروشی جیسے اخلاقی جرائم پر بحث کی گئی ہے کہ کس طرح ایک عورت کو عصمت فروشی پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ان اخلاقی جرائم میں ہیجڑوں کے اخلاقی جرائم جیسے جسم فروشی ہے، ان کو خاص طور پر موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ''حبس'' میں زنا، لواطت اور جنسی زیادتی جیسے جرائم کے اسباب و محرکات کا جائزہ لیا گیا ہے کہ وہ کون سے اسباب ہیں جو اخلاقی جرائم کرنے پر اکساتے ہیں۔ پانچویں باب میں سیاسی اور جنگی جرائم پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں چار منتخب ناول جن میں مستنصر حسین تارڑ کا ''قلعہ جنگی''، سید کاشف رضا کا ''چار درویش ایک کچھوا''، محمد الیاس کا ''برف'' اور اشرف شاد کا ''جج صاحب'' شامل ہیں۔ جنگی جرائم میں افغانستان میں امریکہ اور یورپی افواج کے جنگی جرائم کا جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ دہشت گردی، وائٹ کالر کرائم اور قانون شکنی جیسے سنگین جرائم کو موضوع بحث بنایا گیا ہے۔ ناول نگار کسی قوم کا ریکارڈ کیپر ہوتا ہے۔ معاشرے میں پائے جانے والے جرائم پر لکھتا ہے جو کہ ایک حقیقت ہے۔ ناول نگار ان جرائم کی عکاسی کرتا ہے جن کو محسوس کرتا ہے جو وہ دیکھتا ہے۔

آخر میں اچھے معاشرتی ماحول کے لئے درس بھی دیتا ہے تاکہ ان پر ادارے اور معاشرے والے قابو پا سکیں۔ ایک صحت مند معاشرہ تب ہی ترقی کرتا ہے جب وہ جرائم سے پاک ہو گا۔ ورنہ معاشرتی جرائم ترقی کر کے اس کو اپاہج کر دیتے ہیں جس سے بیمار معاشرہ ترقی کی بجائے تنزلی کی طرف چلا جاتا ہے۔ ادیب لوگ ہی معاشرے کے امن کی بات کرتے ہیں تاکہ لوگ مل جُل کر ایک دوسرے سے تعاون کریں اور معاشرہ گروہ سے قوم بن سکے۔ قوم کے اندر گروہ کی نسبت زیادہ طاقت ہوتی ہے۔

ب۔ نتائج:

زیرِ نظر مقالے میں منتخب اردو ناول سے جرمیات کے اسباب و محرکات کی تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان ناولوں میں شوکت صدیقی کا ناول "جانگلوس"، عبد اللہ حسین کا "قید"، مرزا اطہر بیگ کا "غلام باغ"، حسن منظر کا "العاصفہ" اور "دھنی بخش کے بیٹے"، یونس جاوید کا "کنجری کا پل"، نسیم انجم کا "نرک"، محمد الیاس کا "حبس"، مستنصر حسین تارڑ کا "قلعہ جنگی"، سید کاشف رضا کا "چار درویش ایک کچھوا"، محمد الیاس کا "برف" اور اشرف شاد کا "جج صاحب" طاہرہ اقبال کا "نیلی بار" شامل ہے۔ تمام ناولوں میں وقت کا دورانیہ ۱۹۸۷ء سے لے کر ۲۰۲۰ء تک کا ہے۔ ناول نگاروں نے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ ناول میں تمام جرائم کا ذکر کیا جو ہمارے معاشرے میں روز مرہ ہوتے ہیں۔ دوران تحقیق درج ذیل نتائج اخذ کیے گئے ہیں:

ان ناول نگاروں نے جن جرائم کا ذکر کیا ہے وہ نئے ہرگز نہیں ہیں۔ اس سے پہلے بھی اردو ادب میں سینکڑوں ناولوں میں جرائم پر کھل کر لکھا گیا ہے۔ لیکن ناول نگاروں کی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے ناولوں میں جرائم کے اسباب و محرکات کے ساتھ ان کے حل پر بھی زور دیا ہے یعنی فرسودہ جاگیر داری استحصالی نظام، جعلی پیری مریدی، خونخوار، سیاست، لاقانونیت، اقربا پروری، بڑی عالمی طاقتوں کا آلہ کار بننا، کمزور انصاف اور پولیس کا نظام معاشرتی، بے راہ روی، دہشتگردی، ناخواندگی، غربت، بے روز گاری، معاشرے میں عدم برداشت، بار بار آئین کا معطل ہونا۔ یہ وہ تمام چیزیں ہیں جو جرائم کو جنم دیتی ہیں۔ ان کی تفصیل اس طرح ہے:

ا۔ ناول سماج کا عکاس ہوتے ہیں اور کوئی بھی سماج انسانی حالتوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ انسان اور جرم کا تعلق ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ناول ایک ایسی صنف ہے جس کے ذریعے ناول نگار سماج میں پیش آنے والے خیر و شر کی قوتوں کے ٹکراؤ کو بیان کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ وہ کون سے عوامل ہیں جن کی بنیاد پر جرائم جنم لیتے ہیں اور سماجی زندگی میں بدامنی کا سبب بنتے ہیں۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ ناول اور جرمیات کا گہرا تعلق ہے کیوں کہ یہ جرائم کے محرکات کو بے نقاب کرنے کا ذریعہ بنتا ہے۔

۲۔ منتخب اردو ناولوں میں ("جانگلوس"، "قید"، "غلام باغ") میں سماجی جرائم کو عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول نگاروں نے سماجی جرائم کے اسباب خود غرضی، غصہ، انتقام اور نسلی و مذہبی تعصبات کو قرار دیا ہے۔

۳۔ اخلاقی جرائم کے اسباب و محرکات کو بیان کرتے ہوئے ناول نگاروں نے اپنے ناولوں ("کنجری کا پل"، "نرک" اور "حبس") میں غربت، ناخواندگی، جنسی ہوس وغیرہ کو قرار دیا ہے اور کہا ہے کہ قانون کی عمل داری اور خواندگی ہی اس کو کم کر سکتے ہیں۔

۴۔ منتخب اردو ناولوں میں معاشی جرائم کی عکاسی کرتے ہوئے ناول نگاروں نے اس کا سبب حرص و طمع، حسد، رات ورات امیر ہونے کی خواہش اور ناخواندگی بتایا ہے۔

۵۔ سیاسی اور جنگی جرائم کے منتخب ناولوں میں ("قلعہ جنگی"، "چار درویش ایک کچھوا"، "برف" اور "جج صاحب") میں اچھے طریقے سے بیان کیا گیا ہے اور اس کے اسباب عالمی طاقتوں کی غریب ممالک میں بے جا مداخلت، جنگی جرائم، اسمگلنگ، اداروں کا قانونی حدود سے تجاوز کرنا اور اعلیٰ عہدوں پر بیٹھے شخصیات کی خرید و فروخت بتایا گیا ہے۔

مستنصر حسین تارڑ کا "قلعہ جنگی"، کاشف رضا کا ناول "چار درویش ایک کچھوا"، محمد الیاس کا "برف"، اشرف شاد کا "جج صاحب" جنگی جرائم، دہشت گردی، عالمی طاقتوں کی پھیلائی گئی جنگ، آئین کی موت جیسے جرائم کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

سفارشات

۱۔ "غلام باغ"، "حبس"، "نیلی بار" میں جعلی پیری مریدی کے موضوعات پر ایم فل اور پی ایچ ڈی کا کام ہو سکتا ہے۔

۲۔ ناول "چار درویش ایک کچھوا"، "برف"، "قلعہ جنگی" جیسے ناولوں میں عالمی دہشت گردی اور نائن الیون جیسے موضوعات پر کام ہو سکتا ہے۔

۳۔ ناول "کنجری کا پل"، "جج صاحب"، "برف" میں اسمگلنگ، منی لانڈرنگ اور جعلی ویزوں کے کاروبار کے موضوع پر کام ہو سکتا ہے۔

۴۔ ناول "نرک" پر ٹرانس جینڈر کی زبان اور ان کے مسائل کے موضوع پر ایم۔فل کا کام ہو سکتا ہے۔

کتابیات

بنیادی مآخذ::

القرآن، سورۃ زخرف، آیت نمبر ۴۷

القرآن، سورۃ نور آیت نمبر ۲

القرآن، سورۃ والتین، آیت نمبر ۴

اشرف شاد، جج صاحب، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۸ء

حسن منظر، ڈاکٹر، العاصفہ، شہرزاد، کراچی، ۲۰۰۶ء

حسن منظر، ڈاکٹر، دھنی بخش کے بیٹے، شہرزاد پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء

سید کاشف رضا، چار درویش، ایک کچھوا، کتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۲۰۰۸ء

شوکت صدیقی، جانگلوس حصّہ اوّل، رکتاب پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۸۹ء

طاہرہ اقبال، نیلی بار، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء

عبداللہ حسین، قید، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۱۹۸۹ء

محمد الیاس، برف، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۰ء

محمد الیاس، حبس، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۸ء

مستنصر حسین تارڑ، قلعہ جنگی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۲ء

مرزا اطہر بیگ، غلام باغ، ساتواں ایڈیشن، الحمد پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۲۱ء

نسیم انجم، نرک، میڈیا گرافکس، کراچی، ۲۰۰۷ء

یونس جاوید، ڈاکٹر، کنجری کاپل، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۶ء

ثانوی ماخذ (Secondary Sources):

آصف حسن، سگمنڈ فرائڈ، حیات و نظریات، بک ٹائم کراچی، ۲۰۱۵ء

ابوعبداللہ محمد بن فرج المالکی القرطبی، دربارِ رسول کے فیصلے، بک کارنر، جہلم، ۲۰۱۹ء

احمد سلیم، (مرتب) عبداللہ حسین، تخلیقی سفر کی نصف صدی، سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۴ء

احمد صغیر، اردو ناول کا تنقیدی جائزہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۱۵ء

الیگزینڈر کیرن، یاما، طوائف، ترجمہ ن۔م۔راشد، تخلیقات، لاہور، ۱۹۹۵ء

ایلف شفق، چالیس چراغ عشق کے، (مترجم: ہامیر) جمہوری پبلی کیشنز، لاہور ۲۰۱۷ء

بٹ، محمد احسن، مترجم اے ہسٹری آف پراسٹی ٹیوشن ۔(جسم فروشی کی تاریخ)، لاہور، نگارشات پبلی کیشنز ۲۰۰۵ء

بنجمن سپاک، ڈاکٹر، (ترجمہ) سید وقار عظیم، لڑکوں اور لڑکیوں کے مسائل، مبقول اکیڈمی، لاہور، ۱۹۶۹ء

ڈی ایچ لارنس، فکشن اور فلسفہ، (ترجمہ) مظفر علی سید، مکتبہ اسلوب، کراچی، ۱۹۸۶ء

شاعر علی شاعر، جدید اردو ناول، عکس پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۱۹ء

شمیم حنفی، تاریخ تہذیب اور تخلیقی تجربہ، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۲۰۰۳ء

عبد السلام، ضعیف، مائی لائف ود طالبان، کولمبیائی یونیورسٹی پریس، نیویارک، ۲۰۱۰ء

عظیم الشان صدیقی، اردو ناول آغاز و ارتقا، بک ٹاک، لاہور ۲۰۱۹ء

غفور احمد، نئی صدی کے نئے ناول، دارالنوار، کراچی، ۲۰۱۴ء

فتح پوری، نیاز، ترغیبات جنسی یا شہوانی، آواز اشاعت گھر، لاہور، ۲۰۰۴ء

فیودر دوستوئیفسکی، (ترجمہ) ڈاکٹر ظ۔انصاری، جرم و سزا، الحمد پبلی کیشنز لاہور ۲۰۱۵ء

کارل مارکس اور فریڈرک اینگلس کے مضامین، ہندوستان کی پہلی جنگ آزادی (۱۸۵۷ء تا ۱۸۵۹ء) (ترجمہ) مرزا اشفاق بیگ، جامعہ ہمدرد، دہلی، ۱۹۸۶ء

گیبریل گارشیا مارکیز، تنہائی کے سو سال، (مترجم) نعیم کلاسرا، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۰۳ء

ماریو پوزو، گارڈ فادر، ترجمہ رؤف کلاسرا، دوست پبلی کیشنز، اسلام آباد، ۲۰۱۵ء

ماں، میکسم گورکی، (ترجمہ) ڈاکٹر ظ۔انصاری، دارالاساعت ترقی ماسکو

محمد اکرام، شیخ، رودِ کوثر، سروسز بک کلب، جی ایچ کیو، راولپنڈی، ۲۰۰۳ء

محمد احسن فاروقی، ڈاکٹر، ناول کیا ہے، امین الدین پارک، لکھنوٴ، س ن

محمد عظیم اللہ، ڈاکٹر، اردو ناول پر انگریزی ناول کے اثرات، دارالشعور، لاہور، ۲۰۱۵ء

محمد نعیم ورک، اردو ناول کا ثقافتی مطالعہ، کتاب محل، لاہور، ۲۰۱۹ء

محمد عبد المالک، ڈاکٹر، پاکستانی بچوں میں جرائم کا بڑھتا ہوا رجحان، شعبہ سماجی بہبود، جامعہ کراچی، ۲۰۱۰ء

محمد فواد عبد الباقی، المعجم الفہرس للاالفاظ القرآن الکریم، مکتبہ رحمانیہ، لاہور، ۲۰۰۹ء

مظفر حسن ملک، ڈاکٹر، جرمیات، مقتدرہ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۶ء

ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے سروکار، فکشن ہاؤس، لاہور، ۲۰۱۲ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، اردو ناول کے چند اہم زاویے، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۲۰۰۳ء
ممتاز احمد خان، ڈاکٹر، آزادی کے بعد اردو ناول، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، ۱۹۹۲ء
منٹو، سعادت حسن کے مضامین، مشتاق بک کارنر، لاہور، ۲۰۰۶ء
منصور خوشتر، ڈاکٹر، اردو ناول کی پیش رفت، بک ٹاک، لاہور، ۲۰۱۹ء
میاں محمد بخش، سیف الملوک بدیع الجمال، حمید بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۳ء،
نعیم مظہر، ڈاکٹر / فوزیہ اسلم، ڈاکٹر، اردو ناول -- تفہیم و تنقید، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۲ء
یوسف سرمست، ڈاکٹر، بیسویں صدی میں اردو ناول، ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۲۰۰۰ء

انگریزی مآخذ:

Culture Conflict and Crime, Thuriston Selon (USA)

Edwin Sutherland, Criminology J.B. Lippen Cot Co, Philadelphia, Richard A. Cloward and Lioyed E. Ohlin, Delinquency and Opportunity, New York, Free Press 1960

Emil Darkeim (Jr. Jorge Simpson) The Deviation of labour and Society, Free Press, New York, 1964

Frank E. Hagan. Introduction in Criminology: Theories Methods and Criminal Behavior USA 1986, P-281

Karl Marx, population crime and pauperism in Karl Marx and Friedrich Engels, Ireland and the Irish Question (Moscow- Progress) 1859, reprint 1971, P.92

Larry. J.Siegel, Ph.D Wordsworth Balmont USA.2000

Michael Gryant, A Word History of War Crimes, Blooms Bury, London, 2015

Mix Weber, Methodology of Social Science, London, 2012

Richard Quinny, The Social Realities of Crimes, Little Brown, Boston 1970, P- 78

Robert K. Marton, Social Theories and Social Structure, P-131, Free Press, New York, 1957

Sophonichba Braken Ridge & Edith Abbot, Delinquent Child and Home, Russel Sage Foundation, New York, 1992

Theories of Criminology Past and Present Stephen Shofer, New York, Free Press, 1970, P-70

رسائل وجرائد:

اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، سہہ ماہی ادبیات، جلد اوّل، شمارہ نمبر ۱۲۱، جولائی تا دسمبر ۲۰۱۹ء

اردو ناول ڈیڑھ صدی کا قصہ، سہہ ماہی ادبیات، جلد اوّل، شمارہ نمبر ۱۲۳ تا ۱۲۴، جنوری تا جون ۲۰۲۰ء

تنظیم الفردوس، ڈاکٹر، ادب اور جرمیات، مشمولہ، بنیاد، لاہور، جولائی ۲۰۱۹ء

حسرت کاسگنجوی، جدید ناول کے انقلابی اوراق، مشمولہ ادبیات (سہ ماہی)، اکادمی ادبیات پاکستان، اسلام آباد، جلد ۱۳، شمارہ ۵۳، خزاں ۲۰۱۹ء

ماہ نامہ سب رس، حیدرآباد، جلد ۷۵، شمارہ ۵، مئی ۲۰۱۳ء

عتیق اللہ، ناول کا فن، مشمولہ فکر و تحقیق، دہلی، اپریل تا جون ۲۰۱۳ء

لغات:

اردو لغت (تاریخی اصولوں پر) اردو لغت بورڈ، کراچی، ۱۹۸۳ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر، قومی انگریزی اردو لغت، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۰۸ء

شان الحق حقی، (مرتبہ) فرہنگ تلفظ، ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد، ۲۰۱۷ء